

ماہنامہ سچی کہانیاں

کراچی

# سچی کہانیاں

35 سالہ

SEPTEMBER

2018

وٹرز

تقدیر گزیدہ موبینہ بتول

صفت فرعون محرقہ اسم بلوچ

آہیسی مسکن ڈاکٹر عاشر نواز

محافل کا دل چچی کہانیاں کا نیا ہوشربا سلسلہ جو پڑھنے والوں کو جادو کی کالی دنیا سے آشنا کرائے گا  
'املاس' انتہائیت دلچسپ اور پراسرار سلسلہ جس کی ہر سطر خوف اور دہشت میں ڈوبی ہوئی ہے  
مسئلہ یہ ہے آپ کے مسائل کا روحانی حل چچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ

# پچی کسانیاں

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانس سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ: منزہ سہام

مدیر: دانیال شمش

نائب مدیرہ: ماہم اوزیلین

رکن آل پاکستان نوجوان سماجی  
رکن آل پاکستان نوجوان سماجی

MEMBER  
APNS  
CPNE

خط و کتابت کا پتہ: C-II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کراشل  
ڈائریکٹر فیروزہ 7، ڈائریکٹر ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 70 روپے \* جلد: 35 - شمارہ: 09 \* ستمبر 2018ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے مٹی پر لیس سے چھپوا کر شائع کیا۔

ہر ہفتہ پبلشر کے تحت شائع ہونے والے ہر چوں ماہنامہ دو شیعہ اور مٹی پر لیس میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد ادارہ کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

منیجر مارکیٹنگ

زین شمش

0331-8221212

منیجر سرکولیشن

آفتاب عالم

0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر

منزہ ایڈیٹنگ (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893121

021-35893123

BAKE  
PASTOR

Khamay mein jab chahta huiya twist  
Toh Qeema Macaroni Instant Hi!

Try our new Qeema Macaroni  
with Bake Pastor. To get a full  
to add more details visit our website.



contact: sehabkhan@pearl.com | www.bakepastor.com | bakapastor

- 07 شکوہ کیسا؟... 08 احوال 26 غلامِ عجیب ہزار 07 منترہ سہام مدیرہ اعلیٰ (ام ایمان لغزہ عزیز)
- 32 آج کی مصنفہ 34 یہ حقیقت 42 تتلیاں قید تھیں 42 زریں نسیم 34 جاوید رابی
- 54 نصیب 62 بھوک کی کتھا 68 تعارف 68 فریدہ فری 62 حاجرہ عمران خان
- 70 خناس 80 قسمت کے کھیل 84 گناہ گار 84 ایم شاہ بخاری 80 شیخ معظم الہی
- 96 حصار 121 غزلیں 124 منزل کی جستجو 124 محمد شمسزادہ 121 ادارہ
- 142 تماشہ 136 فنڈی طریقت 130 حسد کی آگ 142 کوثر اسلام 136 توحسین جوشیہ
- 170 جوڈو گریا وہ مر گیا 148 عامل کامل 146 ڈھا کہ بوا ترز 146 امین فاطمہ ارمان 148 پیر محمد شاہ قادری
- 192 مسلم خواتین 184 ڈاکے سیاست 178 ناقابل شناخت 178 نصیب عمر 184 کرن شبیر
- 223 پاکستانی شوبز 216 جن کا انتقام 200 کولڈ فیئر 200 شبیبہ مظہر 216 ساحل ابڑو
- 248 آپ کی ڈائری 240 مسئلہ یہ ہے 226 امتاس 226 شازی سعید منگل 240 ادارہ
- 256 شعرو سخن 256 قارئین



## سچی کہانیاں ملنے میں اگر دشواری ہے تو ان نمبرز پر رابطہ کیجیے

0300-2680248	کراچی ایجنٹ
0300-4009578	لاہور ایجنٹ
0300-6301461	ملتان
0321-3060477	حیدرآباد
0300-6040080	سرگودھا
0344-9290185	پشاور
081-2820375	کوئٹہ
0333-6539585	فیصل آباد
0345-5058891	راولپنڈی
0344-3445464	نواب شاہ
0300-9311166	سکھر
<b>نمائندہ خصوصی</b>	
0300-4319264	عبد الغفار عابد
0300-9657926	ارشاد اقبال چوہان
0301-6540200	ممتاز احمد
0301-2868143	مور شاہد
0331-1173320	عمران مظہر
0301-7472712	مجید احمد جانی

## شکوہ کیسا؟... گلہ کیوں؟

اب تک عید کے تہوار غریبوں کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے رمضان تو پانی اور نمک کے ساتھ گزری جاتا ہے مگر عید پر غریب جب اپنے بچوں کو رنگ برنگے کھلونے، نئے کپڑے اور جوڑے نہیں دلا پاتا تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ عید الاضحیٰ پر دوسرے کے جانوروں کو ترستی نگاہوں سے دیکھنا بھی کم و بیش ہر سفید پوش اور غریب کا نصیب ٹھہرا۔

بڑے تو صبر کر رہی لیتے ہیں مگر بچے وہ تو معصوم ہوتے ہیں انہیں کون سمجھائے کہ بیٹا تمہارے باپ کی اتنی حیثیت نہیں کہ تم سال میں ایک بار بھی نیا کپڑا پہن سکو انہیں کون سمجھائے کہ قربانی کے جانور کو خریدنا ان کے والدین کے بس میں نہیں اور اب کچھ عرصے سے یوم پاکستان منانا بھی غریب کے بچے کے نصیب میں نہیں رہا پہلے تو صرف جھڑے بکتے تھے پھر یوں ہوا کہ حکمران ایسے آتے چلے گئے جو ملک ہی بیچنے کے درپے رہے مگر اب تو جھنڈوں کے ساتھ ساتھ ہرے سفید جوڑے، فراکیں، جٹے، بندے، بالیاں، مختلف غیر ملکی کرداروں کے ماسک جو ہرے اور سفید رنگ میں رنگے ہوتے ہیں غریب کے بچے کا دل لپاتے ہیں..... وہ کچھ بھی نہیں خرید پاتے اور اپنی ہی نظروں میں سچے پاکستانی نہیں ٹھہرتے کیونکہ جس کے پاس خرچنے کو جتنا مال وہ اتنا سچا محبت وطن ہمنے غریب کے بچے سے خوشیاں تو جھینٹی ہی تھیں اب ان کی پاکستان سے محبت پر بھی سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ یہ کیسی محبت ہے یہ کیسا لگاؤ ہے؟ ہم اپنی آنے والی سلوں کو کیا پیغام دے رہے ہیں کوئی یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اصل محبت تو ملک کی خدمت میں ہے..... قائد اعظم کے اصولوں پر چلنے میں ہے۔ ان کی طرح بے انتہا محنت میں ہے..... اب تک تو صرف قربانی کے جانوروں کے نام ہندوستانی فلم انڈسٹری کے کرداروں پر تھے مگر اب تبدیلی آگئی ہے غیر ملکی کرداروں کے ماسک بھی پاکستانی پرچم کے رنگ میں رنگے برائے فروخت ہیں۔ پتہ نہیں کیوں ہمارے وطن میں خالص جذبوں کی کوئی اہمیت اور وقعت نہیں ہر چیز برائے فروخت ہے اب وہ چاہے..... پرچم ہو یا ملک سچی بات تو یہ ہے کہ جس کی جو حیثیت ہے وہ وہی شے بچہ ڈالتا ہے غریب جھنڈا بچہ کرکھاتا ہے

اور امیر ملک بچہ کر..... پھر شکوہ کیسا؟... گلہ کیوں؟

منزہ سہام



# احوال

مدیرہ علی

قارئین کے درمیان رابطہ آپ کے خطوط اور ان کے جواب

عزیز احوالیو! امید کرتی ہوں کہ آپ سب کی عید بہت اچھی گزری ہوگی کہیں سیاہ بادلوں نے موسم کو لفریب بنائے رکھا تو کہیں رم بھم نے ماحول کو خوشیوں سے ترکیے رکھا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اسی خوبصورت اور لفریب موسم میں ہم سب نے پورے قومی جوش و جذبے سے یوم آزادی بھی منایا۔ میں یہاں چند باتیں آپ سب کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں اور ایک عہد بھی لیکنا چاہتی ہوں۔ پچھلے کچھ سالوں سے یوم آزادی پر جوبلہ گلہ اور طوفان بدتمیزی برپا کیا جاتا ہے مجھے بتائیے کیا یہ ملک ہم نے اپنی آسانی سے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو بھول جائیں۔ دوران ہجرت دہشت و بربریت کا بازار گرم کیا گیا تھا۔ خواتین کی عصمت دری کی گئی بچوں بوزھوں اور جوانوں کو بلا تفریق قتل کیا گیا۔ کیا اتنی بڑی قربانی کے بعد حاصل کیے گئے اپنے پیارے وطن کے یوم آزادی پر بناسائنس سارے شہر میں اڑتا بے ہنگم ناچ گانے خوشی کے نام پر بدتمیزی، آتش بازی میں لاکھوں روپیہ ضائع کرنا کیا یہ سب ہمیں زیب دیتا ہے۔ خوشی کا مطلب تماشا گاہ کا نکتہ ہے ہو کیا؟ یہ دن تو ہمیں بہت احترام سے منانا چاہیے۔ مسجدوں میں عبادت کا اہتمام کرنا چاہیے رت چمکے میں ملک کی سلامتی کی دعائیں کرنی چاہیے۔ رب العزت کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ سڑکوں پر دھما چوڑی مچانے کے بجائے اپنے محلے اپنے شہر کے لیے کچھ شہت کام کرنا چاہیے۔ آئینے تل کر عہد کریں کہ اگلے سال بے جا اصراف اور بے جا ہل بازی سے اجتناب برتیں گے اور ایک ذمہ دار پاکستانی ہونے کا ثبوت دیں گے۔ اس بار کچی کہانیاں کے صفحات میں آپ کے لیے ایک خاصے کی چیز پیش کی جا رہی ہے امید کرتی ہوں پسند آئے گی۔ چلیے اب بڑھتے ہیں اپنے پہلے خط کی جانب.....

بھگت حقیف نکلا نہ صاحب سے لکھتے ہیں۔ مدیرہ علی پیاری سی بٹیا منزہ سہام صاحبہ سدا خوش رہو اور خوشیاں بانٹتی رہو سلام مسنون اور سلام خلوص کے بعد خیریت کا طالب اللہ کے فضل سے خیریت سے اور امید کرتا ہوں کہ اللہ رب العزت کی مہربانی میری بیٹی کے ساتھ بھی شامل حایل ہوگی۔ کافی دنوں کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہو رہا ہوں اس غیر حاضری کی وجہ میرے بہنوئی کی وفات تھی۔ پیاری بٹیا زیت کے عنوان سے کہانی حاضر خدمت ہے غلطیاں بہت ہوں گی ان کی نوک نلک سنوار کر کسی قرعہ جی اشاعت میں شامل کر لینا۔ کہانی کچھ لمبی ہے اگر مہنگائی کا ڈر ہو تو دو تین اقساط میں لگا لینا اگر شائع نہ بھی کرنی ہو تو مجھے واپس کر دینا آخر میں اپنی بیٹی کو بہت بہت پیار اور سلام ادارے کے سب افراد کو سلام سب قارئین کو بھی سلام دعا ہے کچی کہانیاں بہت بہت سی زیادہ ترتی کرے آئیں۔

☆ حقیف انکل! اللہ آپ کے بہنوئی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آئیں۔ آپ کی تحریر موصول

ہوگئی ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔

☆ فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ! السلام علیکم! جولائی کے مہینے کے شمارے کا انتظار کرتے ہوئے 4 جولائی کو شام جب گھر پہنچا تو بذریعہ ڈاک کچی کہانیاں موصول ہو۔ جب کھول کے شمارہ دیکھا تو دل باغ باغ ہو گیا میرا خط اس مہینے کا بہترین خط ہے۔ ایڈیٹر صاحبہ یہ تو آپ کی حسن نظر ہے جو کہ میرے لیے جو صلہ افزا ہے۔

☆ فیصل بھٹی بھائی تپھرہ کیونکہ پرانا تھا اس لیے حذف کر دیا۔ میں امید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی اپنے قیمتی وقت سے نوازیں گے۔

☆ ایم یعقوب احمدانی ذریعہ غازی خان سے لکھتے ہیں السلام علیکم! آپ کی منزہ سہام اور پوری ٹیم کچی کہانیاں کو الفت بھرا سلام قبول ہو امید ہے خوش رہاں لکھے گزر رہے ہوں گے آپ کی جی میں سب سے پہلے معذرت خواہ ہوں کچی کہانیاں سے رشتہ جو ذرا الفت چاہت خلوص محبت بھرا در کرنے سے کچھ عرصہ قاصر رہا امید معافی ملے گی شکر یہ دلوں کی گن بھی زیادہ دوری پیدا نہیں کرنے دیتی۔ میں بھی کچھ عرصہ پالی پیٹ کے لیے دور رہا کاش بھائی کے جانے کے بعد پرچہ بند دیکھ سکا جس کا بہت دکھ ہے۔ پچھلے ماہ جون میں اسٹوری لکھی تو بھائی عزیز نے سنے بتایا۔ بہت خوشی دل کوئی۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جس سے ان الفاظوں میں شکر یہ کہوں جون کا پرچہ بڑی محنت سے علامہ محمد اسٹوریز سے سرشار محبت سے بھرا تھا۔ سبھی دوستوں نے اچھا اور خوب محبت سے دکھ درد دیکھے تھے باقی خواہشات تو آج کی اس دور میں کسی کی ساری پوری نہیں ہوتیں اور آج میں ڈرتے ڈرتے محفل کچی کہانیاں میں حاضر ہوا ہوں اب انشاء اللہ ہر ماہ کو کوشش کروں گا کچی کہانیاں پوری ٹیم نے بہت عزتی تھی جو شاید کچی نہ بھول پاؤں گا ایک اسٹوری کے ساتھ چند نئے الفاظ آپ کی نظر کرتے ہوئے اجازت طلب چاہتا ہوں وسلام فرح! امیں! سردہ انور علی! ارم ناز کراچی! ارم ناز ڈی جی خان یوسف لغاری ابو ہریرہ بلوچ! عبدالغفار عابد جوہری یاسر کی اور تمام خلوص دل سے عزت پیار سے بندہ ناچنے کا تھہ سلام قبول ہو ہمیشہ خوش و خرم کے ساتھ زندگی کے حسین بل اپنوں کے ساتھ گزاریں اور یہی زندگی جیسی آئینہ آئیں۔

☆ بھائی ایم یعقوب! ڈرتے ڈرتے کہوں پورے طمطراق سے احوال میں آچے۔ یہ آپ کی اپنی محفل ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ غم روزگار انسان کو بہت مصروف کر دیتا ہے مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کچی کہانیاں سے آپ سب کا پیار بہت عرصہ پہلے لوگوں کو اس سے دور نہیں رکھ سکتا تو جناب جرم آئیں۔

☆ شمیمہ مشتاق کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ آپ کی اور کچی کہانیاں فیملی السلام علیکم! آج اگست کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا یقین کیجیے میرا تو دن خوشگوار ہو گیا۔ مگر گھر کے کام متاثر اور گھر والے متاثر ہوئے۔ اب کیا کریں ہمارے شوق کو کچی کہانیاں اور دو شیزہ کے ہفتارے جو لگے ہیں۔ سب سے پہلے دیشان شیخ صاحب! مظفر علی برمانی صاحب اور نقیہ فضل صاحبہ کا بہت شکر یہ جنہوں نے دعاؤں میں یاد رکھا ملازم حسین شیرازی صاحب! شاہد رفیع صاحب! ساحل! ابو! حضرات نے کہانی لال بتی کو سراہا بہت نوازش۔ فیصل ندیم بھٹی صاحب آپ کو بہترین خط لکھنے پر مبارکباد آپ کی قسمت پر رشک بھی آیا سال بھر کے لیے اعزاز می رسالے کے مالک بن گئے۔ دعاؤں کے لیے نوازش! انشا طالب اور عالیہ نور صاحبہ کے لیے دھیرو دعا میں! تحسین جو بیٹو آپ کی اچھی بات سے میں بھی متفق ہوں۔ ملازم شیرازی اور عبدالغفار صاحب کا خط عمدہ تھا فیصل مشتاق صاحب نے غالب کے خطوط کی یاد تازہ کر دی۔ برجستہ انداز بیان خط پڑھ کر مٹی بھی آپ کی لطف بھی مہر پرویز صاحب کا تپھرہ شاندار تھا۔ مور شاہد صاحب سے مل کر خوشی

ہوئی ایم مثال عشق حقیقی سلی نسیم بانو فرمانبردار اولاد اچھی کاوش تھیں۔ تقدیر پر گزیدہ سوینہ بتول اردو ہندی مرکالائی انداز نے کہانی کا لطف دو بالا کر دیا جاوید راہی ہمیشہ کی طرح ایک جاندار تحریر پیش کرنے میں کامیاب رہے اللہ بوجھے کا منترہ آئی آپ ہم لکھاریوں کو کھٹ نام دیتی ہیں۔ عمدہ برجستہ شگفتہ تحریر سنے مسکرانے پر مجبور کر دیا کہانی میں جس کا سحر اختتام تک قائم رہا۔ میں جانتی ہوں خط طویل ہو رہا ہے۔ مگر آج جن چند باتوں نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا آپ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں پچھلے دنوں چند ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے میری نظر میں دو شیزہ اور سچی کہانیاں کا معیار اور بھی بلند کر دیا ہے اور اس کا سہرا بلا شرکت غیر منترہ آپ کی سر جاتا ہے۔ ہمارے ارد گرد ہر شے (Materialistic) ہو چکی ہے۔ ہر جگہ برینڈڈ اور نمبرڈ آگے ہیں۔ تو نمبروں کی دوڑ سے شمارے اور لکھاری کہاں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ چند لوگوں نے اگر اپنے ذہنوں میں معیار کا ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے تو یہ ان کی ذہنی اختراع کے سوا کچھ نہیں اور یہی وجہ ہے جو آپہنیں سننے لکھنے والوں سے خوف زدہ رہتی ہے۔ اکثر کہانیاں اسی بنا پر مسترد کر دی جاتی ہیں۔ چاہے کہانی کتنی ہی معیاری ہو۔ قدیم لکھنے والا کتنی ہی بوس کہانی ارسال کرے چھاپ دی جاتی ہے۔ چند مخصوص موضوعات کو ہی پیش کیا جاتا ہے۔ کون عظیم لکھاری ہے کون نہیں اس کا فیصلہ قاری کرتا ہے۔ چند مخصوص اذہان نہیں یہی وجہ ہے کہ دو شیزہ اور سچی کہانیاں معیار کے لحاظ سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ اس سلسلے میں منترہ آپ کی ہی ہمت کی داد دوں گی جو رسک لینے سے خوف زدہ نہیں ہوتیں۔ جنہیں خود پر اعتماد ہے۔ انہوں نے ہمیشہ نام سے زیادہ کام کو عزت دی۔ میں تہیہ دل سے ان کی مشکور و ممنون ہوں جو احسان انہوں نے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں پر کیا ہے۔ اس کی چٹنی تعریف کی جائے کم ہے یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں متفرق کہانیوں کا وہ گلدستہ بن گیا ہے جو ہر مزاج کے آگن کو مہکا تا ہے۔ ہر ذوق کو تسکین دیتا ہے۔ منترہ آپ جیسے زرخیز ذہن ہی نے دور کی کسی حسینہ معین، انور مقصود یا مشتاق احمد یوٹی کو جنم دیں گے۔ اگر آپ جیسے کلمے ذہن کے لوگ نہ ہوں تو ہمارا ادب بے ادبوں سے بھر جائے۔

☆ شہینہ ڈیز! تمہارے خط نے تو مجھے پھلا کر کیا کر دیا۔ بس اب زیادہ تعریف مت کرو میرا تو طریقہ ہی ہے میں شخصیت پرستی کی بالکل قائل نہیں جو اچھا لگے گا وہ ضرور چھپے گا ذاتی تعلقات کو چٹنی سے میں بھی آپ کی میرٹ کا قائل نہیں کر سکتی چاہے سانسے میری اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

☆ ارشد اقبال چوہان بڑا نوالہ سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہنا منترہ صاحبہ السلام علیکم! اشارہ تو ماشاء اللہ وقت پر ہی مل گیا تھا مگر بیہ معرفت مطالعہ جلدی نہ کر سکا۔ اس لیے خط میں ذرا درجے پہلے احوال کی احوال بھائیوں کی میری اور آپ کی بھی رائے لا حاصل بحث کو ختم کرنے کی ہی ہے تو آئندہ کے لیے قیمتی صفحات ضائع نہ ہوں گے جائیں تو بہتر ہے۔ باب شیر صاحبہ نے میرے خیال کو ایک لیا ہے ریشم کے دھاگے بند ہی کروں حامل کال انشاء اللہ اس کی کمی پورا کر دے گی۔ آپ نے آئندہ بنانے کی اجازت طلب کر کے شرمندہ کر دیا ہے۔ سچی کہانیاں ہر جس طرح ہمارا حق ہے اسی طرح سچی کہانیاں کا ہے اور اس کے تا لے آپ کو پورا اختیار ہے۔ ڈھلے بیروں کا بھی بس کچھ نہ گیا ہو۔ انعام حاصل کرنے والوں کو بہت مبارکباد۔ مگر فیصلہ نذیم بھی صاحب سے مجھے ہمدردی ہے کہ 6 شمارے 70x60 بہر حال مبارکباد پر ان کا بھی حق ہے۔ ضدی ماں جی اور آخر گناہ کیا تھا بہت خوب ہیں باقی ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اس دفعہ ابھی تک کوئی کوتاہی نظر سے نہ گزری ہے خوب۔

☆ بھائی ارشد! دیکھیے آپ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے ریشم کے دھاگے پہلے ہی بند کر دی گئی ہے۔ آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔ فیصلہ آباد میں سچی کہانیاں پڑھنے والوں کو ملنے میں کافی دشواری ہے میں آپ

کو اسی سلسلے میں رحمت دوں گی۔ لوگ آپ سے رابطہ کریں گے آپ مجھے آگاہ کیجیے گا انشاء اللہ آپ کا تعاون رہا تو فیصلہ آباد جیسے بڑے شہر میں سچی کہانیاں ہر سال پر دستاب ہوگا۔

☆ مدیحہ گل فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ ایک طویل عرصے کی چٹنی کے بعد حاضر خدمت ہوں امید ہے اس محفل کے سننے اور پرانے لکھاری ٹھیک ہوں گے اور درگزر کریں گے ان تمام قارئین کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری کاوش کو سراہا۔ میری حوصلہ افزائی کی سب سے زیادہ شکر گزار منترہ آپ کی اور مرحوم ایڈیٹر صاحب ناصر رضا صاحب سے جب پہلی دفعہ بات ہوئی تھی مجھے کہانی بھیجئے گا محرک ملا ان کے یہ الفاظ ابھی آپ انتظار کس بات کا کر رہی ہیں۔ جلدی سے قلم اٹھائے اور کہانی لکھ بھیجیں۔ میری نیشن ختم اپریل کے بعد میں ایک نئی کہانی کے ساتھ حاضر خدمت ہوں یہ کہانی معاشرے کی ایک سچ حقیقت پر مبنی ہے۔ جو نا صرف میرے بلکہ آپ کے ارد گرد موجود ہوگی یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے عورت ہی قربانی دیتی ہے۔ اور قربانی سال پہ سال نسل در نسل ملتی ہے۔ نرس ہزاروں سال بھی روتی رہے اپنا نصیب نہیں بدل سکتی۔ یہاں تک کہ سانس ختم ہو جاتی ہے۔ مجاہد سونے کا احساس انہیں اپنے انا کے خول سے باہر نکلنے نہیں دیتا حالانکہ آپ بھی میری اس بات سے متفق ہوں گے کہ مجاہد خدا بھی خدا نے ایک اعلیٰ مقام بنایا ہے۔ جس کے ساتھ ذمہ داریاں اور فرائض جڑے ہیں ان فرائض اور ذمہ داریاں نبھانے کے بعد ہی مرد اس مقام پر پہنچتا ہے کہ بیوی کے بعدے کے قائل ہو سکے۔ دو بچوں کی پرورش کرنے والا جنت میں حضرت محمد ﷺ کے برابر کھڑا ہوگا۔ پرورش و تربیت نامی ذمہ داریاں بذات خود مقام ہیں۔ اس بارے میں اور میری کہانی کے بارے میں اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

☆ پیاری مدیحہ! جانے والوں سے کیسا گلہ تم تو ان کی مغفرت کی دعا کیا کر داب تمہیں کوئی بھی دشواری ہو پر چاٹنے میں تو ہمارے نمائندے خصوصی فیصلہ آباد ارشد چوہان صاحب کو فون کر کے آگاہ کر دینا اور لڑکی خدارا پچس سے خطمت لکھا کر مجھ تک پہنچنے پہنچے لکھاری بالکل مٹ چکی ہوتی ہے تمہاری تحریر مل گئی ہے پڑھ کر آگاہ کروں گی

☆ عزیزانہ گہمت لاہور سے لکھتی ہیں۔ بے حد پیاری منترہ باجی السلام علیکم! امید ہے اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل سے بخیریت ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بے پناہ رحمتوں اور برکتوں کا نزول فرمائے۔ اعلیٰ کامیاب ہوں اور مراہب سے نوازے آئیں۔ بہت عرصہ بعد حاضر خدمت ہو رہی ہوں۔ کچھ حالات ہی ایسے رہے کہ نہ قلمی تعاون کا موقع ملا نہ سچی کہانیاں سمیت دیگر سالوں کے مطالعہ کا۔ اب انشاء اللہ یہ کوتاہی نہیں ہوگی۔ کوشش رہے گی کہ سچی کہانیاں کے لیے کتنی بھی رہوں اسے پڑھتی بھی..... یہ کہانی نسیم جی حاضر خدمت ہے۔ ہمارے خاندان میں بھی ایک ایسی ہی نسیم جی موجود تھیں مگر ان کی کہانی مختلف ہے۔ یہ کہانی ساتھ پیش آنے والا واقعہ ہے۔ جو صفحہ قرطاس پر بصورت کہانی اتار دیا گیا ہے۔ امید ہے آپ کو دلچسپ بھی لگے گی اور قائل اشاعت بھی..... اور..... میں اب مستقل طور پر لاہور آ گئی ہوں۔ آپ کے تعاون تو توجہ محبت اپنائیت خلوص کی تہ دل سے شکر گزار ہوں دیگر اراکین ادارہ کی خدمت میں سلام آداب.....

☆ فرزانہ! میں کب سے آپ کی منتظر تھی اب آگئیں ہیں تو بس ہم سے جڑی رہیے گا۔ انشاء اللہ جلد آپ کی تحریر سچی کہانیاں کا حصہ ہوگی۔

☆ علی صدیقی لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! امید ہے منترہ سہا مصباح ادارہ اور تمام احوال باخیریت ہوں گے دو ماہ سے شمارہ بہت لیٹ مل رہا ہے آج گشت کی پانچ تاریخ ہے۔ مل نہ پایا ہمیں شمارہ آج بھی اس



لیے دل زردا دکھی ہے کسی بھی کہانی خط اور دوسرے سلسلوں پر تبصرے سے محروم ہوں لیکن اس کے باوجود دل بے حد خوش ہے کہ سچی کہانیاں کے ریڈرز میں اضافہ ہمارے لیے خوش آئند بات ہے رسالے کے لیے ڈیجیٹل دعا اور آپ کی صحت و سلامتی کے لیے بھی کہ آپ نے سچی کہانیاں کو دیکھا اس کا اس ماہ تین بار میں بک اسٹالز پر سچی تینوں بار سچی جواب ملا ابھی آپ لیٹ آئیں وہ رسالہ تو بک گیا میں آپ کو ایک دن بعد لا دوں گا جو مجھے سمیت آپ کے لیے باعث خوشی ہے۔ آخر میں تبصرہ نہ کرنے پر معذرت۔

☆ اچھی سی عظمیٰ انہیں پر چاٹنا تاخیر سے کیوں مل رہا ہے اپنے اکر یا اسٹال والے سے معلوم کرو۔

بس تم لوگوں کا ساتھ چاہیے۔

☆: امان حیدر آباد سے لکھتے ہیں۔ منورہ آپ! السلام علیکم امید ہے آپ اور تمام قارئین سچی کہانیاں ٹھیک ہوں گے ماہ اگست 2018 کا شمارہ باج تارخ کو مل گیا تھا لیکن کچھ مصروفیات کی وجہ سے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں ابھی تک صرف آپ کا ادارہ احوال اور تعارف ہی پڑھا ہے اور یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو دو کہانیاں آپ کو ارسال کی تھیں وہ دونوں کہانیاں فرضی ہیں امید ہے پھر بھی شائع ضرور کریں گی اور آپ نے ٹھیک کہا کیونکہ صاحب بھی تو انسان ہیں نا اور غلطیاں تو انسان سے ہی ہوتی ہیں جیسا کہ میرے خط میں آپ کو غلطیاں ملیں گی جو کیونکہ صاحب ٹھیک کر دیتے ہیں یا پھر آپ ٹھیک کرتی ہیں۔ شیرازی صاحب میرا خط پسند کرنے کا شکریہ دیئے آپ خط بہت اچھے اور طویل لکھتے ہیں آپ کے خطوط مجھے بہت اچھے لگتے اور فیصل مشتاق صاحب میرا خط پسند کرنے کا شکریہ آپ کا خط اچھا لگا۔ اب اجازت چاہوں گا۔ اگلے ماہ تازہ شمارے پر تبصرے کے ساتھ احوال میں حاضر ہوں گا۔

☆: امان بی تو زیادتی ہے مجھے تبصرے کے ساتھ آیا کرو۔ تہااری کہانیاں نمبر آنے پر ضرور شائع ہوں گی۔

☆: ایم حسن نظامی تولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہنا منورہ سہام صاحبہ امید ہے آپ اور ہمارے من پسند پرچے سے جڑے سبھی احباب بخیریت ہوں گے اگست کا پرچہ اپنی تمام تر عنایاں سمیٹے ہاتھوں میں ہے۔ بہت ہی دلکش، جاذب نظر اور معیاری پایا، آپ اور سبھی احباب بھرپور محنت تعاون اور لگن سے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا رہے ہیں اور اس کا معیار آکاش کی دستوں کو چھو رہا ہے۔ سچی کہانیاں کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنے قارئین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں اولین ترجیحات پر ویکم کرتا ہے اور نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو اشاعت کے قابل بنا کر انہیں مزید لکھنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اور یقیناً یہ بہت ہی محنت طلب کام ہے جو ایڈیٹر صاحبہ اور سینئر رائٹرز یہ کام سرانجام دے رہے ہیں۔ منورہ سہام صاحبہ تحریروں کی سلیکشن اپنے علمی تجربہ اور قابلیت کی بنیاد پر بہتر سے بہترین کی تلاش میں سرگراں رہتی ہے جس سے پرچہ دن بدن نکھار کی طرف گامزن ہے۔ اب کی بار انہوں نے اپنے ادارے میں بہت ہی اصلاحی اور منفرد پیغام دیا جو متاثر کن ہے۔ احوال کی پھلکاری رنگارنگ خوبصورت پھولوں اور کیوں سے مہک رہی تھی۔ افضل شاہین رفعت رفیع طاہر عباس شجاع اور شمس خان عرش کو پرچے میں آمد پر سچی آیاں نوں اور اب سدا آتے رہنا سچی پرنس صاحبہ حمیرا وحید تحسین جو بیوہ عالیہ نور ممتاز احمد ملازم تحسین شیرازی سیمیں غزالہ نہاں عبدالغفار عابد فیصل مشتاق مہر پرویز دولہا اور نفیسہ فضل نے دل اور پرستی گفتگو کی حسن علی طالب مجھے یاد دلانے کا شکریہ ریاض حسین شاہ صاحب میں آپ کو پرچے میں آواز دے رہا ہوں۔ میری طرف سے سبھی ورز کو مبارکباد اور بیمار ساتھیوں کی صحت یابی کے لیے ڈیجیٹل دعا دے رہی ہیں۔ آپ کے پرچے میں پہلی تحریر حضرت ثوبان کے بارے میں ایمان افروز باتیں پڑھ کر کبھی جذبہ معطر اور شادماں ہوتے چلے گئے۔ ام

منالہ نے عمدہ تحریر رقم کی۔ عثمان غنی نے چوہدریوں اور وڈیروں کے ظلم و ستم پر معیاری لکھا۔ سملی نسیم بانو نے فرمانبرداری پر خوبصورت طبع آزمائی کی اور تحریر سے عمدہ اسباق ملے۔ تعارف عمدہ اور معطر سلسلہ ہے۔ مور شاہد حسین کے بارے میں آگاہی ہوئی بہت اچھا لگا ایک عزیز کے بارے میں جان کر ان کی تحریر بھی پسند آئی مومنہ بتول کے لفظوں میں بھی درد کی آمیزش محسوس کی۔ ممتاز احمد نے کشمیا سوچ رکھنے والوں کے منہ پر زور دار طمانچہ رسید کیا۔ اور تحریر معیاری پائی۔ جاوید راہی بھی منفرد پیغام لے کر آئے۔ سادہ لوٹ گئے میری حقیقت پر سچی تحریر کو سچی کہانیاں کے مندرجہ فرطاس پر تبصرہ کرنے اور ساتھیوں کا اسے پسند فرمانے پر ڈیجیٹل شکر یہ منورہ سہام صاحبہ نے اپنی تحریر میں لا جواب الفاظ کی آبیاری کی اور تحریر عمدہ پائی۔ پیر شاہ احمد قاری بھی لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے عامل کمال کی دوسری کڑی پسند آئی۔ وہ نیکی اور ہمدردی کی جنگ پر اچھا لکھ رہے ہیں۔ رائٹر منٹ ایمان نداری سے اپنا فریضہ سرانجام دینے والوں کے لیے ایک سبق آموز تحریر ہے۔ حماقت روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے انہوں نے پردہ اٹھایا۔ آئینی مسکن وڈا عشق بھی معیاری پائیں۔ قرطبی عباسی کا سفر نامہ بہت ہی اہمیت کا حامل ٹھہرا۔ شازی سعید فضل کا ناول بہتر جا رہا ہے۔ اسے ہر ماہ جگہ ملنا چاہیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی ڈائری اور شعرو سخن عمدہ اور معیاری سلسلے ہیں جو ہر قاری پسند کرتا ہے۔ میری طرف سے اس قدر منفرد معیاری اور عمدہ مواد کی سلیکشن پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ لکھاری ساتھیوں کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی پر انعام دینے کا ڈیجیٹل شکر یہ خوش رہیے اور ایک دوسرے میں خوشیاں بانٹتے رہیے۔

☆: حسن بھائی ادارہ پسند کرنے کا شکریہ میری خوشی ہے کہ سچی کہانیاں میں ان لوگوں کو شائع کریں جو سچی کہانیاں کا مزاج سمجھتے ہیں آپ سے تو فون پر بھی بات ہوئی تھی اور آپ کو میں نے ایک اہم مسئلے سے آگاہ بھی کر دیا تھا مگر میں مطمئن ہوں سچی کہانیاں کے دوست بہت ہیں لہذا دقتوں کی مجھے فکر نہیں۔

☆: ڈاکٹر عامر شہزاد تنکا صاحب سے لکھتے ہیں۔ محترمہ ایڈیٹر صاحبہ اسٹاف ادارہ شعراء رائٹرز اور قارئین السلام علیکم اگست کا شمارہ چار تاریخ کو بطور اعزاز ارسال کرنے اور میری کہانی شائع کرنے پر ادارے کا شکریہ مکمل مطالعہ کے بعد اب رسالہ زیر تبصرہ ہے سرورق خوبصورت منفرد اور جاندار لگا لیکن مہرے خیال میں اسے سنگل ہونا چاہیے اس کی موجودہ حالت اسے جلد کثرت کرنے کا باعث بن رہی ہے۔ ورنسٹ میں نام آنے پر میری طرف سے افتخار چوہدری مہر پرویز دولہا اور حبیبہ انجم کو مبارک ہو۔ اشتیارات میں موجود مشرتب جیم شیریں مکمل بہار اور چھلکا اسپرول داغی مفید ہیں۔ سہام مرزا صاحب کی تصویر اچھی لگی۔ جوتیوں میں دال کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اصل و پشت گردون ہیں؟ احوال میں افضل شاہین امان صاحب ایم حسن نظامی رفعت رفیع عالیہ نور حمیرا وحید تحسین جو بیوہ الماس فاطمہ اروسہ خان ملازم حسین شیرازی سیمیں غزالہ نہاں عبدالغفار فیصل مشتاق مہر پرویز احمد دولہا اور نفیسہ فضل نے بہترین خطوط لکھ کر تبصرہ نگاری کا حق ادا کر دیا۔ سیمیں غزالہ اور انیلا طالب کو اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائے فیصل مشتاق صاحب میرے آرٹیکل پسند کرنے کا شکریہ میری تعلیم ایم ایل اے ہے۔ حمیرا وحید کے ایک شمارے میں دو خطوط شائع ہونے پر خوشی ہوئی فیصل ندیم بھی صاحب آپ کو سال بھر کے لیے رسالہ بطور اعزاز جاری ہوا یقیناً آپ اس کے اہل اور خوش قسمت ہیں۔ غزالہ عزیز نے حضرت ثوبان کے متعلق لکھ کر روح خوش کر دی۔ ام منالہ کی عشق حقیقی پر دمی یقین ہو گیا کہ واقعی تا جدار شتم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا کفن میلان نہیں ہوتا۔ مور شاہد حسین کا تعارف اور کہانی دونوں لا جواب آپ کی دین اسلام کرکٹ سچی کہانیاں اور پاک آری سے محبت کو میرا سلام ممتاز احمد کی دوسرے کے بیوی منفرد اور غیر تکرار کہانی ہے۔ ارشاد رہا ہے



## اس ماہ کے ونرز

- 1 بہترین کہانی تقدیر گزیدہ مومینہ بتول
- 2 بہترین کہانی صفت فرعون محمد قاسم بلوچ
- 3 بہترین کہانی آسیبی مسکن ڈاکٹر عامر شہزاد

ونرز کو انعامی رقوم ان کے موبائل نمبرز پر ارسال کی جا رہی ہیں۔

پہلا انعام ..... =/1500

دوسرا انعام ..... =/1000

تیسرا انعام ..... =/700

بہترین خط فیصل مشتاق سرگودھا

بہترین غزل نفیسہ فضل محمود کراچی

نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور بد مردوں کے لیے بد عورتیں ویسے میں نے دوسروں کی بیویوں پر عیلائی نگاہ رکھنے والے بہت سوں کے گھر اڑتے اور بعض کو سرباز جوتیاں پڑتے بھی دیکھا اللہ ہدایت عطا فرمائے۔ عابدہ مغنی کی کہانی وڈا عشق کے ابتدائی اشعار نے بھولی بسری ایک کہانی یاد دلا دی۔ ان کے علاوہ سکینہ نسیم کی فرمانبردار اولاد و مومنہ بتول کی تقدیر گزیدہ، جاوید راہی کی شرمندگی، شگفتہ شفیق کی اس ماہ کا شاعر نسیم زہرا کی برا انجام، محترمہ منورہ سہام صاحبہ کی اللہ پوچھے گا، اور شہیدہ مظہر کی کولڈ فیئر بہترین کہانیاں ثابت ہوئیں۔ سلسلہ دار کہانیاں بھی اچھی چل رہی ہیں مسئلہ یہ ہے اور انعامی سلسلہ عوام میں بھرپور اہمیت حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کی ڈائری میں شانلہ نوید نورین، جبران، افضل شاہین، امینہ بی بی رضیہ، فرزانہ رشید، کنول نسیم، نوشین علوی، عبدالوہاب، کول فرحان، رضوانہ لطیف، انیلہ سلطان، کاظمہ، کرن اور رضوانہ تاج نے اچھی اور دل کو چھو لینے والی تحاریر لکھ کر دل خوش کر دیا۔ شمع و سخن میں ایم حسن نظامی، ذیاعلی، نفیسہ فضل، رفعت خان، فاطمہ حسن، فرح نسیم مراد اور زاہدہ سرور نے بہترین اور منفرد شاعری تخلیق کی۔ میری محمد حلیف شاہ کز، ماسٹر خالد عباس، دعا علی بخاری اور محترمہ نینا خان سے گزارش ہے کہ آپ بھی کچی کہانیاں کے لیے لکھا کریں کیونکہ ہم سب نے دل اس کو ترقی کے عروج پر لے کر جاتا ہے انشاء اللہ آخر میں دعائے خیر ہے کہ کچی کہانیاں کا اقبال ہمیشہ بلند رہے آمین۔

☆ بھائی عامر! کچی کہانیاں آپ کو اچھا لگ رہا ہے مجھے یہ جان کر بہت اچھا لگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ پابندی سے احوال کا حصہ بنتے رہیں گے۔

☆ فیصل مشتاق قبولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ امید ہے کچی کہانیاں سے جڑے تمام ساتھی اور آبی منزلہ بخیریت ہوں گے۔ پچھلی بار شارے نے بہت انتظار کر دیا مگر اس مرتبہ بہت جلد مل گیا۔ احوال میں بھی دوست حاضر تھے۔ آبی منزلہ کا احوالوں کو پیغام پسند آیا۔ پرنس افضل شاہین بھائی بہت دنوں بعد نظر آئے ان کا خط اچھا لگا اور میں آپ کی بات سے مطمئن ہوں نہیں نہ کہیں تھوڑی سی کمی ہے اور وہ ڈاکٹر طارق محمود آکا ش کی ہے۔ حسن نظامی، مقصود احمد بلوچ، قاسم خان بلوچ، محسن طاب، پرنس افضل شاہین ان سب کی تحفل ایک خاصا رنگ جماتی تھی۔ مجھے امید ہے ڈاکٹر طارق اپنی مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر ضرور آئیں گے۔ میں بلاشبہ ان کے خط اور کہانیاں مس کر رہا ہوں۔ خطوط میں ایم حسن نظامی، محسن طاب، اروش خان، ملازم حسین شرازی، حمیرا وحید، عبدالغفار عابد، نفیسہ فضل، مہر پرویز، ممتاز احمد اور دیگر ساتھیوں کے خط بلاشبہ اچھے لگے۔ فیصل ندیم بھٹی کو بہترین خط کی کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں نے پچھلے تبصرے میں بھی ذکر کیا تھا کہ ان کا خط مجھے بہت پسند آیا۔ جن دوستوں کو میرا خط پسند آیا ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ محسن علی طاب اچھا دوست ہے۔ محسن میں جلد تمہاری کہانی پڑھنے کا خواہشمند ہوں۔ منزلہ آبی کو میرا خط پڑھ کر ہنسی آئی اور مجھے خود اپنا خط پڑھ کر بہت ہنسی آئی جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے ساری دل کی باتیں لکھ دیں۔ آبی میں آپ کے مشورے پر ضرور عمل کروں گا میں جلد ہی آپ کو ایک مزاحیہ کہانی ارسال کر رہا ہوں امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ مور شاہد حسین بھائی بہت ہی اچھے ہیں مزید ان کا انٹرویو پڑھ کر اندازہ ہوا۔ وہ واقعی ایک بہترین شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا انٹرویو پڑھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ انہیں ڈھیروں کامیابیاں اور خوشیاں عطا کرے آمین۔ کہانی بھی بہت عمدہ تھی اب میں کہانیوں کی بات کروں تو اس مرتبہ دو کہانیوں کی تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ وڈا عشق تو میرے سر سے گزرتی۔ بڑے محسن سے پڑھ رہا تھا مگر اختتام پر جب دیکھا لڑکی خواہ سر اٹھی۔ مجھے بہت حیرانگی ہوئی اور کچھ سمجھ نہیں آئی۔ خیر عابدہ

مغل آئی ہو سکتا ہے مجھے سمجھ نہ آئی ہو۔ الفاظ اچھے لکھے اس کے بعد جو کہانیاں مجھے پسند آئیں ان میں دوسرے کی بیوی زندگی شرمندگی ساون لوٹ گئے گلے کا طوق شامل تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر کہانیوں میں ریٹائرمنٹ، حماقت، انجام فرما، اندر دار والا، سبھی مسکن حماقت، اللہ پوچھے گا، مٹی بہت پسند آئی۔ اللہ پوچھے گا مزاح سے بھر پور تحریر تھی۔ یقین کریں مجھے مزاحیہ تحریریں بہت پسند ہیں اور ہر شمارے میں مزاحیہ تحریر ہوتی رہے آ جاتا ہے۔ مجھے شاعری اچھی لگی۔ آپ کی ڈائری کے صفحات بھی عمدہ اور کارآمد تھے۔ غلام جو بنے سردار میں حضرت نوبان کے بارے میں پڑھ کر کافی معلومات حاصل کیں۔ جن دوستوں نے غزل کو پسند کیا ان کا بہت شکر ہے، سر حسن نظامی کے کہنے پر میں نے بھی کہانیاں کو غزل ارسال کی تھی اور بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری غزل انعام یافتہ قرار پائے گی۔ میری اس کامیابی پر میں اپنے استاد سر حسن نظامی صاحب آبی مندرہ سہام اور مور حسین بھائی کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ سچی کہانیاں سے پہلی ہی انٹری میں بے شمار محنت کی اسی وجہ سے لوگ سچی کہانیاں کے دلدار ہیں۔ اللہ ہمارے ہرچہ کو مزید ترقی دے اور آپ کی مندرہ کو سدا خوش رکھے۔

☆ فیصل بھائی اکوٹش تو جتنی بھی منتظر ہوں اور تم بھی ایسے ہی اچھے اچھے خط لکھتے رہا کرو۔ شاہ قادی صاحب اور شازلی سعید مغل کی شکر گزار ہوں جو مجھے وقت سے بہت پہلے اپنی تحریر ارسال کر دیتے ہیں ڈاکٹر طارق آکاش کی تو میں بھی منتظر ہوں اور تم بھی ایسے ہی اچھے اچھے خط لکھتے رہا کرو۔

☆ عبدالغفار عابد چچہ وطنی سے لکھتے ہیں۔ ایڈیٹر اور عزیز احوالیوں کو میرا خلوص بھرا سلام قبول ہو۔ اپنے میرے کا آغاز حسب معمول ادارے سے کرتا ہوں دنیا کا اصول ہے کہ جب کوئی نئی اور نادر شے حاصل کرنا ہو تو قیمت بھی ایسی اموال ہی چکانی پڑتی ہے۔ اس لیے میرے وطن عزیز جیسی اموال دولت حاصل کرنے کے لیے قیمت بھی اموال چکانی کی ہزاروں نوجوان اس کی راہ میں قربان ہوئے۔ بوڑھے بھی کسی سے کم نہ تھے۔ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں نے بھی اپنے آپ کو قربان کیے اور بچوں نے بھی اپنی معصومیت داؤ پر لگا لی جب کہیں جا کے پاکستان جیسی عظیم نعمت حاصل ہوئی ہماری بد قسمتی کہ قائد اعظم کے بعد ہمیں سیاستدان تو بہت ملے مگر کوئی لیڈر نہ ملا جو اس نعمت کی حفاظت کرنے میں کردار ادا کرتا اگر کوئی ملا بھی تو وقت کے مفاد پرست خدایوں نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔ فرد ہو یا قوم غلت پسندی اور بے صبری بنانا یا کام لگا دیتی ہے ہمارے مفاد پرست سیاستدانوں کی غلت پسندی اور بے صبری نے زمین کے اس ٹکڑے کو دودھوں میں نسیم کر دیا۔ پوری دنیا میں ہمارے ملک کی شکل و صورت جس طرح بگڑ چکی ہے یہ سب جو تہوں میں دال پائے والے سیاستدانوں کی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ باقی آپ بہت خوبصورت اور شاندار کام لکھتی ہیں آپ کی خوبصورتی ایسی ہے کہ آپ ان موضوعات پر بھی خوبصورتی سے لکھ لیتی ہیں۔ جن کے میں بڑے بڑے لکھاری لکھنا تو دور کی بات سوچنے سے بھی ڈرتے ہیں آپ سے گزارش ہے کہ یہاں کسی سیاستدان کا نام نہ لکھا کریں۔ ہمارا مقصد اس پلیٹ فارم پر بحثیں تقسیم کرنا ہے تاکہ کسی کا دل دکھانا امید ہے آپ میری بات سمجھتی ہوں گی۔ زندگی کا مقصد عشق حقیقی سے وابستہ ہے جس سے عشق حقیقی کو پالیا کو یادہ کامیاب ہو گیا اس موضوع پر اُم منائل نے بہت شاندار تحریر لکھی۔ اس دنیا کی زندگی انسان کے لیے ایک امتحان گاہ ہے اس امتحان میں اسے کامیابی نصیب ہوتی ہے جو اپنی تمام خواہشات کو مٹا ڈالتا ہے اور جس کی حفاظت کرتا ہے۔ اپنے نفس کی حفاظت نہ کرنے والا اور اپنی خواہشات کا غلام بن جانے والا اس دنیا کے اس امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے آدمی کی یہ ناکامی دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بن جاتی ہے۔ عثمان غنی نے اپنی تحریر مکافات عمل میں اس موضوع پر بہت خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی مودینہ نے اپنی تحریر تقدیر گزیدہ میں انسانیت کو

زندہ رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی اس وقت معاشرے کی اصلاح کے لیے ایسی تحریریں بہت ضروری ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا یعنی خوبصورت اور عمل مند جو لوگ دنیا کی زندگی کو عقل مندی اور دانائی سے گزارتے ہیں ان کے لیے بے شمار خوشخبریاں ہیں جو لوگ اپنی انا اور ہٹ دھرمی پر قائم رہ کر اپنی مرضی کی زندگی جیتتے ہیں وہ ہمیشہ ناکام اور نامراد رہتے ہیں لعنت کا طوق ان کے گلے کا ہار بن جاتا ہے اس کی مزید تفصیل جاننے کے لیے آپ کو مور شاہد حسین کی تحریر گلے کا طوق پڑھنا ہوگی۔ جاوید راسی زندگی شرمندگی انسان کے مقدر کی تعریف کر رہے تھے۔ قدرت کا ملہ کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کا ہے جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ ہر چیز ہر معاملہ اللہ کے تابع ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اور آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تن یہ تقدیر ہو رہی ہیں۔ جو کچھ بھی اللہ نے طے کر دیا ہے وہ ہوتا ہے تو اللہ ہی کے حکم سے ہے مگر اس میں ہمیں اپنا حصہ ڈالنا ہوتا ہے اپنا کردار بہر حال ادا کرنا ہوتا ہے تقدیر کی حقیقت اتنی ہے کہ ہمیں اپنے حصے کا کام پوری دیانتداری اور جان فشانی سے کرنا ہے اور نتائج کو اللہ کی محبت پر چھوڑ دینا چاہیے یہ یقین ہمارے دلوں میں بٹھانے سے کہ غلوں نیت کے ساتھ کی جانے والی محنت کو اللہ تعالیٰ بھی ضائع نہیں کرتا کہ ان کی سنت کے خلاف ہے۔ ہم زہرا کی برا انجام ایک سنی آموز تحریر تھی اللہ کے حکام کی پیروی نہ کرنے والے ہمیشہ گھانے میں رہتے ہیں۔ گھانے کھانے والے ہی اپنی اہمیت کا رونا روتے ہیں خود بگاڑی تقدیر کا الزام اس ذات پر لگاتا جو ہمیں ستر ماؤں سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ شہید مظہر راجھا کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی ہر تحریر معاشرے کے لیے سبق کا درجہ رکھتی ہے کہتے ہیں ادب سے انسان زندگی اور معاشرت کو زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے آج معاشرے کی اصلاح کے لیے اچھے ادیبوں کی تحریریں ضروری ہیں کولڈ فیر بھی ایک ایسی ہی تحریر ہے۔ یہ تحریر سچی کہانیاں کی قبولیت میں اضافہ کرے گی سسر شہید مظہر راجھا کا شکر یہ کہ اس نے سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے وقت نکالا عابدہ مغل اپنی تحریر وداشت میں چند بے عیش کی تعریف کر رہی تھی اور میں اس شعرے اس کی وضاحت کرتا ہوں

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا نہیں تو ہو

ہم جس میں رہ رہے وہ دنیا نہیں تو ہو

غلام مرتضیٰ علوی کی حماقت، تمیز جلیل کی تاریخ کے جھڑکوں سے حسن نظامی کی ساون لوٹ گئے، بھی شاندار تحریر تھی۔ عزیز ساقیو تبصرہ ایسی باقی ہے میرے خیال میں مقررہ حدود کو اس کر رہا ہوں اور باقی پہلے ہی مجھ سے ڈر رہی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ناچیز کے ٹوٹے پھوٹے لفظوں پر مشتعل بے جا تبصرہ پڑھ کر مزید ڈر جائیں ویسے باقی آپ کو راز کی بات بتاؤں میں خود بہت ڈر پوک ہوں بہت سے عظیم قاری اور اسٹرز میری اس کمزوری سے واقف ہیں اس لیے تو کوئی نہ کوئی نوٹس بھیجتا رہتا ہے اور میں عدالتوں میں ان نوٹس کی پیروی کرے کرتے اب شیر بن گیا ہوں۔ بہت ساری دعائیں قارئین کے لیے.....

☆ عابد بھائی! آپ نے ٹھیک کہا مجھے ہر معاملے میں نیشنل رہنا چاہیے لیکن شاید آپ نے ادارے کو توجہ سے نہیں پڑھا میں نے اس میں میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ رویے کی نشاندہی کی ہے کسی سیاسی جماعت یا اس کے قائد کی نہیں..... ویسے عابد بھائی کوئی آپ کو نوٹس بھیج ہی نہ دے زیادہ چھیڑ چھاڑ مت کیا کریں کہانیاں پسند کرنے کا شکر ہے۔

☆ فسرین اختر تینا اسلام آباد سے لکھتی ہیں۔ ڈیز مندرہ کیسی ہیں آپ؟ بے حد خوشی ہوئی۔ احوال کی روایتیں عروج پر ہیں اور اس کا کریڈٹ آپ کو اور آپ کی ٹیم کو جاتا ہے۔ جوتیوں میں دال یہ عنوان ہے اس

ماہ آپ کے ادارے کا..... اور ہمیشہ کی طرح آپ نے نہایت حساس اور نازک موضوع پر طبع آزمائی کی ہے اور اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ لکھنے والوں کا طبقہ تو ہوتا ہی ہے حد حساس اور دردمند دل کا مانگ، عشق حقیقی میں مصنفہ نے ایک نہایت ہی عظیم بزرگ کے حالات زندگی کا احاطہ کیا، جس سے ایمان تازہ ہو گیا۔ ایسی تحریریں تو معاشرے کے لیے مشکل راہ ہوتی ہیں۔ مکافات عمل ایک طویل عبرت ناک کہانی ہے واقعی گناہ گار اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ اللہ کے ہاں دیر سے مکراندہ نہیں گلے کا طوق بہترین بڑا سر اور تحریر ہے۔ اللہ پوچھے گا دلچسپ تحریر ہے اور یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ منورہ کی تحریر ہے دراصل میں نام پڑھے بنا ہی تحریر پڑھنا شروع کر دیتی ہوں شمس ہو کر نام دیکھا تو حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی وہ دن منورہ باقی تحریریں بھی یقیناً اچھی ہوں گی فی الحال یہی پڑھ سکی ہوں شکریہ وسلام۔

✽ بہت اچھی نسرین! تنہا رخصت پا کر بہت اچھا لگا اسی طرح احوال میں شرکت کیا کرو میری تحریر پسند کرنے کا شکریہ۔

✽ ملازم حسین شیرازی بکھرے لکھتے ہیں۔ محترمہ منورہ سہام صاحبہ السلام علیکم! امید ہے بخیریت ہوں گی۔ 18 اگست کا احوال نامہ آپ کی خدمت میں پہنچا ہے۔ سب سے پہلے احوال نامے میں شرکت کرنے والوں سے استدعا ہے کہ ہر کہانی، خط پر یک سطر کیوں نہ ہو اپنے نفس ضرور دیں۔ اس سے لکھاری حضرات کی نہ صرف حوصلہ افزائی ہوتی ہے بلکہ تبصرہ نگار کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے کہ وہ کس گن اور دلچسپی میں مغموم مطالعہ ہے خط و تبصرے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ اگست 2018 کے شمارہ کا مکاشفہ خوبصورت ماڈل کی سوچ میں خوبیت کا مظہر ہے، ادارہ آپ نے صحیح فرمایا کہ جنہوں نے ملک کے غریب اور مظلوم عوام کے اربوں روپے بیرون ملک جائیدادوں میں توسیع اور خرید و فروخت میں لگائے۔ اپنی اولادوں کو ارب پتی بنایا۔ انہی پر عدالتوں میں پیش کیے گئے موقوف پرمنوں کے حساب سے گل پاشی ہوتی ہے۔ زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے ہیں اگر جیل میں ایک رات چار پائی کے بغیر نیچے سوئے تو ایسا دوا دیا جائے گی جیسے سولی پر لٹک رہے ہوں۔ دوسری طرف سالوں سے بھاکسی کی کوٹھیوں میں بھوس اور عمر قید گزارنے والے زمانہ نظروں سے انصاف کے متلاشی ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ غلام بنے سردار ام ایمان حضرت ثوبان کی نبی پاک ﷺ سے محبت کی سرشاری مودت اور عقیدت کا ایثار ہی تھا کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے آپ نے آزادی حاصل کی تو اپنے عزیزوں یا خاندانوں میں واپس جانے کو قبول نہ کیا۔ غلامی رسول ﷺ میں زندگی بسر کی، عشق حقیقی ام منال روح پرور واقعات سے مزین خوبصورت قصہ اچھی تحریر مکافات عمل عثمان غنیؓ مکافات عمل ایک گناہ کی سزا عدل و انصاف حشر پر موقوف نہیں زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے فرمانبردار اولاد ملکی نسیم ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری کرنے والی اولاد بھی ناکامی نہیں دیکھتے ہمیشہ سرخوردہ رہتے ہیں۔ اچھی تحریر تعارف مور شاہد حسین تعارف حاصل کر کے بہت خوشی ہوئی جن سے خلوص و جاہت کے رشتے ہوں ان کے حالات سے آگاہی ضروری ہے گلے کا طوق پر اثر کہانی بہت عمدہ تحریر نقد پر برتریدہ مومنہ بٹول بٹوارے کے نتیجے میں ہونے والے حالات و واقعات کے زخموں کی کسک آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ غم و رنج و دہی تحریر لیکن آخر میں تسکین کا باعث بنی بہت خوب دوسرے کی بیوی ممتاز احمد موجودہ دور کی زہر آلود سچائی، سبقتی آموز کہانی، اللہ پوچھے گا منورہ سہام دائی خوشی اور نیک مقصد کے حصول کے لیے جن کی عاشقی کا دوا دیا گیا کیا۔ نتیجتاً حمیدہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی جہاں چاہتی تھی وہیں شادی ہوئی، مزاج اور سپنس سے بھرپور خوبصورت دل کداز کہانی، عمدہ تحریر زندگی شرمندگی جاوید راہی بعض

اوقات انجانے میں ایسے واقعات حالات رونما ہو جاتے ہیں کہ بد نصیبی ڈورے ڈال دیتی ہے قسمت کی دیوی رومی رہتی ہے عبرت دیتی کہانی آج کا شاعر شکستہ شفیق عمر تنہا کے بارے میں شکستہ جی کی پُر مغز بہترین تحریر شعروادب میں اپنے ہم عصروں سے الگ کامیاب اور مقام قبولیت کے چھنڈے کاڑھنے والے عمر تنہا شہری دنیا کے شور شرابے میں تنہا سفر کرنے والے سادہ لوٹ گئے حسن نظامی دل پر اثر کرتی بہترین اور اچھوتی تحریر عامل کامل طاغوتی تو توں اور شیطانی طاقتوں کے خلاف ایک دہن دار اور ایماندار بندہ نیک نے نکر لی اور ان کی کالی دنیا کو اپنے ایمان کی روشنی سے منور کرنے کی جرتیں کیں بہت خوب تاریخ کے مہر واکوں سے تہینہ جلیل اسلامی معلومات فراہم کرتی بہترین تحریر ان معلومات اور علمی میدان میں مسلمانوں نے تعلیم کار ناموں سے ساری دنیا کے مذاہب استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ بہت عمدہ حماقت غلام مرتضیٰ کسی بھی کمزوری یا خامی پر احساس کمتری میں مبتلا رہنا اپنے آپ کو ناقابل حلائی نقصان میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ آئینی سکون ڈاکٹر عامر شہزاد جنات کے وجود سے انکار احکام خداوندی سے منحرف ہونا ہے غیر مری طاقتوں کا وجود اظہار من گھڑت ہے۔ وڈا عشق عابدہ مغل، بلاشبہ ایک خوبصورت کہانی، باقی کہانیاں سلسلے ترک میں عباسی الماس آپ کی ڈائری مسئلہ یہ ہے بہترین ہیں۔ احوال نامے میں پرنس افضل شاہن کرسی صدارت پر فاتر مبارکباد انجم حسن نظامی حسب سابق آپ کا خط نہ نئی دلچسپیوں اور مکی خوشبوئیں سینے منھاس سے لبریز ہے بہت خوب عالیہ نورجی کہانیاں کا ہر قاری لکھاری مالا میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح ہے۔ درود دل رکھتے ہیں سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھیں رب بھلی کرے گا۔ رفعت رفیع آپ نے خط میں لکھا کہ مطالعہ کی بہت شوقین ہیں۔ حوصلہ افزائی کی منتی ہیں بہت اچھی بات ہے حاصل مطالعہ سے لکھنے پڑھنے میں آسانیاں ہوں گی۔ خط آپ نے عمدہ تحریر کیا۔ حمید حمید آپ نے خوبصورت خط لکھا ماشاء اللہ امید ہے جی کہانیاں میں شرکت پابندی سے کریں گی۔ حسین جونجو ہمیشہ کی طرح آپ کی تحریر لاجواب اور نہایت عمدہ باتوں کی حامل اگر مجھے اپنے آپ سے محبت ہے تو میں لازمی طور پر دوسروں کی عزت اور محبت کروں گا۔ ممتاز احمد آپ کا خوب صورت خط لکھا تو نہیں البتہ آپ کی مصروفیت نے آپ کے ہاتھ کو مزید لکھنے سے روک دیا۔ رانا نیوز بھکر بک اسٹال کی جی کہانیاں سے متعلق لاہور اہی غفلت اور عدم توجہی بارے آپ سے فون پر بات کروں گا۔ اروشہ خان آپ کے احوال نامے میں شرکت سے دل سرور ہوا خط بہت اچھا لکھا حسن علی طالب آپ کے نام کے تینوں حروف اعلیٰ دارفہ ہیں خط بھی شاندار ہے۔ ہمیں غزالہ تنہا آپ کا خط بہت دلچسپ ہوتا ہے آپ کی صحت اور گھریلو دائی خوشیوں کے لیے ہر وقت دعا رہتی ہے خوش رہیں۔ عید الفطر عابدہ آپ کے خطوط و کہانیاں میں جہاں اچھی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں وہاں بھی کبھی جی کہانیاں سے وابستہ قارئین لکھاریوں سے گلے شکوے کرنے میں اپنی صلاحیتوں کو زیر بار کرتے ہیں۔ اس بارے میں تھوڑا خیال رکھیے گا۔ گستاخی معاف مہر پرویز دولو آپ کے احوال نامے کو بڑی توجہی اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے خوب صورت و دیدہ زیب موتیوں بھری لڑی نگاہوں میں چمک پیدا کرتی ہے۔ ماشاء اللہ باقی خطوط نہایت دلچسپ ہیں انہوں نے کہ ان پر تبصرہ نہ کر سکا۔ محترمہ منورہ سہام جی کہانیاں میں شائع شدہ کہانیاں جہاں نہایت دلچسپ اور متاثر کن ہوتی ہیں وہاں خطوط بھی نہایت محبت و عقیدت کے پھولوں سے پروئے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک شمارہ قارئین کی محبت نظروں کے سامنے رہتا ہے ہم رنج الم سے دوری کا سبب بنتا ہے۔ آپ کی زیر ادارت قارئین لکھاریوں کو جو عزت احترام اپنائیت نصیب ہوئی ہے آج کی اس مطلب پرست اور خود غرض دنیا میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔



اس سال 71 واں یوم آزادی منایا جا رہا ہے ہر طرف جشن کا سماں ہے خدا کرے میں کروڑ عوام بیز ہلائی پرچم کے سائے تلے دای خوشیاں پائیں خط ہڈا کے ساتھ کہانی؟ کیا ملاپ؟ اس سال ہے۔ چندون پہلے کہانی کی مرکزی کردار سے ملاقات ہوئی اس کی حالت دیکھئے اور واقعات سنئے کے بعد کئی دن آداسی اور عالم پریشانی میں رہا اگر قابل اشاعت ہو تو میرانی فرما کر زندگی اشاعت میں جگہ دیں۔ جب کراچی آنا وہاں سب سے پہلے آپ سے اور ادارے کے دیگر احباب سے شرف ملاقات حاصل کروں گا۔ اجازت چاہتا ہوں اللہ پاک آپ کو اہل و عیال کے ساتھ ہمیشہ سیکھی رکھے آمین۔

☆ شیرازی بھائی! اتنے مفصل خط کے بعد اب میں کیا کہوں ہمیشہ کی طرح خوب لکھا کہانی جلد آپ کی تصویر کے ساتھ شائع کروں گی اور ضرور تشریف لائے یہ آفس آپ کا ہی ہے۔  
☆ مور شاہد فخر شہداد کوٹ سے لکھتے ہیں۔ ڈیر آپ کی منہ سہام دعا میں آداب اگست کا شمارہ دلکش سرورق کے ساتھ موصول ہوا۔ آپ کا ادارہ جو تئیں میں دال زبردست ورق پلٹتے ہی اپنوں کی محبتوں کی محفل احوال میں قدم رکھا۔ فرس انجمن صاحب صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ بھائی کرے آیا (خوش آمدید) عالیہ نور اللہ آپ کی مشکلیں آسان فرمائے۔ ایلا طالب کی صحت یابی کے لیے دعائیں! ام حسن نظامی ممتاز احمد ملازم حسین شیرازی سیمیں غزالہ (مبارکباد اللہ پاک آپ کے پوتے کو صحت اور دوا عزم عطا فرمائے آمین بھی مٹھائی کہاں ہے) عبدالغفار عابد فیصل مشتاق بھائی (موسٹ ویکم مبارکباد آپ کی پر خلوص محبت کا بے حد شکریہ) مہر پرویز دولہ پور تمبرے کے ساتھ احوال میں حاضر تھے۔ ادی حسین جو نیو سلامت رہیں نئی عزیز مئے آپ کی کمی محسوس ہوئی۔ غلام جوئے سردار بہترین سلسلہ ہے جاری رہنا چاہیے۔ ام مسائل عشق حقیقی سے شک محبت کے غلاموں کا کفن میلا نہیں ہوتا۔ عثمان غنی مکافات عمل بہت خوب زبردست سلیکی نسیم فرمانبردار اولاد اچھی تھی۔ میرا تعارف اور کہانی آپ ہی بتا سکتے ہیں منتظر ہوں۔ مومنہ بتول تقدیر گزیدہ عمدہ تحریر پڑھنے کو دی۔ ممتاز احمد دوسرے کی بیوی سبق آموز لا جواب جاوید راہی زندگی شرمندگی ایم حسن نظامی ساون لوٹ گئے شاندار تحریریں لائے۔ اس ماہ کا شاعر شگفتہ شفیق صلیبہ عمر تنہا کا زندگی نامہ سناری تھیں۔ محمد قاسم خان صفت فرعون زبردست تبسم زہرا انجام سبق آموز عمدہ تحریر لائی۔ آپ کی منہ سہام اللہ پوچھئے گا۔ مزاح سے بھر پور تحریر پڑھنے کو دی پیر محمد شاہ عامل کامل دلچسپ حامد تانابی ریاض منٹ تہمتہ جلیل تاریخ کے جہر کوں سے غلام مرتضیٰ حماقت اچھی تھی شبیبہ مظہر کولڈ فیر اگلی قسط کا انتظار ڈاکٹر عامر شہزاد آسی مسکن عابدہ مغل دوا عشق پسند آئی قمر علی عباسی معلومات کا خزانہ شازی سید مغل الماس عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے مسئلہ یہ ہے آپ کی ڈائری شعر و سخن رسالے کی جان سمجھو۔ اب اجازت۔

☆ بھائی شاہد! اچھی کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ آپ نے درست کہا آپ کا تعارف پڑھنے والوں کو کیا لگا وہ ہی بتائیں گے۔ آپ کی شاعری شعر و سخن کے صفات پر شائع کر رہی ہوں۔ آپ سے فون پر بات ہوئی تھی قاتلو کو کوں کے سبق کی پرواہ مت کریں ہمارے پاس کرنے کو بہت کام ہیں اور یہ بیچارے صرف سازشیں کر رہے ہیں میں تو کہتی ہوں کہ بھی بہت قابل ہو تو ذرا دوسرے معیاری ڈائجسٹوں میں بھی چھپو۔ سارا زور اچھی کہانیاں پر ہی رکھیں؟

☆ ام مسائل ایڈٹ آباد سے تھی ہیں۔ پیاری منہ باجی! السلام علیکم! میری طرف سے تمام اشاف کو دل جاذبوں کے ساتھ عید الاضحیٰ مبارک ہو جن کو انعامات ملے انہیں میری طرف سے بہت بہت مبارکباد دینا! طالب کے ساتھ ساتھ باقی وہ سب جو ہست علالت پر ہیں ان کی صحت یابی کے لیے دل کی گہرائیوں سے

دعاے طالب ہوں جو دنیا سے چلے گئے ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتی ہوں اور جو رشتہ ازدواج میں بندھے ہیں ان کے لیے بہترین زندگی کی دعا کرتی ہوں اور جو اب تک کنوارے ہیں ان کے حق میں بہترین جیون ساسھی کی دعا کرتی ہوں اللہ سے امید ہے کہ وہ میری تمام دعائیں قبول فرمائے آٹھ اگست کی خوشگوار صبح ساون لوٹ کر برس رہا تھا اور ایڈٹ آباد کی سرکوں پر گھنٹوں تک پانی تھا ایسے بھیکے موسم میں بیچکا بیچکا ساسھی کہانیاں آیا تو موسم کا لطف دہلا ہو گیا جلدی جلدی اپنی کہانی پڑھی تو مزید خوشی دہنی ہو گئی کیونکہ اس دن آگست صبح سننے ہی دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور پوری امید تھی کہ آج ڈائجسٹ ضرور آئے گی اور امید پوری بھی ہوئی۔ اب آتے ہیں تمبرے کی طرف کہانی انسانی معاشرے کا عکاس ہوتی ہیں اور حقیقت نمائندگی ہے پہلے واقعہ ہوتا ہے پھر وہ واقعہ کہانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس نتیجے میں جنم لینے والی وہ کہانی کسی انسان کی اصل زندگی سے مشابہت اختیار کر لیتی ہے۔ زیر نظر شمارے میں بھی کہانیاں کسی انسان کی حقیقی زندگی سے جڑے واقعات کی عکاسی کر رہی ہیں اور وہی معاشرے کے دیکھے ہوئے ناسور محبت پیار عشق، نفرت بدلہ، غربت رشوت قربانی اور مکافات عمل کے گرد گھومتی ہوئی کہانیاں ہیں سب سے پہلے مکافات عمل جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے دنیا مکافات عمل کا دوسرا نام ہے۔

دیسے تو علامہ اقبال کی پوری شاعری ہی سبق آموز ہے مگر مجھے ان کا یہ شعر بہت پسند ہے فرمانبردار اولاد احکامات الہی پر کبھی کسی ایک سبق آموز تحریر ہے دنیا میں جس رشتے کا درجہ سب سے بلند ہے جب انسان اس کو تکلیف پہنچاتا ہے تو عرش بھی روتا ہے اور زمین بھی مل جاتی ہے اور پھر بدلہ دہی ہوتا ہے جس کو دنیا مکافات عمل کا نام دیتی ہے شاہد حسین بھائی بچپن تو ہوتا ہی ایسا ہے جس کی یادیں انسان مرتے دم تک نہیں بھولتا وہ دور ایسا ہوتا ہے جب انسان ہر فرد اور ہر عمر سے آزاد ہوتا ہے گلے کا طوق کلام الہی میں بہت برکت ہے آج ہم جس مشینی دور سے میں سانس لے رہے ہیں اور بھاگی دنیا کے مسافر بنے ہوئے ہیں وہاں کلام الہی سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں یہ جاننے ہوئے بھی کہ دنیا کے ہر مکے کا حل کلام پاک میں موجود ہے! ادھر ادھر بھنگ رہے ہیں اگر ہم کلام الہی کی حقیقت سمجھ جائیں تو پھر اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا تقدیر گزیدہ کسی دوسرے کی خواہش کی خاطر اپنی خوشیوں کو قربان کر دینا ہر ایک کی خاصیت نہیں ہوتی یہ اعلیٰ ظرفی تو اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو ہی حاصل ہوتی ہے اور سلطان ان میں سے ایک تھیں دوسروں کا صبر آزما تو بہت آسان ہوتا ہے مگر خود صبر کرنا انسان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

قیام پاکستان کے لیے قربانیاں دینے والے بہت اعلیٰ ظرف اور بلند کردار لوگ تھے جنہوں نے اپنا سب کچھ پاکستان پر قربان کر دیا۔ دوسرے کی بیوی ان مردوں کے لیے سبق آموز ہے جن کی نظریں دوسری عورتوں پر سے ہٹتی ہی نہیں ہیں ساون لوٹ گئے ایک دھکی رشتوں اور چھوٹے بیٹے کی قربانیوں سے ہنسی جاندار تحریر بھی یہاں بھی وہی چھوٹے بیٹے کی قربانیوں کی داستان جس نے مرتے دم تک خاندان کو ایک لڑی میں باندھ رکھنے کے لیے ہر رشتہ نبھایا بقول شاعر

کسی کو گھر ملا کسی کے حصے میں دکان آئی  
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا میرے حصے میں ماں آئی

برا انجام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے برے کا انجام برا ہی ہوتا ہے انسان اگر وقت پر ہوش کے ناخن لے لے تو اسے مستقبل میں بچھتا تانہ پڑے۔

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چک گئیں کھیت

تاریخی کہانیوں پر کیا تبصرہ کروں یہ تو اپنی مثال آپ ہوتی ہیں یہ ہستیاں تو اپنی ذات میں خود ہی تعریف ہوتے ہیں ان ہستیوں کی شان میں تو الفاظ بھی چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ اس خط کے ساتھ آپ کو ایک کہانی بھیج رہی ہوں پڑھ کر بتائیے گا کیسی ہے اور قابل اشاعت ہے یا نہیں.....

☆: ام منال! تمہاری تحریر لکھی ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی شاندار تبصرہ بھیجے گا شکر ہے۔  
☆: مختصر حیات رودھل سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم اختر مزہ پیاری آپ کی مزہ سہام آپ کیسی ہیں امید کرتا ہوں آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی پوری نیم کو سدا خوش رکھے سلامت رکھے اور لمبی عمر دے آپ ہمیشہ خوش رہیں اگست کا پرچہ اگست کو مل گیا۔ آئی یہ کیا اگست کا شمارہ بغیر ناسٹل کے کیوں آ گیا۔ مزہ پیکا پڑ گیا۔ اس کے بعد جب شمارے کے اندر گیا تو وہ کیا بات ہے شمارہ ہر لحاظ سے سپر تھا۔ سب کہانیاں بہت بہت ہی زبردست اور اچھی تھیں عمدہ اور سبق بھی تھیں۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ لیکن مجھے جو سب سے زیادہ اچھی لگی ان میں عشق حقیقی فرما میر دار اولاد لکھنے کا طوطی زندگی شرمندگی ساون لوٹ گئے برا انجام اللہ پوچھے گا تاریخ کے جھروکوں آ سبھی مسکن اور ڈا عشق شامل ہیں۔ یہ کہانیاں مجھے بہت بہت ہی سپر تھیں ان کہانیوں نے دل ہی جیت لیا۔ اس کے بعد شمارے میں چٹنی بھی شامل تھیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں لیکن نیم مراد صادق آباد زہد سورا نیم حسن نظامی شفیق احمد ندیم کی غزلوں نے بہت متاثر کیا ان کی غزلیں سب سے اچھی تھیں۔ آپ کی ڈائری پورے شمارے نے مزہ ہی دو بالا کر دیا آپ شاعری کا سلسلہ تیر نیم کش ہوا کرتا تھا وہ کدھر گیا کہاں کم ہو گیا اس کو ڈھونڈنے اس کو واپس لائیے۔ اب تک کے لیے اتنا ہی زندگی رہی تو آئندہ ماہ چھر ملاقات ہوگی۔ دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوٹی ترقی کرے آئیں۔

☆: خضر! اب سچی کہانیاں میں صرف وہ شاعری اور کہانیاں شائع ہوتی ہیں جو لوگ ارسال کرتے ہیں تیر نیم کش کی ڈاک برائے نام ہے۔ ناسٹل کے بغیر تو شمارہ چھپ ہی نہیں سکتا یہ تمہارے ہا کر کا کمال ہے کہ بنا ناسٹل والا رسالہ بھی چھپ سکا۔

☆: اور یہ دوسرا خط ارشد اقبال چوہان جڑاوالہ سے لکھتے ہیں۔ دعا گو ہوں کہ سچی کہانیاں سے منسلک سب لوگ بخیریت ہوں آئین سب سے پہلے ماہ جولائی کی سرگزشت کا خط لکھ کر ایک دوست کو دیا کیونکہ مجھے شہر سے باہر جانا تھا۔ مگر ایک برانا لطیفہ کہ اگر ریلوے اسٹیشن جارہے ہو تو میرا یہ خط پوسٹ کر دینا ہفتہ بعد ملاقات پر خط پوسٹ کرنے کے حوالے سے جواب دیا کہ اگر اتنی جلدی ہے تو یہ لو خود حوالہ ڈاک کر دو..... کیونکہ ریلوے اسٹیشن سے بھی ہر آدھا گھنٹہ بعد ڈاک روانہ کی جاتی تھی اور ٹینوں کے ساتھ ڈاک کا ڈبہ بھی ہوتا تھا اب ریلوے ہی سمندر برد ہو گیا ہے ڈاک کا ڈبہ کہاں سے آئے گا؟ اب دیکھیں تبدیلی کیا رنگ لائی ہے۔ بہر حال اس مہربان کا بھی شکر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ خط آپ کو ملا ضرور ہوگا مگر دیر سے..... آپ اسے خدا را پڑھ لیں۔ شکر ہے شمارہ جولائی تحصیل بعد میں پڑھا تھا اور خط ڈیل لائن سے پہلے ہی لکھ دیا تھا۔ جو کہ دوست کی غیر ذمہ داری کی نذر ہو گیا اور شمارہ اگست میں چک نہ پاسکا جولائی کے حوالے سے میں ہاتھ باندھ کر کرن شیر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمارے سچی کہانیاں کی جان چھوڑ دیں اور چوری شدہ کہانیاں چھپوانے سے باز آجائیں کاشی چوہان صاحب کے دور میں ان کی ایک کہانی 'موجہ سرگزشت' میں شائع ہو چکی تھی بعد ثبوت ایڈیٹر صاحب کو شکایت تحریر کی تھی۔ اور انہوں نے معذرت بھی کی مگر ایک طرح سے کرن شیر صاحب کا شکر گزار بھی ہوں کہ ان کی وجہ سے تحریری رابطہ شروع ہوا۔ جو بعد میں ناصر رضا

صاحب (مرحوم) کے اور اب اپنی بہن کے غلوں کی وجہ سے جاری ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ شمارہ جولائی میں بھی انہوں نے کسی اور کی کہانی اجالا کے ناسٹل سے اپنے نام سے شائع کر دئی ہے۔ اللہ واسطے یہ اخلاقی جرم بند کروں اپنا ذہن استعمال کریں۔ ام منال صاحبہ کی اگست میں شائع ہونے والی عشق حقیقی نے بہت متاثر کیا۔ عثمان غنی صاحب کی ملاقات محل سبق آموز ہے۔ مویذہ تول صاحبہ کی تقدیر گزیدہ غنی نسل کے لیے مشعل راہ ہے کہ ہمارے اجداد نے یہ ملک پاکستان کو کئی عزیز قربانیوں سے حاصل کیا ہے۔ اللہ کرے ہمارے علم انوں کو بھی احساس ہوا کہ وہ غنی نسل کو دو قومی نظریے سے آگاہی دیں کہ ہمیں آزادی کی قدروں کو ہم نہ مل سکتے ہیں کہ ہمارا جنم ایک آزاد ملک میں ہوا یہ اللہ کی رحمت بھی ہے اور نعمت بھی اس کے لیے ہمد و جہد کرنے والوں کے اللہ درجات بلند کرے اور ہمیں اپنے پاکستان سے محبت کرنے کی توفیق دے آئین جاوید راہی صاحب کی زندگی شرمندگی پہلے بھی کہیں شائع ہو چکی ہے۔ شاید ان کے نام سے ہی یا شاید انہوں نے بھی کرن شیر والی حرکت کی ہے۔ مگر ثبوت دینے سے قاصر ہوں۔ لیکن یہ بات اپنی یادداشت کے سہارے پورے ذوق سے لکھ رہا ہوں۔ اب اس کا جواب راہی صاحب ہی دے سکتے ہیں محمد قاسم خان بلوچ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے جلی پیروں کی نشاندہی کر کے کمزور عقیدوں والوں کی رہنمائی کی ہے۔ اللہ جاہل لوگوں کو عقل دے عامل کامل کا جواب نہیں۔ آخر میں سب کو سلام دعائیں۔

☆: ارشد بھائی! میں فخر ہوں کہ کرن شیر صاحبہ اپنا موقف بھی پیش کریں اس لیے اس بار بھی وہ فہرست میں موجود ہیں جواب نہیں دیں گی تو ان پر عائد الزام کو سچ سمجھا جائے گا۔ جاوید راہی صاحب ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ میں جانتی ہوں کچھ دنوں میں آپ کو نامعلوم نمبروں سے نامعلوم دگنی آتما میں بھیج کریں گی ان بے وقوفی کے بیانات کی پرواہ مت کیجیے گا ہمارے تمام خصوصی نمائندگان کو ایسے بھیج کیے جارہے ہیں۔ اتنے بہادر ہیں بھیج کرنے والے کہ بھیج کرتے ہی فون بند کر دیتے ہیں یا سم نکال دیتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ EMI نمبر سے پیسہ چل جاتا ہے کہ چور کون ہے خیر آپ جیسے پڑھے لکھے لوگوں کا ساتھ ہی سچی کہانیاں کو درکار ہے امید کرتی ہوں کہ یہ تعلق اب ہمیشہ رہے گا۔

☆: عثمان غنی پشاور سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم اما ہمتا سچی کہانیاں، امید ہے پورا ادارہ ٹھیک ٹاک ہوگا اور احسن طریقے سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہوگا۔ سچی کہانیاں ایک منفرد رسالہ ہے جس کے چاہنے والے دنیا کے کھونٹے کھونٹے میں موجود ہے۔ اور مجھے بھی یہ رسالہ دل کی گہرائیوں سے پسند ہے۔ سب سے پہلے تو پورے ادارے کو اور خاص کر سب سے بااخلاق خاتون منزہ سہام صاحبہ کو دل کی گہرائیوں سے عیدالضحیٰ کی خوشیوں کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور پھر سارے لکھاری بہن بھائیوں کو اس کے بعد پیارے قارئین کو سچی کہانیاں ماہ اگست کا شمارہ بہت دیر سے ملا۔ مگر شکر ہے کہ مل گیا۔ ناسٹل پر ایک خوبصورت سی لڑکی موجود تھی۔ میری طرف سے پیارے رسالے کے لیے ایک شعر

رسالوں میں سب سے پیارا ہے سچی کہانیاں  
جس کی کور پر ہوتی ہے پیاری سی مہارائیاں

ارے میں بتا دوں کہ میرا اپنا بالکل نیا شعر ہے۔ مگر ایڈیٹر صاحبہ ہمارے ملک میں صرف خوب صورت لڑکیاں نہیں ہے بہت خوبصورت اور دلشین لڑکی بھی اس ملک میں موجود ہیں۔ ان پر بھی نظر کرم کیجیے گا جیسے عمران عباس، نواد خان، شاز خان وغیرہ ان کے فوٹو بھی کور پر چاپ دیجیے گا۔ ویسے بھی ملک میں تبدیلی کی لہر چلی ہے، آپ بھی کسی تبدیلی کو اپنے ادارے کا حصہ بنا لیجیے گا۔ سب سے پہلے میں یہ بتا دوں درز کو میری طرف



## پراسرار نمبر

اس بار پُر اسرار نمبر رات کی تنہائی میں مت پڑھیے گا  
☆ سچی کہانیاں کا شمارہ نومبر 2018 پُر اسرار کہانی نمبر ہوگا۔  
اس یادگار نمبر میں نامور لکھاریوں کی ایسی کہانیاں شامل ہوں  
گی جنہیں آپ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کر سکیں گے۔  
جنتی کہانیاں، ارواح کہانیاں، شیطان اور آسیب پر لکھی  
ہیبت ناک سچی کہانیاں، دہشت سے بھری ڈراؤنی کہانیاں  
ہی اس نمبر کا حصہ نہیں ہوں گی بلکہ نیک روحوں اور مسلم  
جنت کی دوستیوں کے قصے بھی شائع کیے جائیں گے۔  
☆ لکھاریوں سے درخواست ہے کہ 25 ستمبر تک اپنی  
کہانیاں ارسال کر دیں۔

ایجنٹ حضرات سے درخواست ہے کہ برائے کرم اپنے  
آرڈرز سے ادارہ سرکولیشن کو فوری طور پر آگاہ کریں۔

سے بہت بہت مبارک ہوں، آپ آگے بھی اسی طرح سے محنت کرتے رہے گا۔ انشاء اللہ آگے بھی آپ کو  
انعام سے نوازا جائے گا۔ جو تئوں میں دال پڑھ کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے۔ ایک طرف چودہ اگست کی  
خوشیوں کو دل ہی نہ کیا۔ کہ منائے تو کیسے منائے؟ ہم نے ان سب کے لیے خدا سے دعا کی، کہ اللہ ان کی  
معفرت نصیب فرمائے اللہ! مگر پتہ نہیں یہ بڑا سا بچہ کس کم بخت نے ایجاد کیا ہوگا، ہم جہاں کہیں بھی  
گئے، اس شخص کا آواز نے کانوں کے پردے تقریباً بھاڑ ہی دیے۔ مگر چلو پھر بھی خیر رہی، لوگوں نے جوش  
و خروش سے چودہ اگست کی خوشیاں منائی۔ پھر بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں  
ہوا۔ پرنس افضل کا شاہین کا خط بہت پیارا تھا۔ اس لیے تو بادشاہی کی کرسی ان کو سوچی گئی تھی۔ امان اس بار  
شمارے میں کوئی بھی غلطی نہیں ہوگی۔ احوال میں بہت سے نئے دوستوں سے ملاقات ہوئی، بہت اچھا لگا۔ اور  
ایڈیٹر صاحبہ کے جولیات دل سے پسند آئے۔ ملازم حسین شیرازی آپ کا بہت طویل تبصرہ تھا۔ مگر بہت پسند  
آیا۔ اور دوبار پڑھا۔ ٹیکس، میرا رشتہ سچی کہانیاں سے پچھلے مدیر کے دور میں بڑا چکا تھا۔ اس نے میری چھوٹی  
کہانیاں بھی شائع کی تھی۔ پھر کسی وجہ سے ہمارا یہ رشتہ وقتی طور پر ٹوٹ گیا۔ مگر ٹیکس ٹو اللہ کہ منہ وہاں صاحبہ  
نے اپنے اچھے اخلاق سے پھر سے یہ رشتہ جوڑ لیا۔ اس بار اگست کے شمارے میں میری کہانی رکافات شائع  
ہوئی۔ مگر سوری اور بہت پشیمانی سے بتا رہا ہوں کہ دراصل یہ کسی اور میگزین میں بھی شائع ہوئی۔ اصل میں  
کہانی ان کو کافی پہلے بھیج رہی تھی۔ مگر وہاں نہ لگ سکی تھی۔ تو یہاں بھیجوا دی۔ جہاں باوقار اور بہت پیاری سی  
ہماری ایڈیٹر صاحبہ نے اپنا پان دکھا کر شائع کر دی۔ مگر مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں تکبر نہ کر سکا۔ یہ اسی ماہ کہیں  
اور بھی لگ رہی ہیں۔ خیر انسانوں سے ہی خطا ہوتی ہے۔ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہیں ہوگی۔ پہلی کہانی غلام جو  
بے سردار بہت دل سے لکھی تھی میری پسند آئی۔ میری کہانی کے لیے آپ سب بتائیں گے ممتاز  
آحمد کی دوسرے کی بیوی اچھی لگی۔ زندگی شرمندگی جرم اور سزا کی اچھی تحریر تھی۔ جاوید راہی کی کہانیاں جرم کے  
اور گرد گھومتی ہے۔ سورشاہد سے ملاقات اچھی لگی۔ مجھے کا طوق بھی بلاشبہ ایک بہتر کہانی تھی۔ اس ماہ کا شاعر عمر  
تنہا سے بہت کچھ سیکھا۔ برا انجام نے بھی متاثر کیا۔ اللہ پوچھے گا بہت پیاری کہانی تھی۔ اور آپ کو اتنی اچھی  
کہانی لکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ تاریخ کے جھروکے بہت پسند آیا، امان اس ایک بہترین سلسلہ دار تحریر  
ہے۔ اور ترکی میں عباسی نے تو مانو دل ہی خوش کر دیا۔ خطوط میں عمران قریشی کا خط دیکھ کر دلی خوشی  
ہوئی، مارے عمران قریشی صاحب میں کو آپ سچی کہانیاں میں دیکھ کر تا ہوں۔ آپ نے تو جہاں بھی لکھا، وہاں  
کامیابی کے جھنڈے گاڑ دے۔ سارے سلسلے بہت اچھے ہیں۔ آپ کی ڈائری، شعر و سخن، مسئلہ یہ ہے، صفت  
فرعون دوسری ہی قسط میں ختم ہوئی، بہت اچھی تحریر تھی۔ جبکہ شہید مظہر کی سنوئی کو لڈنیر یقیناً اچھی ہوگی۔ میری  
نئی کہانی ناقابل یقین آپ کے پاس محفوظ ہے۔ مہربانی فرما کر جلد شائع کیجیے۔ تاکہ جلد ہی کہانی ارسال  
خدمت کر سکوں۔ باقی سب دوستوں کی تحریریں بھی بہت اچھی تھیں۔ ڈاکٹر عامر شہزاد کی کہانی بھی خوب رہی۔  
جناب ذبیح عثمان! اچھا ہوا کہ آپ نے وضاحت دی ورنہ میرے اصول بہت سخت ہیں۔ موقع سب کو  
دیتی ہوں مگر سچی کہانیاں کے صفحات پر صرف وہی لوگ مستقل نظر آئیں گے جو ہر قسم کی بے ایمانی سے دور  
رہیں گے تمہاری دوسری تحریر مل گئی ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔

اس آخری خط کے ساتھ اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے اور سچی کہانیاں سے  
متعلق کوئی بھی بات ہو بلا جھجک مجھ سے کہیں۔ میں منتظر رہوں گی۔  
دعاؤں کی طالب  
منزہ سہام



حضرت صہیب رومیؒ

ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ

## غلام جوبنے سردار

ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ

غزاله عزیز

ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ ଓଡ଼ିଆ

سیدنا حضرت صہیبؓ بن شان کا شمار حضرت بلال حبشیؓ، حضرت عمارؓ اور خباب بن ارتؓ جیسے عظیم المرتبت، اولوالعزم اور صبر و استقامت کے پیکروں کی صف میں ہوتا ہے۔

حضرت صہیبؓ عراق کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپؓ کے والد شان بن مالک شاہ ایران کی طرف سے اہلہ کے حاکم تھے۔ صہیبؓ ابھی کم سن تھے کہ اہل روم نے اہلہ پر حملہ کر دیا اور مال و اسباب کی لوٹ مار کے ساتھ ساتھ حضرت صہیبؓ کو بھی غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔

انہوں نے بچپن سے جوانی کا زمانہ روم میں غلام کی حیثیت سے گزرا۔ اسی لیے وہ رومی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ایک دفعہ عربوں کے ایک قبیلہ بنو کلب کے کچھ تاجروم کے اس علاقے میں گئے جہاں صہیب غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان تاجروں نے ان کو خریدا اور اپنے ساتھ مکہ آئے۔ یہاں عبداللہ بن جدعان کلبی نے

تاجروں سے انہیں خرید لیا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق ابن سعد کا بیان ہے کہ صہیبؓ فرار ہو کر مکہ پہنچے اور عبد اللہ بن جدعان سے حلیفانہ تعلق قائم کر لیا۔ حضرت صہیبؓ ایک ہنرمند اور سختی آدمی تھے لہذا مکہ میں قیام کے کچھ عرصے کے اندر انہوں نے اتنا روپیہ کمایا کہ مکہ کے صاحب ثروت لوگوں میں شمار ہونے لگے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اکرم ﷺ نے حق کی دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ حضرت صہیبؓ کے کانوں تک جب رسول اکرم ﷺ کی دعوت پہنچی تو وہ ایک دن حضرت ابراہیمؑ کے مکان پر حاضر ہوئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر رسول اکرم ﷺ کی رسالت کی گواہی دی۔ رسول اکرم ﷺ ان کے اسلام لانے سے بہت خوش ہوئے تھے اور فرمایا۔

”صہیب روم کا پہلا پھل ہے۔“  
حضرت صہیبؓ جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو شخص تیس آدمی حق کی گواہی دینے والے

تھے چنانچہ حضرت مصیبؑ نے سابقوں الاولوں کی جماعت میں شمولیت پائی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلام کا اظہار اپنے لیے ہر قسم کے مصائب کا دروازہ کھولنے کے مترادف تھا۔ سارے اہل مکہ متحد ہو کر مسلمانوں کو مظلوم اور اذیتوں کے ذریعے اس نئے دین سے پھیر لے جانے کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔

لیکن حضرت صہیبؓ کا ذوق ایمانی انہیں اپنے دین کو بخفی رکھنے پر راضی نہ رکھ سکا۔ وہ غریب الوطن تھے۔ رشتہ داروں اور قرابت داروں سے دور تھے۔ قبیلہ کی حمایت سے محروم تھے۔ اہل مکہ کے مظالم سے بچنے کے لیے کسی قسم کی ڈھال موجود نہ تھی چنانچہ ایمان کے اظہار کے ساتھ ہی آپؐ پر ہجرم کے مظالم کا آغاز ہو گیا۔

بھی گرم زیت پر لٹائے گئے، کبھی پانی میں غوطے دیے گئے اور کبھی مار مار کر لہولہان کر دیا گیا۔ ظلم کا ہر حربہ آزمایا گیا لیکن ہر حربہ حضرت مسیحؑ کے عزم کے آگے ہار گیا۔ ظلم کی کچلی میں پستے ہوئے انہیں ایک لمحہ بھی حق چھوڑنے کا خیال نہ آیا۔

یوں مظالم بہتے بہتے ایک عرصہ گزر گیا یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ نے ہجرت مدینہ کی اجازت دے دی۔ صحابہ کی اکثریت ہجرت نبوی سے کچھ عرصہ پہلے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تھے لیکن حضرت صہیبؓ مکہ میں مقیم رہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ رسول اکرم ﷺ کی معیت میں ہجرت کا شرف حاصل کریں گے۔

لیکن حالات و واقعات موزوں نہ تھے اور  
 آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور  
 آپ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنالیا  
 آپ کو حضرت ابو بکر صدیق کی معیت

میں خفیہ رہ کر ہجرت کرنی پڑی لہذا حضرت صہیبؓ  
 یہ تبرک سفر آئے علیہ السلام کے ساتھ نہ کر سکے۔

حضرت صہیبؓ کو جب آپ ﷺ کی ہجرت کے بارے میں پتہ چلا تو ان کے لیے ایک دن بھی مکہ میں گزارنا مشکل ہو گیا اور انہوں نے مدینہ کا ارادہ کیا۔

مشرکین مکہ کو جب پتہ چلا تو وہ طیش میں آ گئے۔ پہلے ہی وہ مسلمانوں اور بعد میں رسول اکرم ﷺ کی مدینہ ہجرت کے باعث غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔

حضرت صہیبؓ نے بے خوفی سے کہا۔  
 ”اے اہل مکہ! تم خوب جانتے ہو کہ میرے  
 تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا خدا کی قسم! تم میرے  
 قریب نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ میں اپنے ترکش  
 کے تمام تیر تیر پر ختم نہ کر لوں اور اگر پھر بھی تم میں  
 سے کوئی بچ گیا تو پھر میں تلوار نکال لوں گا اور  
 جب تک میری جان میں جان ہے تم سے لڑوں  
 گا۔ اگر تم سلامتی چاہتے ہو تو میرا پیچھا چھوڑ دو اور  
 اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔  
 مشرکین نے اُن کو پھرا ہوا دیکھا تو بینتر ابدا  
 ور کہا۔

کچھ بیمار ہو گئے تھے اور ایک آنکھ دکھنے آئی ہوئی تھی۔

جب آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو بھوک سے بے حال تھے رسول اکرم ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ بھجوریں کھا رہے تھے۔

حضرت صہیبؓ نے سرور عالم ﷺ اور دوسرے اصحاب کو سلام کیا اور پھر بغیر کچھ کبے سے بھجوروں کے شغل میں شریک ہو گئے۔

بھوک کی وجہ سے کھانے کی رفتار تیز تھی۔ حضرت عمرؓ بھی اس وقت موجود تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر رسول اکرم ﷺ سے کہا۔

”یا رسول اللہ ﷺ! ملاحظہ فرمائیے ان کی آنکھیں دکھ رہی ہیں اور کس شوق سے بھجوروں پر کھجوریں کھا رہے ہیں۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے کمال شفقت سے صہیبؓ کو مخاطب کیا۔

”سبحان اللہ! تمہاری آنکھیں آئی ہوئی ہیں اور تم بھجوریں کھا رہے ہو۔“

انہوں نے عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ میں اُس آنکھ کی طرف سے کھار ہا ہوں جو اچھی ہے۔“ اُن کا یہ جواب سن کر آپ ﷺ اس قدر ہنسے کہ دندان مبارک کا نور ظاہر ہونے لگا۔ بھجوروں سے فارغ ہو کر وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا۔

”واہ جناب! آپ خود تو رسول اکرمؐ کے ساتھ آ گئے اور مجھے ساتھ نہ لیا۔“ پھر صہیبؓ نے حضور اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا۔

”یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ نے بھی عاجز کا خیال نہ فرمایا۔ میں

مکہ میں تمہارہ گیا اور قریش سے بڑی مشکل سے جان چھڑائی اور آپ تک پہنچا۔“ حضور اکرم ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”ابو یحییٰ! تم نے بڑی نفع بخش تجارت کی۔“ مدینہ میں آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان سواغات کرائی تو آپؐ کا سواغاتی رشتہ جلیل القدر صحابی حضرت ابوسعید حارثؓ بن صہبہ بخاری خراجی سے قائم کیا۔

مدینہ پہنچ کر جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپؐ نے تمام معرکوں میں حضور اکرم ﷺ کی ہمرکابی میں شرکت کی آپؐ کو خاص طور سے تیر اندازی اور شمشیر زنی میں عبور حاصل تھا۔ آپؐ نے ہر معرکہ میں اپنی مہارت کے جوہر دکھائے۔

اگر آپؐ کا سامنا کسی ایسے دشمن سے ہوتا جو مکمل طور پر زرہ پوش ہوتا تو تاک کے نیزہ اس کی آنکھ میں مارتے کہ وہ الٹ کر جا گرتا۔

حضور اکرم ﷺ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت صہیبؓ کے بارے میں فرمایا۔

صہیبؓ اللہ کے اچھے بندے ہیں اگر وہ اللہ کا خوف نہ کرتے تب بھی اس کی معصیت نہ کرتے۔

حضور اکرم ﷺ حضرت صہیبؓ اور دوسرے ایسے ہی الولوالعزم بزرگوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت صہیبؓ حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت بلالؓ کہیں اکٹھے بیٹھے تھے۔ ادھر سے ابوسفیانؓ (قبول اسلام سے پہلے) گزرے بتیوں نے انہیں دیکھ کر کہا۔

”اللہ کی تلوار نے ابھی تک دشمن خدا کا سر قلم نہیں کیا۔“

حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی کہیں قریب ہی تھے فرمایا۔

”یہ شخص قریش کا سردار ہے۔ اس کے لیے ایسے سخت الفاظ منہ سے نہ نکالو۔“ اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کیا حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

”تمہارے ٹوکنے سے شاید یہ لوگ برا مان گئے ہوں گے ان کو ناراض کرنا گویا خدا کو ناراض کرنا ہے۔“

حضرت ابو بکر صدیقؓ رسول اکرم ﷺ کی زبان سے یہ ارشاد سن کر خوف کے مارے لرز گئے۔ اسی وقت لوٹ کر ان بزرگوں کے پاس آئے اور کہا۔

”پیارے بھائیو! میری بات سے تم ناراض تو نہیں ہوئے؟“ انہوں نے کہا۔

”نہیں اے ابو بکر! ہمارے دل میں تمہارے خلاف کوئی ملال نہیں اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔“

رسول اللہ ﷺ حضرت صہیبؓ پر اس قدر مہربان تھے کہ آپ ﷺ نے ان کی کنیت ابو یحییٰؓ جو بزرگ فرمائی۔ حالانکہ حضرت صہیبؓ کا یحییٰ نام کا لڑکا نہ تھا۔

مدینہ میں حضرت صہیبؓ نے رسول اللہ ﷺ کی صحبتوں سے خوب فیض اٹھایا لیکن اپنی تامل طبیعت کے باعث روایت کی تعداد بہت کم ہے۔

آپؐ کے علم و فضل، صبر و استقلال اور شجاعت اور اہمیت کے باعث آپؐ کا شمار اکابر صحابہؓ میں ہوتا تھا اور ان سونے پر سہاگہ رسول اکرم ﷺ کی تھی۔

حضرت عمرؓ کے دور میں جب حضرت صہیبؓ ملاقات کے لیے آتے تو حضرت عمرؓ سارا کام چھوڑ کر پہلے ان سے ملتے تھے۔ ایک دفعہ ابوسفیانؓ سہیل بن عمروؓ اور دوسرے سرداران قریش حضرت عمر فاروقؓ سے ملنے آئے۔ اتفاق سے اسی وقت حضرت صہیبؓ حضرت بلالؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ بھی ملاقات کے لیے پہنچے۔

حضرت عمرؓ نے ملاقات کے لیے آنے والوں کے نام دریافت کیے۔

جب نام بتائے گئے تو انہوں نے حضرت صہیبؓ حضرت بلالؓ اور حضرت عمارؓ کو ملاقات کے لیے پہلے بلایا۔

حضرت ابوسفیانؓ سے ضبط نہ ہو سکا کہنے لگے۔ ”عجیب بات ہے کہ ان غلاموں کو تو فوراً ملاقات کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ہم انتظار کرتے رہتے ہیں۔“

حضرت سہیل بن عمروؓ فوراً بولے۔

”بھائی! اس کے لیے تو ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔ دعوت تو حید تو ہم سب کو ایک ہی وقت میں ملی تھی لیکن یہ لوگ اس کو قبول کرنے میں آگے بڑھ گئے اور ہم منہ نہ تکتے رہ گئے۔ اس لیے اگر امیر المؤمنین انہیں ہم سب پر سبقت دیتے ہیں تو کیا غلط کرتے ہیں؟“

حضرت عمر فاروقؓ حضرت صہیبؓ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک دن حضرت صہیبؓ ملنے آئے تو فرمایا۔

”صہیبؓ! تم مجھے بہت محبوب ہو لیکن تمہاری تین باتیں شکلاتی ہیں ایک یہ کہ زبان پر بھی لہجہ غالب ہے حالانکہ تم عربی ہونے کا دعویٰ کرتے ہو دوسرے تم اپنا مال بڑی بے دردی سے خرچ کرتے ہو اور تیسرے تم نے اپنی کنیت ایک پیغمبر

## اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا

کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو

ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ

سی کوشش۔

بہت جلد.....

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے

روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

پس منظر انتظار.....

## شکر گزار

ایک نوجوان نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ ”اللہ تعالیٰ اپنے نافرمان بندوں سے اپنی نعمتیں چھین لیتا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے سب کے پاس پہننے اور ہننے کھانے پینے کے لیے سب کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ تو کسی سے کچھ بھی نہیں چھینتا۔“

بزرگ مسکرائے اور پوچھا: ”تمہاری نماز میں خشوع و خضوع ہے؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

”کیا قرآن کی تلاوت کرتے وقت لذت محسوس ہوتی ہے؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

”کیا پانچ وقت کی نماز دل سے پڑھتے ہو؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

”کیا نیکی کرنے کی طرف دھیان جاتا ہے؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

”کیا زبان اللہ کے ذکر کی عادی ہے؟“

نوجوان بولا۔ ”نہیں۔“

تب بزرگ نے جواب دیا۔

”یہی اللہ کی وہ نعمتیں ہیں جنہیں وہ نافرمانوں سے چھین لیتا ہے۔“

کامعہ اقبال۔ حیدر آباد

کے نام پر رکھی ہے حالانکہ اس نام کا تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔“

یہ سن کر حضرت صہیبؓ نے جواب دیا۔

”امیر المومنین! میں واقعی عربی ہوں بچپن میں رومی پکڑ کر لے گئے تھے اور میں نے ان ہی

میں پرورش پائی ہے اس لیے میرے لب و لہجہ پر

عجمی رنگ غالب ہے۔ اس میں میرا قصور نہیں۔“

”دوسری بات اسراف کی تو اصل بات یہ

ہے کہ میں اسراف نہیں کرتا بلکہ رسول اکرم ﷺ

کے اس فرمان پر عمل کرتا ہوں کہ تم میں سے

بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور

سلام کا جواب دے جہاں تک کنیت کا معاملہ ہے تو

یہ میں نے خود نہیں اختیار کی بلکہ رسول اکرم ﷺ!

☆☆.....☆☆





سے ضرور کلک کرے گی دعا ہے کہ۔ اللہ کرے  
زور قلم اور زیادہ۔

☆☆☆☆



تنویر کو جذبول کا اظہار کرنا آتا ہے لوگ بہت  
ہم ہم کر سوج سمجھ کر سچا سنوار کے مضامین تحریر کر  
تے ہیں لیکن ان کے ہاں یہ سہم نہیں ہے ان کا ہر پیرا  
کراف بڑا بے ساختہ ہے جو کہ دل پر اثر کرتا ہے، اُن  
نہوں نے معاشرے میں بسنے والوں کی سچ ادا بیوں  
کو بھی بے نقاب کیا ہے جن کے سخت رویوں سے وہ  
دل برداشت بھی ہو پیش لیکن پھر اپنی نیک فطرت کے  
ہم اُس کو فراموش کر دیا۔ اُنہوں نے اس کتاب  
میں اپنی زندگی کو بہت خوبصورتی اور بہترین انداز  
میں اُجاگر کیا ہے کہیں بہت انکساری ہے اپنی ذات  
کے بارے میں اور کہیں وہ کہتی ہیں کہ ہم تو ہیں ہی  
بہت پیارے، لوگوں کی آنکھیں خراب ہیں جو اُنہیں  
ہم حسین نظر نہیں آتے ہیں

مجھے لگتا ہے کہ تنویر کا یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا  
ہے اور ان کی یہ کتاب اپنے اسلوب کی ندرت اور  
جذبات کی شدت اور اظہار و بیان کی دلکشی کی وجہ



## آج کی مصنفہ

تنویر روف

## تنویر روف

تلفظہ شفیق

تنویر روف کی بے حد عوامی شخصیت ہیں سادہ و پُرکار

نہیں ہے اپنی زندگی کے حقیقی واقعات سادے انداز  
میں بیان کئے ہیں لیکن ان میں اتنی کشش ہے کہ پڑ



ہنے والے کا دل کتاب شروع کرنے کے بعد اُسے  
مکمل پڑھے بغیر چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا ہے

جب بات کرتی ہیں تو محبتوں کا سمندر ان کے لہجے  
میں موجیں لے رہا ہوتا ہے، مجھ سے ایک مشاعرے  
میں ایسی ملاقات ہوئی کی ہم تو ان کی زلف گرہ گیر  
کے اسیر ہو گئے، بہترین زبان دان۔ کئی زبانوں پر اُ  
نہیں عبور حاصل ہے بے شمار اردو شاعری انگریزی ز  
بان میں ترجمہ کرتی ہیں جس میں اس خاکسار کی بھی  
کئی غزلیں شامل ہیں

تنویر روف کی سوانح عمری۔ زندگی خوبصورت  
ہے۔ دنیائے ادب میں ایک لطیف اور مہکتا ہوا جھونکا  
ہے، بالکل سادہ زبان میں باتیں کہیں ہیں جو کہ دل  
میں اُتری جاتی ہیں کہیں بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے  
اور کہیں حیرانی سے منہ کھل جاتا ہے اور بے حد خوش  
قسمت کہ میکے والے یعنی ماں باپ بھائی بھانج  
بھتیجے جانشین۔ سدھیانے والے ان پر قدا، دوست احبا  
ب بھی بھی اُنکے چھوڑنے پر راضی نہیں کہ میرے آ  
دھے کھنڈے اُن کے گھر بیٹھے میں کئی فون آئے تھے جو اُ  
ن کی ہر لمبیز کی کا شوت ہے۔ یہ کوئی روایتی کتاب

اوکاڑہ سے بھیجی گئی انتہائی ہولناک داستان



## یہ حقیقت تھی

وہ اُس حسینہ کے حسن پر فریفتہ تھا اور اس کی

سنگت ہر دن عید اور ہر رات شب رات کی مانند تھی.....

جاوید راہی

پابندی اور نیشن نہیں تھی۔ ایک روز خان صاحب

نے مجھے پڑھتے دیکھ کر مجھے مخاطب کیا کہ تم کیا پڑھتے رہتے ہو۔

میرے بتانے پر وہ بہت خوش ہوا اور مجھے مزدوری کی مد میں پلازہ کی نگرانی پر مامور کر دیا اور پلازہ میں ہی رہنے کی اجازت دے دی۔ پہلے میں اسٹیشن کے باہر تیس روپے رات بھر کے لیے چار پائی بستر کرایہ پر لے کر سوتا تھا۔

اب پلازہ کی چھت پر سینٹ کے خالی تھیلے جو وہاں وافر مقدار میں موجود تھے نیچے بچھا کر اوپر لٹے سے لایا پرانا گدا جو دو سو روپے میں خریدا تھا ڈال کر رات کو سو جاتا کھانے کا بندوبست سڑک پار کھڑے کئی ٹھیلوں پر کچھ نا کچھ مل جاتا پرائے تو تمام رات ہی چلتے رہتے تھے۔ ایک پرائے اور چائے کا کپ لے کر پیٹ کا دوزخ بھرتا اور پھر چھت پر آ کر بلب کی روشنی میں دیر تک پڑھتا رہتا۔

پلازہ کی دوسری طرف ایک بہت بڑا خالی

میرا تعلق ایسے گھرانے سے ہے جہاں دو وقت کی روٹی کے لیے سارے گھر کے لوگوں کی مشقت کرنا لازمی قرار دیا جاتا انتہائی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میں نے گرتے پڑتے ایف ایس سی مکمل کی اور مزید تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کر لیا یہاں پہنچ کر میں نے گھر سے لائے تھوڑے بہت روپے پھونک پھونک کر خرچ کرنے کا عہد کر لیا۔

کئی ایک پرائیویٹ ٹیوشن سنٹر پرائیویٹ کالجز اور ایسے ہی اداروں کا جائزہ لیا آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ صبح کام دھندہ اور نائٹ کلاسز میں گریجویشن کی تیاری۔

جس بلڈنگ میں مزدوری کر رہا تھا وہاں پر مسٹری کے ساتھ ایک مزدور تھا جس کے ساتھ میری ڈیوٹی گئی وہ پانچ وقت کا نمازی تھا جب وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا تو میں اپنی کوئی بک نکال کر ریڈ کرنے بیٹھ جاتا پلازہ کا مالک بھی نمازی اور پرہیزگار تھا اس لیے نماز پڑھنے والوں کو کوئی

# مرحباً

# عرق گلاب



دیی گلاب کا خالص عرق  
قدرتی خوبیوں کا بے مثال تحفہ



صبح نیچے آتے رات کو ساتھ لائی کتاب لانا  
روٹین میں شامل ہو گیا تھا۔ بیڑھیاں عبور کر کے  
اوپر چھت پر آیا اور گدے میں لیٹی کتاب اٹھا کر  
سیدھا ہوا تو غیر ارادی طور پر میری نظر پیچھے والے  
پلاٹ پر گئی تو میری نظروں کے سامنے اس  
کھنڈرات نما چھوٹی عمارت میں زندگی کے آثار  
دکھائی دیے۔

کوئی خاتون تھی جو میری طرف پیٹھ کئے شاید  
گود میں بچہ لیے بیٹھی تھی۔ میں سرسری نظر ڈال کر  
نیچے جانے کے لیے بیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔  
رات کو میں نے اوپر آ کر خالی پلاٹ کی طرف  
دیکھا تو کمرے میں صرف مدھم سی روشنی کا احساس  
ہوا مگر اندر زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

پلاٹ پر تھا جس کے چاروں طرف اونچی دیوار  
اور سامنے کی طرف بڑا سا گیٹ تھا۔ پلاٹ کے  
اندراختہائی کوٹنے میں چھوٹا سا کھنڈرات نما کمرہ  
اُس پاس خود رو جھاڑیاں اور کئی ایک بڑے  
درخت تھے۔ چھت پر سے اس خالی پلاٹ  
کا سارا نقشہ صاف دکھائی پڑتا تھا۔

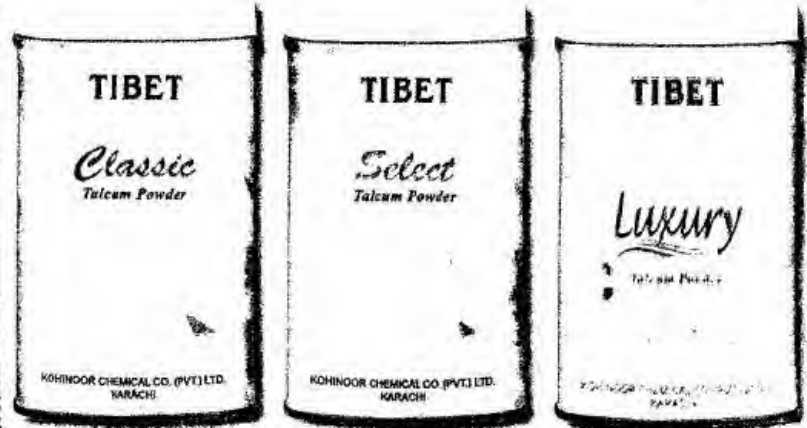
کمرے میں اگر کوئی رہتا بھی تھا تو اس کے  
نوک کا کوئی علم نہ ہونے کے برابر ہی تھا بس مدھم  
دی روشنی نظر آتی جو رات کو ہی دکھائی پڑتی سارا  
دن نیچے کام پر ہی ہونے کی وجہ سے دن بھر اس  
طرف دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی کبھی۔ دوپہر  
کو کھانے کی چھٹی یا ریسٹ سمجھ لیں اس دوران  
میں اسٹڈی کر لیا کرتا تھا۔



# تبت

## ٹالکس پاورڈر

اب نئی خوشبوؤں میں دستیاب



کلاسیک

سلیکٹ

لکڑی

تبت ٹالکس پاورڈر - خوشبوؤں میں دستیاب





میں بلب روشن کر کے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ پتہ نہیں کب نیند آگئی اور میں سو گیا۔ کھلے آسمان کے نیچے تاروں کی چھاؤں میں سونے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے ماحول کی سحر انگیزی میں ڈوبا تاریک رات کا منظر چاروں جانب خاموشی کا عالم اور سات منزلہ پلازہ کے کی چھت پر پڑا میں تن تھا۔

گھر سے دور تنگدستی سے اکتا کر لاہور چلا آیا پڑھائی جاری رکھنے اور گھروالوں کی ہیلپ یہ میرا خواب اور شوق تھا۔

پتہ نہیں میں سو رہا تھا یا غنودگی میں تھا کوئی انسانی وجود چھت پر ادھر ادھر حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا ساتھ میں آگے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے پھر وہ چھت پر سے یوں پیچھے کی طرف چلتے دوسری طرف چلے گئے جیسے پلازہ کے ساتھ کوئی دوسری چھت بھی ہو۔ میری یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے ذہن میں وہ سارا منظر بدستور جگمگا رہا تھا۔

میں نے نیچے خالی پلاٹ کی طرف دیکھا وہاں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر یونہی گم صم بیٹھا رہا ہر سب کچھ ذہن سے جھٹک کر دوبارہ گدے پر دراز ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگا پتہ نہیں کب نیند نے دبوچ لیا۔ صبح بھجھوڑ کر چگانے والا پلازہ کا پیشی تھا۔

سورج سر پر اٹھ آیا تھا اور میں ابھی سو رہا تھا۔ جلدی جلدی میں نے بستر اکٹھا کیا اپنی کتاب سنبھالی اور نیچے کی طرف بھاگا۔ غلت کے باعث نیچے خالی پلاٹ کی طرف بھی نہ دیکھ پایا حالانکہ اُنھتے ہی میری نظر ادھر جاتی تھی۔ دوپہر تک میں اپنے کاموں میں اُٹھ رہا جب کھانے وقفہ ہوا تو

غیر ارادی طور پر سڑھیاں عبور کرتا ہوا اور چھت پر آگیا اپنا بستر سیدھا کیا اور بیٹھ کر کتاب کھول لی مگر میرا دھیان نیچے پلاٹ کی طرف تھا درختوں کی طرف سے کوئی ٹپک بھینکتے نکلا اور بوسیدہ سے کمرے کے اندر گم ہو گیا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ میں چھت پر سے ادھر ہی متوجہ ہوں۔

مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں کوئی فیملی رہتی ہے۔ اس گھر میں رہنے والی لڑکی یا خاتون کو میں نے ایک دو بار جائزہ لینے والی نظروں سے دیکھا تھا اس کے جسم کی ساخت سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ جسمانی طور پر دلکش نقوش رکھنے والی تھی۔

میں جتنی دیر تک وہاں بیٹھا رہا کوئی بھی خاص بات سامنے نہ آئی اور میں دوبارہ چھت سے نیچے اتر گیا۔

دو دن گزار کر میں گھر سے واپس ڈیوٹی پر آیا تو سب سے پہلے میرے قدم ادھر پر چھت کی طرف اٹھ گئے اچھی طرح سے نیچے پلاٹ کا جائزہ لیا کوئی بھی حرکت اور نہ ہی ذی روح کا نام و نشان دکھائی دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس بوسیدہ سے گھر میں رہنے والی فیملی کے بارے میں کیوں دلچسپی لے رہا ہوں حالانکہ مجھے ایسے معاملات میں توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر میں کیوں اس بارے پریشان تھا۔

اس سلسلہ میں دو تین بار میرے ذہن میں آیا کہ کسی سے پوچھوں کہ ادھر کون رہائش پذیر ہے پر میری ہمت نہ ہوئی کچھ پوچھنے کی کیونکہ میرے بارے میں یہاں سب لوگوں کے بہت اچھے خیالات تھے اور میں کوئی ایسا ایسا نہیں اٹھانا چاہتا تھا کہ مالکان پلازہ میرا چھت پر جانا بند نہ کر دیں

وفا میں نے ذہن میں آئے خیالات کو سب دیا اور یونہی تاک جھانک پر اکتفا کر لیا۔

کمروں کا پلستر روک کر مالکان پلازہ بنے برس شید بنانے کا فیصلہ کرتے اضافی راج اور مزہور فارغ کر دیئے اور یوں میرے پاس لانے نام ہی کام رہ گیا۔ شید ڈالنے کے لیے آٹک اور سر یا باندھنے کا ہی کام ہو رہا تھا میں جب جی چاہتا باہر نکل جاتا اور منتر گشت کر کے پلازہ لوٹ آتا۔

آج بھی میں کھانا کھانے نکلا تو میرے قدم پلازہ کے پیچھے والے حصہ کی طرف اٹھ گئے کافی اونچائی سے نیچے کا منظر دکھائی تو پڑتا تھا مگر قدرے دھندلا سا۔ جب میں اس خالی پلاٹ کی اونچی دیواروں اور بند گیٹ کے سامنے آن کھڑا ہوا تو گیٹ کے رنگ آلود تالے کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ یہاں مکین سائیڈ والے چھوٹے گیٹ کو بھی آنے جانے کے لیے استعمال کرتے ہوئے آگے ہیں کوئی اندازہ ہی لگا رہا تھا کہ اچانک سائیڈ والا پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تو میں فوراً گیٹ بند کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ کھلنے والے حصہ کے دوسری طرف ایک خوبصورت دھنک ہوا پتھر مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں نہ ادھر ادھر دیکھا اور مڑ کر گیٹ کے چھوٹے اندازے کے آگے آکھڑا ہوا۔ جی میں نے کہاں پہنچ کر رہا ہوں۔

اندرا آجائیں گھر میں کوئی نہیں؟  
ہاں نے بیزت زدہ ہوتے پوچھا۔  
نہیں نہ امیاں اور میرا بچہ بھی ہے اس نے  
امیوں سے میری حیرت کو بھانپتے

”تو آپ کا میاں نظر نہیں آتا۔“ میں نے بے خیالی سے پوچھا۔

”وہ دیر سے گھر آتے ہیں صبح مندا میرے ڈیوٹی پر چلے جاتے ہیں سارا دن ہم دونوں ماں بیٹا گھر میں اکیلے ہوتے ہیں۔ میں کئی دنوں سے آپ کو دیکھ رہی ہوں کہ آپ ادھر دیکھتے رہتے ہیں۔“

اس نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے میری چوری کا راز فاش کرتے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

جواباً میں جھپک کر رہ گیا اور نظریں پھیر لیں۔

”اندرا آجائیں باہر کھڑا ہنا ٹھیک نہیں۔“ اس نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

چند بل میں نے سوچا اور سائیڈ گیٹ عبور کر کے اندر آگیا چاروں طرف دیرانی کا راج تھا پورے پلاٹ میں اونچی اونچی گھاس اور بڑی بڑی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں ابھی میں ادھر ہی متوجہ تھا کہ چھوٹا سا لڑکا اندر سے باہر آ کر اپنی ماں کے ساتھ لگتا میری طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”میرا بیٹا رومی ہے۔“ اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اس کا نام بتایا۔ میں نے برجستہ اس لڑکی سے اس کا نام پوچھ لیا۔ اس نے دھیمے لہجہ میں بتایا۔

”سلوی!“  
”خوبصورت نام ہے۔“ میں تعریف کی۔  
آپ ادھر آجائیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں سلوی نے بے ترتیب اینٹوں پر قدم آگے بڑھاتے رومی کا بازو دیکھتے مجھے ٹوٹے پھوٹے کمرے کے اندر آنے کی دعوت دی۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی سلوی کے پیچھے چلتا ہوا بوسیدہ سے کمرے کے اندر آ گیا۔ دروازے کی جگہ لوہے کی چوکت پر پرانا سا پردہ لگا کر دروازے کا کام لیا گیا تھا اندر ایک چارپائی اور تھوڑے سے پرانی طرز کے کچے اور سلور کے برتن بے ترتیب پڑے تھے ایسے ہی کھڑکیوں پر پرانے پردے لگ رہے تھے۔

دوبار میں دو لوہے کے سرے ٹھوک کر اس کے اوپر لکڑی کی پٹی پر دو چار ڈبے رکھے ہوئے تھے شاید چینی پتی وغیرہ تھی اس میں کونے میں انٹیں جوڑ کر چولہا بنایا ہوا تھا اور پاس ہی کونے میں سوکھی جھاڑیوں اور گھاس پھوس کا گھنا پڑا ہوا تھا۔

جو شاید پلاٹ سے اکٹھا کر کے استعمال میں لاتی تھی وہ۔ رومی کو میں نے پیار سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا اور اس کا سر بہلانے لگا۔ سلوی کو میں نے چائے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا اور میرے قریب ہی چار کی پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ کا نام.....؟“ اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے مجھ سے دریافت کیا؟ ”ناصر علی۔“ میں نے اپنا نام بتاتے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ اس طرح مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر سیٹ گئی اور رومی کو مجھ سے لے کر اپنی گود میں لٹا کر بے باکی سے اپنی نمیں اوپر کرتے اپنی چھاتی اس کے منہ کو لگا دی۔ سلوی کی اس حرکت پر میں یکدم گڑبڑا گیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے پوچھا اور نمیں کو تھوڑا نیچے کرتے رومی کا منہ چھپا دیا۔

”آپ کب سے اس پلازہ میں کام کر رہے ہو؟“

”زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ دراصل میں لاہور میں پڑھنے آیا ہوں میرا خاندان انتہائی غریب ہے سب مل کر کماتے ہیں تو گزارہ ہوتا ہے۔ سوچا کہ اپنی تعلیم مکمل کر کے کوئی اچھی نوکری کر لوں تاکہ اپنے گھر والوں کو سنبھال لوں۔“ کہہ کر میں خاموش ہو گیا ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان سلوی نے بتایا۔

”جن کے پلاٹ میں ہم رہ رہے ہیں میرا خاوند ان کی فیکٹری میں ملازم ہے صبح منہ اندھیرے کام پر جاتا ہے اور شام بلکہ رات گئے واپس آتا ہے آپ کا جب دل چاہے آجایا کریں اسی بہانے میرا اور رومی کا دل بہل جایا کرے گا“ سلوی کے لہجہ میں اپنائیت اور بیچاری کا درد بھرا ہوا تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

”جب فارغ ہوا کروں گا ادھر آجایا کروں گا۔“ میں نے بھی اپنے اندر سلوی کے لیے ہمدردی کا عنصر جاگے محسوس کر لیا تھا۔ رومی دودھ پیتے سوچکا تھا وہ اسے چارپائی پر لٹاتے اپنی نمیں درست کرتی میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں چمکتی خود سپردگی کو میں نے محسوس کرتے وہاں سے اٹھ کر جانے میں ہی بھلائی تصور کی۔

”اچھا جی میں چلتا ہوں منشی غصہ ہو گا بہت دیر ہو گئی ہے۔“ میں نے بات بناتے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی میرے ہمراہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں پردہ ہٹا کر باہر نکل آئے دروازے سے تھوڑا پیچھے ہی تھے کہ سلوی نے میرا بازو تھامتے التجا بھرے لہجہ میں کہا۔

”ناصر جی آپ آیا کریں گے نا؟“

میں نے جذبات سے بے قابو ہو کر سلوی کو اپنے دونوں بازوؤں میں لیتے اپنے سینے سے اکاٹے اُسے بھرپور یقین دلایا۔ کافی دیر تک ہم دروازے کے قریب کھڑے ایک دوسرے کو نہ دیکھتے رہے اور پھر میں اجازت لے کر باہر آ گیا درہمیک پڑے خالی پلاٹوں کے سوا وہاں کوئی بھی دوسرا نہیں میرے سوا۔

میرا اب سلوی کو ملنے کے لیے دل بیقرار رہنے لگا تھا رات کو میں چھت پر اور وہ باہر چارپائی پر آکر بیٹھ جاتی اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔

یہ سلسلہ روز بروز آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ رومی مجھ سے خاصا مانوس ہو چکا تھا کبھی مجھے اس دیرانے کی خاموشی سے ڈر لگنے لگتا تھا مگر پھر یہ سوچ کر میں دل بڑا کر لیتا کہ یہ عورت ہو کر چھوٹے سے بچے کے ہمراہ دن رات اکیلی رہ رہی ہے مگر مرد ہو کر ڈر جاتا ہوں۔ میں نے سلوی کو منع کر دیا تھا کہ تم کچھ ناپاکیاں کرو میں تمہارے لیے دوپہر کا کھانا وغیرہ باہر سے لے آیا کروں گا مگر اس نے منع کر دیا۔

”میں عادی ہو چکی ہوں وہ رات جو کھانا لاتے ہیں وہ اتنا ہوتا ہے کہ صبح کا ناشتہ بھی پیٹ بھر لیتی ہوں وہ تو ناشتہ فیکٹری جا کر کرتے ہیں۔“ میں مطمئن ہو گیا۔

اب میں بلا روک ٹوک جب دل چاہتا جا رہا تھا وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتی ایک دوبارہ نے کوشش کی کہ دونوں ماں بیٹے کو باہر لے جائے تاکہ اس نے یہ کہہ کر انکار کر دے۔

”اے! نہیں پتہ چل گیا تو بہت برا ہو گا۔“ اور میں بھی اچھا نہیں لگتا جب ہم آزادی سے

یہاں پر مل لیتے ہیں تو باہر جا کر کیا کریں گے۔ چھٹی کر کے جب میں سلوی کو ملنے گیا تو اس نے بتایا۔

”میرا بندہ مالکوں کے کام سے شہر سے باہر گیا ہے آج رات وہ گھر نہیں آئے گا اگر تمہیں کوئی دقت نہ ہو تو تم ادھر ہی رُک جاؤ؟“

”نہیں کوئی دقت نہیں ہوتی میں چوکیدار کو بتا کر رات کو آ جاؤں گا۔“ میں نے اس سے وعدہ کر لیا اور واپس پلازہ آ گیا شام کو چھٹی کر کے میں نہا کر تیار ہوا اور چوکیدار کو بہانہ بتا کر وہاں سے نکل آیا ادھر ادھر بھرتے اندھیرا پھیل گیا اور میں پلازہ کے پیچھے والی سڑک پر چلتا ہوا سلوی کے غیٹ پر آ گیا وہ میری منتظر تھی۔

چھوٹا دروازہ کھولتے اس نے میرا ہاتھ تھام کر اندر کر لیا اور کھنڈی لگاتے میرے ساتھ کمرے میں آگئی چارپائی کے ساتھ اس نے انٹیں جوڑ کر چھوٹا سا چوہترایا بنا لیا تھا جس پر رومی بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ چارپائی پر بڑے سلیقے سے بستر بچھا ہوا تھا میرے بیٹھے وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔

”سلوی۔“ جی اس نے خود کو میرے قریب کرتے جواب دیا۔

”یہ کئی بات ہے نا کہ تمہارے میاں کے آنے کی کوئی امید نہیں؟“

”نہیں اس بارے پریشان نہ ہوں وہ اکثر کئی کئی راتیں نہیں آتا مالکان اسے ادھر ادھر بھجواتے رہتے ہیں۔ سلوی نے مجھ پر تر بان ہو جانے والے انداز میں مجھے تسلی دی اور میرے قریب دراز ہو گئی۔ رات گئے تک وہ مجھ پر اپنی محبت کی بارش برساتی رہی۔ تمام رات اس کا بیٹا رومی مل بھر کے لیے بھی ادھر سے ادھر نہ ہوا اور

بے خبر پڑا سوتا رہا۔ پتہ نہیں کب میری آنکھ لگ گئی  
صبح میں نے روشنی کی عادت کو فراموش کر دیا اور  
یونہی سلوی سے لگ کر پڑا سوتا رہا میرا پورا جسم  
نفاہت میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر دن کے اچالے کی  
روشنی پردوں میں سے چھن کر اندر کمرے میں نیم  
تار کی کا سماں پیش کر رہی تھی۔ میں نے دھیرے  
سے سلوی کو خود سے الگ کیا اور چار پائی پر سیدھا  
ہو کر بیٹھ گیا۔

رومی اس پوزیشن میں پڑا ہوا تھا بالکل  
ساکت میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا تو سخت  
جھٹکا لگا وہ کسی لاش کی طرح پڑا ہوا تھا میں نے  
گھبراہٹ میں سلوی کو جھنجھوڑا وہ بھی اسی طرح  
ساکت محسوس ہوئی میں اس صورت حال سے گھبرا  
کر اٹھ بھاگنے کو تھا کہ یکدم سلوی کے جسم میں  
حرکت ہوئی وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف  
دیکھ رہی تھی۔

”اٹھ گئے۔“ اس نے تو یہ شکن انگڑائی لیتے  
مجھے مخاطب کیا۔ میں نے لمبی سانس بھری اور جواباً  
مسکراتے ہوئے بولا۔

”مجھے تو ساری رات ہوش ہی نہیں رہا۔“  
”ہم ایسے ہی ہوش اڑا دیتے ہیں۔“ اس  
نے شوخی سے کہا اور اٹھ کر رومی کی طرف متوجہ ہو  
گئی جواب کروٹ بدلے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔  
پھر سلوی نے اسے اٹھا کر گود میں لے لیا اور بے  
تکلفی سے اپنی چھاتی سے لگالیا۔

”اچھا سلوی میں اب کام پر چلتا ہوں دوپہر  
کو آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے مسکراتی نگاہوں سے  
میری جانب دیکھتے رومی کو دوسری طرف کیا۔ میں  
مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل کر گیٹ کی طرف  
بڑھ گیا۔ میرے جسم سے جیسے جان نکلی پڑی ہو اس

طرح کی کیفیت تھی میری بڑی مشکل سے میں  
پلازہ پہنچا تھا۔ مٹی چائے پی رہا تھا مجھے دیکھتے اس  
نے دوسرے کپ میں چائے ڈال کر مجھے دی میں  
نے شکر یہ کہتے کپ اٹھالیا چائے پینے سے میری  
طبیعت کی سستی میں کچھ کی ہوئی اور میں اٹھ کر  
اوپر بیس کی طرف چل پڑا۔

سارا وقت میں بے دل سا ہو کر بیٹھا رہا۔ میرا  
سارا جسم تھکاوٹ سے چور ہو رہا تھا اس کے ساتھ  
ساتھ سلوی کے ساتھ گزر وقت مجھے بڑا خواب  
ناک محسوس ہو رہا تھا دوپہر کو تو مجھے ٹائم نہ ملا شام کو  
چھٹی کر کے میں سلوی کو ملنے پہنچ گیا دونوں بڑے  
تپاک سے ملے میں نے رومی کو اٹھا کر گود میں لیا  
اور دوسرے بازو سے سلوی کو اپنے ساتھ لگا کر خیر  
خیریت دریافت کی اور اس کے میاں کے بارے  
میں پوچھا جواب میں اس نے برا سامنہ بناتے۔

”اس نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے دو تین  
دن لگ سکتے ہیں شاید کل آئے۔“ یہ کہتے ہوئے  
اس نے شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور  
مجھے لیتے اندر کمرے میں آگئی اس چوتھے نما  
تھڑے پر کافی کچھ پڑا تھا فروٹ، دودھ، دو  
بولٹیں کوک کی۔

”آپ بازار گئی تھیں؟“ میں نے سامان  
دیکھ کر دریافت کیا۔

”جی ہاں کل رات آپ کی خدمت نہ کر سکی  
مجھے خوشی کے مارے کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔  
میں نے تو پیٹ بھر کے کھا لیا ہے اب یہ سب کچھ  
آپ کا حصہ ہے۔ میں بھی آپ کا ساتھ دوں گی  
مگر جب مجھے بھوک لگی۔“ اس نے کافرانہ ادا  
سے کہا۔

”تو آج بھی مجھے آپ کا مہمان بننا ہوگا۔“  
میں نے اس کا ارادہ بھانپتے شرارت بھرے لہجہ

”اے لہا۔“

”آپ کا دل نہیں چاہتا میرے پاس ٹھہرنے  
لہا۔“ سلوی نے روٹھے والے انداز میں میری  
آنکھوں میں دیکھتے برجستہ پوچھا۔

”ارے نہیں میں نے تو یونہی کہا ہے۔“  
میں نے اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔ پھر  
ہم دونوں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو  
گئے۔

”سلوی ایک بات کروں؟“  
”ہاں دو کرو۔۔۔۔۔۔“ وہ میری طرف متوجہ  
ہو گئی۔

”اگر آپ کامیاب اچانک آگیا اور اس نے  
مجھے دیکھ لیا تو کیا بنے گا۔“ میرے لہجے کا ڈمکھوس  
کرتے وہ مسکرائی اور بولی۔

”میں اسے صاف صاف کہہ دوں گی کہ اگر  
تمہیں کوئی اعتراض ہے تم مجھے فارغ کر دو۔ میں  
ناصر صاحب کو نہیں چھوڑ سکتی۔“ اس کے لہجہ میں  
ٹھہراؤ کو محسوس کرتے میں نے اپنے اندر ایک  
مارج کے حوصلہ کو جگہ دی۔ رات بھر ہم دونوں دنیا  
سے بے نیاز اپنے آپ میں گم رہے رومی کو سلوی  
نے اسی طرح اس چوتھے نما پر لٹا دیا تھا اور وہ تمام  
رات پڑا سکون سے سوتا رہا اور ہم دونوں اس کی  
خواب سے آزاد پڑے ہوئے تھے۔ صبح اٹھ کر میں  
پلازہ آگیا اور اپنے کام میں مصروف ہو کر سلوی  
کو نیا لوں میں کھویا ریا۔ یہ سلسلہ مسلسل دو ماہ  
جاری تھا کبھی راتیں اور کبھی دن۔ اب  
میں نے اندر سلوی سانسون کی طرح چلتی تھی۔ میں  
اسے دوبار کہا کہ ہم یہاں سے بھاگ چلتے  
ہیں دوسرے شہر اس نے انکار تو نہ کیا مگر یہ کہہ  
میں نے ملن کر دیا کہ جیسے کام چل رہا ہے اسے  
میں نے کوئی مسئلہ بنا تو یہ بھی کر لیں گے شیڈ

کی چھتیں مکمل ہو چکی تھیں اور مالکان نے کام بند کر  
دیا اور مجھے بھی وہاں سے فارغ کر دیا گیا یہ بات  
میں نے سلوی کو بتائی تو اس نے یہ کہہ کر میری  
ہمت بندھائی کہ اتنا بڑا شہر ہے کسی اور جگہ کام کر لو  
تلاش ٹھیک ہے میں نے اس کی بات کی تائید کی  
اور مزدور اڈے پر آ بیٹھا یہاں کوئی نا کوئی کام مل  
جاتا تھا۔ شام کو میں کام سے واپس آ کر جب  
سلوی کے گھر ملنے آیا تو وہاں کچھ لوگ کام کر رہے  
تھے وہ کھنڈرات نما کمروں کو مسمار کرنے میں  
مصروف تھے۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا  
کہ سلوی اور رومی ادھر ہی ہو گا مگر وہ مجھے کہیں بھی  
دکھائی نہ دیے ابھی میں اسی ادھر بن میں کھڑا تھا  
کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”ہاں جی کیا مسئلہ ہے۔“ سوال کرنے والا  
بارعب سا بندہ تھا؟

”جی وہ یہاں جو اس مکان میں رہتے تھے وہ  
کدھر گئے۔۔۔۔۔۔“

”ارے بھائی یہاں جو رہتے تھے وہ تو اوپر  
چلے گئے ہاں ماں اور بچے کو قتل کرنے والا جیل  
میں ہے اسے مل لو جا کر۔ چار سال ہو گئے اس  
واقعہ کو پتہ نہیں وہ سزائے موت پا گیا یا عرقید۔  
اگر کام چاہیے تو تم بھی کل سے آ جانا مزدوری کے  
لیے۔۔۔۔۔۔“ وہ کہتا ہوا دوبارہ وہاں کام کرنے  
والوں کی طرف گھوم گیا۔ میں اس کے منہ سے یہ  
جملہ سن کر سکتی میں آگیا تھا کہ ماں اور بچے کو اس  
کے خاوند نے قتل کر دیا تھا اور خود وہ جیل میں تھا  
میں نے لرزتے قدم جو آگے بڑھنے سے گریزاں  
تھے صہیختے آگے بڑھا دیے۔ تو کیا میں اس  
کھنڈرات نما کمرے میں اتنے ماہ پر روح کے  
حصار میں تھا۔

☆☆☆☆



کراچی سے ارسال کردہ تحریر

## تتلیاں قید تھیں مقدر کی

تتلیاں قید تھیں مقدر کی

لڑکیاں بھی تو تتلیوں کی مانند ہوتی ہیں

جہاں پیار ملتا ہے وہیں ٹھہر جاتی ہیں.....

تتلیاں قید تھیں مقدر کی

زریں قمر

تتلیاں قید تھیں مقدر کی

شام کا جھپٹا پھیل رہا تھا سردی کی شدت سے  
چہنچہنے کے لیے وہ جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گئی  
تھی اس نے کبل کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا  
تھا ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھلی ہوئی کھڑکی سے  
کمرے میں آرہے تھے ہر جھونکے کے ساتھ وہ  
کپکپا جاتی تھی لیکن اس نے کھڑکی بند نہیں کی تھی  
اسے یہ موسم پسند تھا تیز بارش میں چہنچہنے والی آسانی  
بجلی اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی تھی وہ بچپن  
سے اس موسم کی دیوانی تھی اسے اچھی طرح یاد تھا  
جب موسم کی اس رنگینی نے اس کی سدھ بدھ بھلا  
دی تھی اسے اپنے اندر ہونے والی تبدیلی کا  
احساس ہی نہیں ہوا تھا نہ ہی ایسا ہونے میں کچھ دیر  
لگی تھی سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا تھا ایک لمحے  
پہلے وہ مائرہ تھی اپنے مئی پاپا کی پیاری مائرہ اور  
دوسرے لمحے وہ فضاؤں میں اڑ رہی تھی۔

اس کی کوئی منزل نہیں تھی بارش کے قطرے  
اس پر برس رہے تھے اور سامنے ایک وسیع اور  
لامتناہی کائنات بکھری تھی وہ دیکھ رہی تھی کہ لوگ

برستی بارش میں اس نے دیکھا کہ ایک  
نوجوان جوڑا اپنے کپڑوں پر گرنے والے بارش  
کے قطرے جھاڑ رہا تھا۔ اس کا بھی جی چاہا کہ وہ  
اپنے براؤن بالوں سے قطرے جھاڑ دے بارش  
میں تاپے، تہمتے لگے، اس کا بھی کوئی ساتھی ہو  
جس کے ساتھ وہ اس موسم کا لطف اٹھائے لیکن وہ  
ایسا نہیں کر سکتی تھی کیونکہ بارش اسے بے بس

لڑکی تھی اسے اڑنے سے روک رہی تھی جبکہ وہ  
اڑنے پر مجبور تھی وہ اڑتی ہوئی سڑکوں اور گھروں  
پر سے گزرتی رہی ان لوگوں پر سے گزرتی رہی  
ان کے چہرے اسے صاف نظر نہیں آرہے تھے  
وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ بھی ان جیسی ہی ہے اس کا  
ال چاہا کہ وہ چیخ کر انہیں اپنی موجودگی کا احساس  
دلائے شاید ان میں سے کوئی اس کے بکھرے  
اجود کو جوڑ دے۔

اچانک اسے فضا میں ایک جانی پہچانی خوشبودا  
احساس ہوا یہ خوشبودہ پہچانتی تھی یہ اس کی پسندیدہ  
چائے کی خوشبو تھی اس کے دائیں جانب چائے کی  
وہ دکان تھی جہاں اس نے اپنی دوست تانیہ کے  
ساتھ اکثر چائے پی تھی۔ اس کے اندر اس چائے

کی خوشبو رچی بسی تھی لیکن جب وہ اپنی دوست  
کے ساتھ وہاں چائے پینے آئی تھی تو سب کچھ  
بہت مختلف تھا۔

اچانک ایک آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف  
کھینچ لی تھی اور وہ آواز کے اس منبع کو تلاش کرنے  
لگی تھی وہ موسیقی کی مدھر اور سریلی آواز تھی وہ  
آواز کی سمت اڑنے لگی۔

تیز زوردار بارش کے باوجود وہ اس موسیقی کو  
بخوبی سن رہی تھی اسے لگا جیسے وہ سر اسے اپنی  
طرف کھینچ رہے ہوں انہوں نے اس کے دل و  
دماغ پر قبضہ کر لیا ہو۔

”بھلا یہ آواز مجھے اتنا کیوں بھار رہی ہے؟“  
اس نے حیرت سے سوچا پھر اس کے پر غیر



ارادری طور پر اسے ایک سڑک پر اڑانے لگے یوں جیسے اسے اس بے حس دنیا میں خوشی اور امید کی چھوٹی سی کرن کی تلاش ہو جیسے ہی وہ مڑی تھی اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی تھی جو اپنے گھر کے لان میں بیٹھا گٹار بجا رہا تھا وہ اس لان کے درخت کی ایک شاخ پر بیٹھ گئی۔

جہاں بارش سے بچنے کے لیے چوں کا سہارا موجود تھا اس نے اپنے سنہرے پروں کو زور سے ہلایا تاکہ بارش کے قطرے جھاڑ سکے لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے یہ کوشش چھوڑ دی پھر وہ پوری توجہ سے گٹار سے نکلنے والی موسیقی سننے لگی تھی۔

جیسے جیسے موسیقی اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی وہ پُرسکون ہوتی جا رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ اس کی ساری پریشانیاں ختم ہوتی جا رہی ہیں اس کا ذہن گانے کے ہر بول کے ساتھ غیر ارادی طور پر مسرور اور مسحور ہوتا جا رہا تھا پھر اس نے ایک جھرجھری لی تھی لیکن اسے علم نہیں تھا کہ ایسا ٹھنڈ کی وجہ سے ہوا تھا یا موسیقی کے جادو سے وہ درخت کی شاخ سے اڑ کر اس ریٹنگ پر آ بیٹھی تھی جو اس لان کے شیڈ کے گرد لگی تھی جہاں وہ لڑکا بیٹھا تھا اب وہ اس لڑکے کے سامنے بھی لڑکے کی آنکھیں بند تھیں وہ اپنے گانے میں مگن تھا وہ اس کے دل کی کیفیت محسوس کر سکتی تھی اس کے گانے کی سریلی آواز شام کے کچھٹے میں فضا میں تحلیل ہو کر اس کے وجود میں اتر رہی تھی۔

اے میری روح میرا ساتھ دے

اے میرے دل مجھے چھوڑ کے نہ جا

میں سوچ بھی نہیں سکتا

کہ تو بے وفا ہے

اے خدا! وقت کے دھارے کو

آہستہ کر دے

اے میری روح میرا ساتھ دے

مارہ کا دل چاہا کہ وہ لڑکا ایک بار آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھے اس کی موجودگی کو محسوس کرے لیکن وہ جانتی تھی ایسا نہیں ہوگا وہ ایسا نہیں کرے گا۔

بھلا اس کی حیثیت ہی کیا تھی اتنی بڑی دنیا میں ایک چھوٹی سی تلی بہت خوبصورت لیکن غیر اہم تھا سا کیزا وہ اسے نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ وہ اس وقت مارہ نہیں ایک تلی تھی۔

پھر اچانک لڑکے نے آنکھیں کھولی تھیں اور تلی کی طرف دیکھا تھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی اسے لگا جیسے وہ کسی انوکھی چیز کو تک رہا ہو اسے حیرت تھی کہ وہ اس کی توجہ کا مرکز بنی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا تلیاں بارش میں بھی اڑ سکتی ہیں اسے لگ رہا تھا جیسے ابھی تلیوں کا ایک جھنڈ آئے گا اور اسے اپنے ساتھ لے جائے گا وہ اب بھی گارہا تھا اور خوبصورت تلی اس کے سامنے ریٹنگ پر بیٹھی تھی اپنے سفید اور سنہرے پروں کے ساتھ اس کے پر آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور ان پر بارش کے قطرے نمایاں نظر آ رہے تھے لڑکے نے اپنا گٹار شیڈ کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور اسے قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا اس کی کوشش تھی کہ تلی کو خوفزدہ نہ کر دے۔

”خوبصورت.....“ وہ بڑبڑایا اور اس نے

ایک قدم آگے بڑھایا۔

وہ بیٹھی رہی۔

اس نے دوسرا قدم بڑھایا۔

وہ پھر بھی بیٹھی رہی۔

وہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ اس کے جادو کی

پروں سے ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گیا۔

”خوبصورت..... بہت خوبصورت.....“

اس نے آہستہ سے تعریف کی اور مارہ کا دل زور سے اڑا۔

”اوہ..... یہ واقعی حقیقت ہے۔“ لڑکے نے غیر یقینی انداز میں کہا وہ غور سے تلی کو دیکھ رہا تھا اس کے پروں سے پانی کے قطرے ریٹنگ پر گرے تھے ان میں سنہرے نیلے ہرے چمکدار رنگوں کے ذرات ناچ رہے تھے اور قطرے نیچے گر رہے تھے۔

لڑکا محسوس کر رہا تھا جیسے تلی کی آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی ہوں جسے اس کی موجودگی نے خوبصورت تلی کو اڑنے سے روکا ہوا ہو جیسے وہ اس کے اور صرف اس کے لیے وہاں آئی ہو۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی مگر آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لڑکا خوبصورت تلی سے آنکھیں ہٹانا نہیں چاہتا تھا اسے ڈرتا تھا کہ وہ پلک جھپکتے ہی اڑنے لگا جائے اور پھر ایسا ہی ہوا تھا بس ایک لمبے لمبے کپکپک چھلکی تھیں اور وہ ”سنہری خوبصورت“ فضا میں بلند ہو کر غائب ہو گئی تھی۔

وہ ایک خواب تھا اور مارہ اس کی منتظر بھی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے جسم پر اتنی سردی لے باوجود سینے کے قطرے موجود تھے گزرے لمحوں کی تبدیلی کو وہ اب بھی محسوس کر رہی تھی اس نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا دیوار پر لگی گھڑی صبح لے تین بج رہی تھی وہ اپنے گھر میں اپنے بیڈ پر تھی اور اس کا کبل اس کے پیروں سے پھسل کر بیڈ کے نیچے گر گیا تھا اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا جیسے یقین لے رہی ہو کہ وہ مارہ ہی ہے اور پھر پُرسکون ہو کر کمرے کی سانس لیتی ہوئی بیڈ کی پشت سے نکل گئی۔

میں مسلسل چھٹی رات تھی جو مارہ یہ خوب دیکھ رہی تھی اسے ہر تفصیل اچھی طرح یاد تھی کیونکہ اس

نے خواب کو بھلانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی لیکن ایک خلا تھا ایسا خلا جو وہ پُر نہیں کر سکتی تھی اسے یاد تھا وہ گیارہ سال کی تھی اسے زندگی سے محبت تھی جب بھی کبھی بارش ہوتی تھی وہ چاہے جہاں بھی ہوئی اسے یہی خواب نظر آتا وہ تلی بن جاتی اور دنیا کی سیر کرتی پھر جیسے ہی بارش ختمی اور اس کی آنکھ کھلتی وہ مارہ ہی ہوتی وہ اکثر سوچتی کہ شاید ایسا اس لیے ہے کہ وہ تلیوں کو بہت پسند کرتی ہے ان کے چمکدار رنگ اسے بھاتے ہیں اور اس کی والدہ اکثر اسے تلیوں کے بارے میں بتاتی ہیں ان کی تعریف کر کے اسے زندگی کی اچھی مثالیں دیتی ہیں۔

”تمہیں پتہ ہے زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تبدیلی بہت ضروری ہے۔“ ایک بار اس کی والدہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”جیسے ایک خوبصورت تلی میں تبدیل ہونے کے لیے طویل مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اتنے خوبصورت رنگ حاصل کرنے اور آزاد فضاؤں میں اڑنے کے لیے اسے کیڑ پلر کے خول سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح انسانوں کو بھی دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔“ اس کی والدہ نے وضاحت کی تو اسے اُن کی بات بہت پسند آئی۔

خواب میں ہمیشہ مارہ کی کوشش ہوتی کہ وہ بارش سے بچنے کے لیے کوئی سایہ دار جگہ تلاش کر لے ایسا اس کے ساتھ اکثر ہوتا تھا لیکن اس نے کبھی اپنے والدین کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا وہ نہیں جانتی تھی اس بارے میں جاننے کے بعد ان کا کیا رویہ ہوگا لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی دوست تانیہ کو اس بارے میں بتا سکتی ہے تانیہ

اس کی ہی ہم عمر تھی دونوں میں بے حد دوستی تھی دونوں ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں اور اب میٹرک کرنے کے بعد دونوں کا داخلہ ایک ہی کالج میں ہو گیا تھا۔

تانیہ کو کہانیاں لکھنے کا شوق تھا اور وہ ایک اچھی فوٹو گرافر بھی تھی۔ مائرہ نے اس کی کہانیاں کبھی پڑھی نہیں تھیں اس وقت بھی مائرہ اس کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی اس کا خیال تھا کہ وہ تانیہ پر بھروسہ کر سکتی ہے اس نے پھر گھڑی کی طرف دیکھا ساڑھے چار بج گئے تھے۔

وہ بیڈ سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے لان میں چھل قدمی کرے ابھی بہت صبح تھی لیکن وہ مزید بیڈ پر لیٹنا نہیں چاہتی تھی۔

لان میں آکر وہ ایک درخت کے نیچے رکھی بیچ پر بیٹھ گئی اس نے درخت کے تنے سے پشت لگالی تھی اور اپنی گرم شال اپنے گرد لپیٹ لی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں وہ ایک بار پھر نیند کی وادی میں پہنچ گئی تھی وہ پھر اس سڑک سے گزر رہی تھی جہاں سے پہلے بھی کئی بار گزر چکی تھی پھر وہ اس جانے پہچانے لان میں پہنچی تھی جہاں اڑان کے دوران پہلے بھی جا چکی تھی وہ خالی تھا وہاں وہ درخت بھی تھا جس کی شاخ پر وہ بیٹھ چکی تھی اسے وہ لڑکا بھی نظر آ رہا تھا وہ بہت خوبصورت تھا اس میں کوئی چادوئی کشش تھی جو مائرہ کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اس کے ہاتھوں میں گٹار تھا وہ بہت پُر سکون تھا ہوا سے اس کے بالوں کی ایک آوارہ لٹ اڑ کر اس کے ماتھے پر آگری تھی اس کی آنکھیں بند تھیں وہ گٹکار رہا تھا۔

”اسارنی.....“ مائرہ نے دل میں اس کی تعریف کی۔

اچانک مائرہ کی آنکھوں میں بجلی کی تیزی سنہری چمک کوندی ساتھ ہی بادلوں کی زوردار گرج سنائی دی سفید شیلڈ میں درختوں کی آوارہ پتیاں رقص کرتی پھر رہی تھیں اور ان کے سرسراہنے کی مدھم آواز طوفانی گرج وچمک میں دب گئی تھی وہ لڑکے کے قدموں کو چوم رہی تھیں وہ اب بھی گٹار کی دھن پر گنگنا رہا تھا یہاں تک کہ ایک سنہری تپتی اس کے سامنے آگئی اس نے آنکھیں کھول دیں وہ اس تپتی ہی کے لیے ڈکا تھا۔

خدا کو پہچاننے کے لیے دیکھو وہ تپتی جو مدتوں بعد

ہزاروں دوریاں طے کرتی پھر وہیں لوٹ آتی ہے

اسی درخت پر اس شاخ پر

خدا کو پہچاننے کے لیے دیکھو وہ گنگنا نے لگا..... اور سردی کی شدت اور

بجلی کی چمک نے مائرہ کو چونکا دیا اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ لان میں بیچ پر بیٹھی سردی سے ٹھٹھری رہی تھی وہ اٹھ کر واپس اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ جہاں ہر چیز بکھری ہوئی تھی پھر اس نے زمین پر بڑا ہوا کمبل اٹھایا جو سوتے ہوئے اس سے ہی گر گیا تھا اور خود کو کمبل میں لپیٹ کر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

اس کی آنکھ اپنی والدہ کی آواز پر کھلی تھی جو باورچی خانے سے اسے بکار رہی تھیں۔

”مائرہ جلدی اٹھو تمہیں کالج کے لیے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اُسے بلارہی تھیں۔

”آج تمہارا کالج کا پہلا دن ہے اور آج ہی تم لیٹ ہو جاؤ گی۔“

ان کی آواز پر وہ تیزی سے اٹھی تھی اور ہاتھ

میں چلی گئی تھی اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تھا اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جن میں تانہ۔ جگہ سنہری اور نقرئی لہریں بنی تھیں جو خاصی مسسم تھیں براؤن آنکھوں کی پتلیوں میں سنہری نہاں تھی جو شاید رات کے جادوئی خواب کا اثر تھا۔ وہی وہ چیزیں تھیں جو اسے یقین دلاتی تھیں کہ اس نے خواب شخص خواب نہیں۔

اس نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کا ایک بہکا مارا اور گہری پُر سکون سانس لی پھر چہرے پر پُر سکون مسکراہٹ بکھیرے ذہن سے اسارنی کا خیال جو کمر دیا۔

جن کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی والدہ کو دیر سے اٹھنے کے بارے میں کیا بتائے گی جو ناشتہ کرانے کے لیے بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

میز پر موسم کے پھل اور نچ جوس اور سینڈوچز موجود تھے اور مائرہ کی والدہ سنک کے پاس کھڑی پنہاں کام کر رہی تھیں۔

”اوہ تم آگئیں۔“ انہوں نے مائرہ کو گلے اکا تے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ ناشتہ دیکھ کر حیران ہو؟“ انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مئی! کوئی خاص موقع ہے؟ ناشتے پر اتنی توجہ؟“ اور میرے پسندیدہ فروٹس.....؟“

”بس میں نے سوچا..... آج تمہارا کالج کا پہلا دن ہے تو تمہیں خوش کرو دیا جائے۔“ انہوں نے کہا۔

”لیکن ڈیڈی؟“

”وہ ہاتھل گئے ہیں انہیں آج صبح جلدی لگا۔“ مائرہ ضروری کام تھا۔“ انہوں نے بتایا تو

”نہ ملرا انہیں دیکھا اس کے ڈیڈی ایک

ڈاکٹر تھے اور مقامی اسپتال میں ملازمت کرتے تھے اپنی مصروفیت کی وجہ سے وہ اکثر فیملی کو زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے لیکن اس کی مئی نے بھی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔

”میرا خیال ہے وہ جلدی آجائیں گے۔“ مائرہ نے کہا۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔“ اس کی والدہ نے جواب دیا پھر وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں تھیں۔

”آج تم دیر تک سوتی رہی ہو خیریت تو ہے؟“

”میرا خیال ہے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی ابھی کالج کا وقت ہے۔“ مائرہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی روزانہ کے مقابلے میں دیر سے اٹھی ہو۔“ انہوں نے ڈائنگ ٹیبل سے ایک سیب اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں کل رات سر میں کچھ درد تھا نیند دیر سے آئی تھی۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”تمہارے چہرے کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ کئی راتوں سے نیند پوری نہیں ہوئی۔“ انہوں نے کہا تو مائرہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا جیسے اس کی والدہ نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔

”کیا؟“ اس نے چونک کر کہا وہ اور نچ جوس پیتے پیتے رک گئی تھی۔

”مائیں سب جانتی ہیں تم ان سے کچھ نہیں چھپا سکتیں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم کئی راتوں سے جاگ رہی ہو یا دیر سے سو رہی ہو۔“

”ہاں ایک خواب مجھے روز تک کرتا ہے۔“

47



اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

”کیسا خواب؟“ انہوں نے پوچھا اور مازہ ایسا جملہ تلاش کرنے لگی جو اس کے سچ سے قریب تر ہو وہ سوچ رہی تھی کہ خواب میں سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے چنانچہ وہ انہیں سچ بھی بتا سکتی ہے وہ اسے محض خواب ہی سمجھیں گی سچ نہیں۔

”یہ بڑا عجیب خواب ہے..... میں دیکھتی ہوں کہ میں ایک خلی بن گئی ہوں۔“

”اوہ..... یہ تو بڑا دلچسپ خواب ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا اب بھی تم نے ایسا خواب دیکھا ہے؟“

”ہاں..... میں نے دیکھا کہ سردی بہت ہے ایسی سردی میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی۔“

مازہ نے سینڈوچ کھاتے ہوئے کہا۔

”بارش بھی ہو رہی تھی اور میں..... میں ایک قتل بن گئی تھی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... یہ تو زبردست ہے..... قتل بننا تو بہت دلچسپ رہا ہوگا؟“

”ہاں..... مجھے بھی بہت مزہ آیا تھا۔“

”تمہیں پتہ ہے ہم زندگی کی معراج اور خوبصورتی طرح ہے جب ہم زندگی کی معراج اور خوبصورتی کو چھوٹے والے ہوتے ہیں تو تئلیوں کی طرح کچھ تبدیلیوں اور مشکلات سے گزرتے ہیں۔“

اس کی والدہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں زندگی تئلیوں کی طرح ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ آرام تو کرو لیکن اڑنا بھی نہ بھولو۔“ مازہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور کانچ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”اپنا خیال رکھنا۔“ اس کی والدہ نے ناشتے کے برتن میٹھے ہوئے کہا اور وہ الوداع کہہ کر گھر سے نکل گئی۔

کانچ جاتے ہوئے اسے راستے میں کار کے اندر بیٹھے ہونے کے باوجود سردی کا احساس ہو رہا تھا آج اس کی کانچ لائف کا پہلا دن تھا اس کے دل میں ایک بے چینی سی تھی کیسے نئے دوستوں سے واسطہ پڑے گا کانچ کے پارکنگ ایریا میں کار موڑتے ہوئے وہ مخالف سمت سے آنے والی کار سے اپنی کار ٹکرائی بھی ایک دھماکا ہوا اور آس پاس موجود اسٹوڈنٹس اس کی طرف متوجہ ہو گئے جو جلد ہی دوبارہ اپنی اپنی سمت روانہ ہو گئے تھے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کے شیشے پر دستک ہوئی وہاں سے ایک لڑکے کا چہرہ جھانک رہا تھا جس پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے مازہ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر باہر آ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں معافی چاہتا ہوں..... کہ اچانک آپ سے کار ٹکرائی۔“ لڑکے نے کہا۔

”اگر کوئی بھی نقصان ہوا ہے تو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں ب..... اس کی ضرورت نہیں۔“ مازہ نے پہلی بار اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسے لگا کہ اس نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے اس کی آنکھیں..... اس کی رنگت..... اس کے ماتھے پر پھیلے ہوئے سیاہ بال..... بہت زیادہ خوبصورت اور وجہ.....

”اوہ..... میں..... بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ اچانک بولا۔

”دراصل میں یہاں نیا ہوں..... اور میں نہیں جانتا کہ کہاں گھوم رہا ہوں..... اصل میں مجھے اپنے کلاس روم کی تلاش ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ اور مازہ کی نظر اپنی کار کے اگلے حصے پر پڑی جہاں بڑا سا گڑھا پڑ چکا تھا اسی لمحے فرسٹ بیرڈ کی ٹیل کی آواز آئی اور وہ چونک

کاٹ جاتے ہوئے اسے راستے میں کار کے اندر بیٹھے ہونے کے باوجود سردی کا احساس ہو رہا تھا آج اس کی کانچ لائف کا پہلا دن تھا اس کے دل میں ایک بے چینی سی تھی کیسے نئے دوستوں سے واسطہ پڑے گا کانچ کے پارکنگ ایریا میں کار موڑتے ہوئے وہ مخالف سمت سے آنے والی کار سے اپنی کار ٹکرائی بھی ایک دھماکا ہوا اور آس پاس موجود اسٹوڈنٹس اس کی طرف متوجہ ہو گئے جو جلد ہی دوبارہ اپنی اپنی سمت روانہ ہو گئے تھے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کے شیشے پر دستک ہوئی وہاں سے ایک لڑکے کا چہرہ جھانک رہا تھا جس پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے مازہ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر باہر آ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں معافی چاہتا ہوں..... کہ اچانک آپ سے کار ٹکرائی۔“ لڑکے نے کہا۔

”اگر کوئی بھی نقصان ہوا ہے تو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں ب..... اس کی ضرورت نہیں۔“ مازہ نے پہلی بار اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسے لگا کہ اس نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے اس کی آنکھیں..... اس کی رنگت..... اس کے ماتھے پر پھیلے ہوئے سیاہ بال..... بہت زیادہ خوبصورت اور وجہ.....

”اوہ..... میں..... بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ اچانک بولا۔

”دراصل میں یہاں نیا ہوں..... اور میں نہیں جانتا کہ کہاں گھوم رہا ہوں..... اصل میں مجھے اپنے کلاس روم کی تلاش ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ اور مازہ کی نظر اپنی کار کے اگلے حصے پر پڑی جہاں بڑا سا گڑھا پڑ چکا تھا اسی لمحے فرسٹ بیرڈ کی ٹیل کی آواز آئی اور وہ چونک

کاٹ جاتے ہوئے اسے راستے میں کار کے اندر بیٹھے ہونے کے باوجود سردی کا احساس ہو رہا تھا آج اس کی کانچ لائف کا پہلا دن تھا اس کے دل میں ایک بے چینی سی تھی کیسے نئے دوستوں سے واسطہ پڑے گا کانچ کے پارکنگ ایریا میں کار موڑتے ہوئے وہ مخالف سمت سے آنے والی کار سے اپنی کار ٹکرائی بھی ایک دھماکا ہوا اور آس پاس موجود اسٹوڈنٹس اس کی طرف متوجہ ہو گئے جو جلد ہی دوبارہ اپنی اپنی سمت روانہ ہو گئے تھے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کے شیشے پر دستک ہوئی وہاں سے ایک لڑکے کا چہرہ جھانک رہا تھا جس پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے مازہ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر باہر آ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں معافی چاہتا ہوں..... کہ اچانک آپ سے کار ٹکرائی۔“ لڑکے نے کہا۔

”اگر کوئی بھی نقصان ہوا ہے تو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں ب..... اس کی ضرورت نہیں۔“ مازہ نے پہلی بار اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسے لگا کہ اس نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے اس کی آنکھیں..... اس کی رنگت..... اس کے ماتھے پر پھیلے ہوئے سیاہ بال..... بہت زیادہ خوبصورت اور وجہ.....

”اوہ..... میں..... بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ اچانک بولا۔

کر رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اگر یہ خواب ہے تو کبھی نہ ٹوٹے پورے پیرڈ مازہ یا اس لڑکے درمیان کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی پیرڈ ختم ہونے کے بعد وہ تیزی سے کلاس سے نکل گئی۔

”مازہ.....“ اسے اپنے پیچھے تانیہ کی آواز سنائی دی اور وہ رک گئی۔

”میرا خیال تھا کہ تم میرا انتظار کرو گی۔“

مازہ نے تانیہ کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

”کیوں؟“ مازہ نے پوچھا۔

”بھئی میں نے کلاس میں تمہیں اشارہ تو کیا تھا کہ میرا انتظار کرنا۔“ تانیہ نے کہا۔

”اچھا..... میں سمجھی نہیں تھی تانیہ.....“ مازہ نے جواب دیا۔

”کیا تم نے اب تک اس سے بات کی؟“

تانیہ نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

”کس سے؟“ مازہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”ہینڈسم سے..... وہی جو تمہارے ساتھ بیٹھا تھا۔“ تانیہ بے ساختہ ہنسی۔

”نہیں..... لیکن صبح اس نے میری کار کو ٹکڑا کر ماری ہے۔“

”تمہاری کار کو ٹکڑا کر ماری؟“ تانیہ بے یقینی سے ہنسی۔

”تمہارے حسن میں کھو گیا ہوگا۔“ اس نے پھر شرارتی انداز میں کہا۔

”تم ٹکڑا کر دو..... ہم کانچ کی چھٹی کے بعد ملنے والے تھے۔“ مازہ نے کہا۔

”ملنے والے تھے؟ کیا مطلب؟ ملنا بھی ملے ہو گیا؟“

”ارے بھئی کار کے نقصان کے بارے میں بات کریں گے۔“ مازہ نے وضاحت کی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ تانیہ جلدی سے بولی۔  
 ”تم چلو۔۔۔۔۔ میں اس سے مل کر آئی ہوں۔“  
 مائرہ نے کہا اور چلتی ہوئی کار پارکنگ کی طرف  
 بڑھ گئی پھر وہ وہاں کافی دیر اس کا انتظار کرتی رہی  
 تھی لیکن وہ نہیں آیا تھا مائرہ کا دل شدت سے اس  
 لڑکے سے ملنا چاہ رہا تھا لیکن اسے یقین ہو چلا تھا  
 کہ وہ نہیں آئے گا۔  
 ”ہائے۔۔۔۔۔“ اچانک اُسے اپنی پشت سے  
 آواز آئی اور وہ تیزی سے مڑی۔  
 ”اوہ۔۔۔۔۔ ہائے۔“ اس نے حیرت سے کہا وہ  
 اس کے سامنے کھڑا تھا وہی جانی پہچانی آنکھیں  
 وہی بال وہی مسکراہٹ۔۔۔۔۔  
 ”دیکھیں کیا نقصان ہوا ہے۔“ لڑکے نے  
 کار کے اگلے حصے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”اوہ۔۔۔۔۔ یہ تو خاصا بڑا گڑھا پڑ گیا ہے۔“  
 اس نے فکر مندی سے کہا۔  
 ”کوئی بات نہیں۔“  
 ”میں ٹھیک کروادوں گا۔“ اس نے اصرار  
 کیا۔  
 ”نہیں اس کی ضرورت نہیں میں خود ٹھیک  
 کروالوں گی ویسے بھی اس کی وجہ سے کار کی  
 کارکردگی پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔“ مائرہ نے  
 مسکراتے ہوئے کہا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ  
 سارا دن وہاں کھڑی اس سے باتیں کرتی رہے۔  
 ”اچھا۔۔۔۔۔ جیسی تمہاری مرضی۔“ اس نے کہا  
 اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔  
 ”میرا نام احسن ہے۔۔۔۔۔ احسن اقبال۔“  
 اس نے جاتے ہوئے کہا۔  
 ”میں مائرہ ہوں۔“ مائرہ نے دھڑکتے دل  
 سے کہا وہ چلا گیا تھا اور مائرہ وہاں کھڑی کافی دیر  
 تک اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

کھانے کی میز پر اسے اپنے والدین کی کار کو  
 بد احتیاطی سے استعمال کرنے کے بارے میں  
 نصیحتیں سننا پڑی تھیں اور وہ جلدی سونے کے لیے  
 اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور بیڈ پر لیٹی دیر تک  
 اس لڑکے کے بارے میں سوچتی رہی تھی پھر نیند  
 نے اسے اپنی آنکھوں میں لے لیا تھا۔  
 وہ خواب میں اڑتی جا رہی تھی جیسا کہ کئی  
 راتوں سے ہو رہا تھا۔ منظر بھی وہی تھا بارش بھی  
 ویسے ہی ہو رہی تھی وہ انہی راستوں، سڑکوں اور  
 عمارتوں کے قریب سے گزر رہی تھی وہی جانی  
 پہچانی خوشبوئیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں حد تو یہ  
 کہ اس کے قریب سے گزرنے والے لوگ بھی  
 وہی تھے پھر اسے موسیقی سنائی دینے لگی جو اسے  
 اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور کچھ دیر بعد وہ اسی  
 جگہ پہنچنے لگا۔ لڑکے کے شید میں تھی۔ سب کچھ  
 اپنے آپ کو دہرا رہا تھا میٹھ کی طرح لیکن اب  
 صرف ایک چیز مختلف تھی مائرہ نے لڑکے کی طرف  
 دیکھا وہ کچھ بدلا بدلا سا تھا اس کے بازو پہلے سے  
 زیادہ مضبوط و توانا ہو گئے تھے آواز سمندر کی طرح  
 گہری جو مائرہ کے دل میں موجود پیار کی پرسکون  
 لہروں کو بے چین کر رہی تھی۔ اس کی بے نام  
 چاہتوں کو ایک نام دے رہی تھی اور جب وہ  
 رینگ پر بیٹھنے کے لیے اس کے قریب گئی اور اسے  
 دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں کو چپکا یا تو وہ حیران  
 رہ گئی۔  
 وہ اُسے پہچان گئی تھی۔۔۔۔۔ وہ وہی تھا۔۔۔۔۔  
 احسن۔۔۔۔۔ احسن اقبال۔۔۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ مائرہ  
 کی طرف بڑھ رہا تھا اور رینگ کے قریب آ کھڑا  
 ہوا تھا وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا مائرہ بھی اسے  
 آنکھوں میں بسا لیتا چاہتی تھی۔  
 ”خوبصورت۔۔۔۔۔“ مائرہ کو لگا جیسے احسن نے

منا، لب کیا ہوا اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی لیکن  
 اس کی یادوں میں سب موجود تھا اسے لگ رہا تھا  
 جیسے اس کے ذہن میں دو یادیں ساتھ ساتھ زندہ  
 ہوں۔۔۔۔۔ فضاؤں میں اڑنا۔۔۔۔۔ کار کی ٹکر۔۔۔۔۔  
 نہ بیڈوں کی پلٹیں۔۔۔۔۔ موسیقی کی آوازیں۔۔۔۔۔ کار  
 کی لمڑی سے جھانکتا ہوا احسن کا چہرہ۔۔۔۔۔ گٹار کی  
 آواز۔۔۔۔۔ بھانا لڑکا۔۔۔۔۔ گہری آنکھیں۔۔۔۔۔ بکھرے  
 بال۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہی تھا۔ مائرہ کو یقین ہو گیا وہ  
 اپنا کب نیند سے چوکی تھی اس کا جسم سردی سے  
 کانپ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے کیا دیکھا  
 ہے وہ جسے دیکھتی رہی تھی وہ لڑکا حقیقت تھا۔  
 احسن۔۔۔۔۔ احسن اقبال۔۔۔۔۔ اور اسے اس حقیقت کو  
 ماننا تھا۔۔۔۔۔ وہ اس کا سمارٹی تھا۔  
 دوسرے روز کالج میں موقع پاتے ہی تانیہ کو  
 اپنا راز بتانے کے لیے مائرہ نے اسے فری پیریز  
 میں ایک درخت کے نیچے روک لیا تھا اور جب  
 تانیہ کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا تو وہ اُلجھ گئی  
 تھی۔  
 ”تم جو بات کہہ رہی ہو وہ ناممکن ہے بھلا  
 ایسا لڑکی نکلی کیسے ہو سکتی ہے۔“ تانیہ نے کہا۔  
 ”یقین کرو۔۔۔۔۔ میں کافی عرصے سے یہی  
 کہہ رہی ہوں اصل میں ہم لڑکیوں میں اپنی  
 باتوں کی تکمیل کے لیے اونچے سے اونچا  
 لڑکی کی خواہشیں تو ہوتی ہیں لیکن اتنی جرأت  
 نہیں ہوتی۔“ مائرہ نے کہا۔  
 ”لیکن خواب تو خواب ہوتے ہیں حقیقت  
 ”تانیہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔  
 ”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ لیکن اگر تمہیں اپنے  
 دل کی بات کہنی ہو جیسے ہم جانتے ہیں کہ  
 ”اور تمہارے سامنے موجود ہے اور ہم  
 ”اٹنی میں کھڑے ہیں تب؟ اگر ایسا یقین

ہو تو پھر خواب بھی سچے ہو جاتے ہیں تانیہ۔“ مائرہ  
 کے لہجے میں عجیب سرور سا تھا۔  
 ”تم اسے پسند کرتی ہو؟“ تانیہ نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے  
 میں اسے ایک طویل عرصے سے اپنے خوابوں میں  
 دیکھ رہی ہوں وہ میرے لیے ایک زندہ حقیقت  
 ہے اور اب۔۔۔۔۔ جبکہ وہ میرے سامنے۔۔۔۔۔  
 میرے ارد گرد موجود ہے میں اس سے کیسے دور رہ  
 سکتی ہوں۔“  
 ”کیا تم نے اسے کچھ بتایا؟“  
 ”نہیں۔۔۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔۔۔ کل تک تو مجھے بس  
 اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ جانا پہچانا ہو۔۔۔۔۔  
 مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا  
 تھا لیکن کل رات۔۔۔۔۔“  
 ”کل رات تم نے اُسے پھر خواب میں  
 دیکھا؟“  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ اور کل سب کچھ بہت کلیئر تھا۔۔۔۔۔  
 کل جب اس نے میرے قریب آ کر خوبصورت  
 کہا تو اسی لمحے میں پہچان گئی تھی کہ وہ احسن  
 ہے۔۔۔۔۔ میرا سمارٹی۔“ مائرہ بولے جا رہی تھی۔  
 ”پھر اب۔۔۔۔۔ اب تم کیا چاہتی ہو؟“ تانیہ  
 نے پوچھا۔  
 ”میں اس کے بارے میں سب کچھ جانتا  
 چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ وہ کون ہے۔۔۔۔۔ کہاں رہتا  
 ہے۔۔۔۔۔ اس کی فیملی میں کون کون ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔  
 اور کہیں اس کی زندگی میں کوئی اور لڑکی تو نہیں۔“  
 ”ہوں۔۔۔۔۔ میں سمجھ گئی۔۔۔۔۔ میں اس سے یہ  
 سب پوچھوں گی۔“  
 ”نہیں یوں نہیں، میں چاہتی ہوں اسے یہ  
 احساس نہ ہو کہ ہم اس میں دلچسپی لے رہے ہیں  
 اور اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتا چاہتے

ہیں..... میں اسے موقع دینا چاہتی ہوں.....  
اسے وقت دینا چاہتی ہوں..... اگر میرے خواب  
سچے ہیں تو وہ خود میرے قریب آنے کی کوشش  
کرے گا۔“  
”اور اگر ایسا نہ ہوا؟“ تانیہ نے خدشہ ظاہر  
کیا۔

”ایسا ہوگا..... اگر خدا نے اسے میرے  
خوابوں میں بسایا ہے..... ملنے کا ذریعہ بنایا ہے تو  
مجھے بھی آہستہ روی سے سکون سے پریشانی چھوڑ  
کر جلد بازی چھوڑ کر اس عمل کا حصہ بننا ہوگا جس  
میں ایک قطعی کیئر ہلنے کے عمل سے گزرتی ہے  
اور خود کو خوبصورت رنگوں والے پر اور آزادی  
ملنے تک سکون سے انتظار کرتی ہے۔ مجھے بھی  
انتظار کرنا ہوگا۔“ مائرہ بول رہی تھی اور تانیہ حیرت  
سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

پھر مائرہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا احسن  
خود بخود اس کے قریب آتا چلا گیا تھا وہ کالج میں  
زیادہ وقت ایک ساتھ گزارنے لگے تھے اس  
عرصے میں احسن نے اُسے بتایا تھا کہ اس کے  
والد ایک بزنس مین ہیں اس کی والدہ ایک صحافی  
ہیں اس کی ایک چھوٹی بہن ہے جو اسکول میں  
ساتویں کلاس میں پڑھتی ہے اور مائرہ اس کی  
زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہے یہ سب جان کر  
مائرہ بہت خوش ہوئی تھی۔

”تمہیں کسی لڑکیاں پسند ہیں؟“ مائرہ نے  
اس سے دل کی بات پوچھی۔

”مجھے ایسی لڑکیاں پسند ہیں جو تیلیوں کی  
طرح خوبصورت اور انہیں پکڑنا..... انہیں حاصل  
کرنا اور انہیں قابو کرنا مشکل ہو۔“ احسن نے کہا  
اور وہ اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”بھلا تیلیوں جیسی لڑکی ہی کیوں؟“ مائرہ نے

تجسس سے پوچھا۔

”بس تیلیاں مجھے پسند ہیں..... میں بچپن ہی  
سے تیلیاں پکڑنے کا شوقین ہوں لیکن وہ بھی  
میرے پاس نہیں آتیں..... شاید یہی وجہ ہے کہ  
اکثر خوابوں میں بھی میں تیلیاں ہی دیکھتا ہوں۔“  
”کیا مطلب؟“

”مجھے اکثر تیلیاں خوابوں میں بھی نظر آتی  
ہیں اور میں انہیں پکڑ نہیں پاتا۔“ احسن نے  
وضاحت کی اور مائرہ دھیرے سے مسکرا دی۔

آہستہ آہستہ مائرہ اور احسن ایک دوسرے  
سے بہت قریب آ گئے تھے مائرہ نے احسن کو نہیں  
بتایا تھا کہ اس کے خوابوں میں آنے والی قطعی وہی  
ہے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ احسن اس پر یقین نہیں  
کرے گا لیکن اُسے خوشی تھی کہ وہ احسن کا قرب  
حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

انتر کرنے کے بعد احسن اپنی خواہش پر اپنے  
والدین کو مائرہ کے گھر لایا تھا اور انہوں نے اپنے  
بیٹے کے لیے مائرہ کا رشتہ مانگا تھا جو مائرہ کی والدہ  
نے اس کی مرضی سے منظور کر لیا تھا مائرہ بہت خوش  
تھی اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی منزل خود  
چل کر اس کے قریب آ گئی تھی۔

شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا مائرہ اپنے گھر  
کے لان میں احسن کے ساتھ اسی بیچ پر بیٹھی تھی  
جس پر وہ ایک رات بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اور اپنے  
خواب میں اڑتی احسن کے پاس پہنچ گئی تھی احسن  
کے ہاتھ میں گٹار تھا اور وہ اس پر وہی دھن بجا رہا  
تھا جو مائرہ نے اس کے لان میں بیٹھ کر سنی تھی مائرہ  
اس دھن میں منہمک تھی اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ  
کب اس نے دھن کے ساتھ ساتھ گنگنا نا شروع  
کر دیا تھا۔

خدا کو پہچاننے کے لیے دیکھو

وہ تیلی جو مدتوں بعد  
ہزاروں دوریاں طے کرتی  
پھر وہیں لوٹ آتی ہے

اسی درخت پر  
اسی شاخ پر

خدا کو پہچاننے کے لیے دیکھو

احسن اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا گٹار  
بجاتے بجاتے اس کا ہاتھ رک گیا تھا اور موسیقی کی  
اواز بند ہونے پر مائرہ چونک گئی۔

”کیا ہوا؟“ بجاؤ نا..... تم کتنی اچھی دھن  
بجا رہے تھے۔“ مائرہ نے تعریف کی۔

”تم نے یہ گانا کہاں سنا؟“ احسن نے  
پوچھا۔

”کون سا گانا؟“

”وہی جو تم ابھی گارے تھیں؟“

”یہ..... یہ تو میں نے خواب میں سنا تھا.....

ایک لڑکا اپنے گھر کے لان میں بیٹھا گٹار کے  
ساتھ یہ گانا گا رہا تھا..... مجھے بہت اچھا لگا اور  
میں نے ذہن میں محفوظ ہو گیا ابھی تم نے دھن  
بائی تو اچانک میرے لبوں پر آ گیا۔“

”لہلہ..... لیکن..... میں نے تو کسی کے

گانا یہ گانا نہیں سنا..... یہ تو میں نے ابھی بنایا  
ہے۔“ اسی کو سنایا نہیں۔“ احسن نے حیرت سے

”تم نہیں جانتے..... تم کسی کو سنا چکے ہو۔“

”میرے سے بولی اور احسن اسے بے یقینی  
سنا۔“

”پیارے ایک تیلی کی طرح ہی تو ہوتا ہے جہاں

لہلہ ہوتی ہے اور جہاں یہ خوش رہتا ہے

وہیں ہی جاتا ہے۔“ مائرہ نے کہا۔

”ہاں..... تیلیاں بھی تیلیاں ہی تو ہوتی ہیں

ہم جتنا ان کے پیچھے بھاگتے ہیں یہ اتنی ہی ہم سے  
دور ہو جاتی ہیں لیکن اگر ہم ان کی طرف سے اپنا  
دھیان ہٹائیں تو وہ کسی تیلی کی طرح ہمارے لان  
کی رینگ پر آ بیٹھی ہیں۔“

”لان کی رینگ پر؟“ احسن نے حیرت سے  
دہرایا وہ بے یقینی سے مائرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں لان کی رینگ پر..... بارش کے  
دوران..... چاہے ان کے پردوں پر سے سارے

سنہری اور نقرئی رنگ پانی میں مل کر بہہ  
جائیں..... وہ دیوانی ہوتی ہیں..... اپنے اسرار کی

نکودیکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔“ مائرہ جیسے  
خواب میں بول رہی تھی۔

”کیا خواب بھی سچے ہوتے ہیں؟“ احسن  
نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں لپٹے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... اگر تمہیں ان کی سچائی پر یقین ہو  
اور تم ان کے نظر آنے کا بے چینی سے انتظار کرو

جیسے میں کرتی تھی۔“

”اوہ..... مائرہ..... میں نہیں جانتا تھا کہ  
ہمارے خواب ہمیں یوں ملو ادیں گے..... لیکن تم

تو خواب میں ایک قطعی ہوتی تھیں۔“ احسن نے  
پیارے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ہاں اور پیار بھی تو تیلیوں کی طرح ہوتا ہے  
جہاں خوش ہوتا ہے اڑ کر وہیں پہنچ جاتا ہے۔“

مائرہ نے اپنی بات دہرائی۔

”جیسے میں تم تک.....“ احسن نے اس کے  
چہرے پر چھتے ہوئے کہا۔

تیلیاں قید تھیں مقدر کی  
اُن کو آزاد کر دیا میں نے  
مائرہ نے دھیرے سے کہا اور احسن نے اس  
کے ہونٹوں پر پیار کی مہر ثبت کر دی۔

☆☆☆☆



لاہور سے ارسال کردہ قربانی کے جذبے کی حقیقت بیان کرتی تحریر

## نصیب

جوانان کے نصیب میں ہوتا ہے وہ اُسے مل کر ہی رہتا ہے..... چاہے دولت ہو عزت اور شہرت ہو یا پھر رشتے.....

ہاجرہ عمران خان

ہاجرہ عمران خان

اشفاق صاحب کے گھر میں یہ سالوں سے ہوتا آ رہا تھا، ہر سال چاند رات پر بقرہ عید پر ایک یا دو بکرے گھر کے پچھلے دالان میں باندھ دیے جاتے اور انہیں اگلے روز صبح سویرے سیت ابراہیمی کی بجا آوری کے طور پر قربان کر دیا جاتا۔

ارقم نے جب سے ہوش سنبالا اس رسم کا نام قربانی سنا تھا البتہ اصل قربانی کس چیز یا کام سے وہ نہیں جانتا تھا۔

اس سال وہ اپنے مئی بابا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گاؤں جا رہا تھا تاکہ وہاں سے قربانی کا جانور لاسکے۔

”یہ کیا بات ہوئی کہ جانور لانا ہے مگر قربانی کیلئے؟“

ابا کے دماغ میں یہ کوئی نئی بات ہی نہ تھی اس کا نوجوان دماغ ہمہ تن سوچ میں گم رہا۔

ارقم کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا۔

اس نے حیرت اور گنگو میں لاہور سے گجرات تک کا سفر کیا جس کے ایک چھوٹے سے علاقے

میں اس کے چچا کا گھر تھا جس گھر کے وسیع و عریض دامن میں مٹی سے لپٹا پوتی کیے بڑے بڑے دالان تھے۔

ارقم کو اپنے بابا کے فرسٹ کزن کے اس گھر کے کھلے اور مٹی سے لپٹا پوتی کیے دالان بہت پسند آئے۔ جس میں چچا کی ماہ نور سارا دن بکریوں کے بچوں اور مرغی کے کانٹے سفید چوزوں کے ساتھ ادھر ادھر بھاگتی نظر آتی۔ وہ اور اس کا بھائی فرخان زیادہ دیر اس کھیل سے خود کو دور نہ رکھ سکے۔ بچے پالتو جانوروں سے بہت جلد مانوس ہو جاتے ہیں شاید اس کی وجہ ان کے درمیان قدر مشترک ”بے ضرر“ ہونا ہے۔

بڑے سے دالان کے دوسرے سرے پر کھری سے بندھی فرہی مائل بکری ہر وقت مضطرب اور ست سی رہتی۔ ماہ نور اکثر اسے چارہ کھلاتی اور کبھی پانی پلاتی نظر آتی۔ اتنی محبت اور توجہ دیکھ کر ارقم کا دل پھٹنے لگا۔

ماہ نور کے ادھر ادھر ہوتے ہی وہ بکری کے

”ب جاتا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اندازے لگاتا۔“

”بیچاری چھنوں کے دن تھوڑے گتے ہیں، ہر وقت سست سی ایک جگہ بیٹھی رہتی ہے۔“ ماہ نور کی بے بسی دیکھی وہ بھی بکری کو چھنوں کہنے لگا تھا۔

ایک روز آدھی رات کو ارقم کو عجیب بے چینی محسوس ہوئی تو وہ بستر سے نکل کر دالان میں آ گیا۔ کھر کے سارے مرد بستروں میں دیکھے ہوئے تھے۔

ماہ نور بے چینی سے دالان میں چکر کاٹ رہی تھی اور اندر طیلے سے چھنوں کے تکلیف میں ڈکرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ارقم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے طیلے کی طرف بڑھنا چاہا مگر ماہ نور نے

اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دالان کے دوسری طرف لے جا کر چھوڑا۔

”ادھر مت جاؤ ارقم.....“ اپنے خالص دیسی لہجے میں اس نے ارقم کو مخاطب کیا۔ اس کا ہاتھ پہلے ہی ماہ نور کے نرم لمس سے سن ہو چکا تھا اس پر وہ بے چین سا بولا۔

”کیوں؟“

”بس ویسے ہی.....“ وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ تہذیب کا شکار ہے بنانا چاہتی ہے مگر بتانا نہیں سکتی۔ ارقم اتنی سی عمر میں بھجک اور حجاب نہیں سمجھتا تھا۔

اسے شہر کی عادت تھی، وہ تو دھڑلے سے ہر بات کہہ سن لینے کا عادی تھا۔ البتہ اپنے ہاتھ پر

اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دالان کے دوسری طرف لے جا کر چھوڑا۔

”ادھر مت جاؤ ارقم.....“ اپنے خالص دیسی لہجے میں اس نے ارقم کو مخاطب کیا۔ اس کا ہاتھ پہلے ہی ماہ نور کے نرم لمس سے سن ہو چکا تھا اس پر وہ بے چین سا بولا۔

”کیوں؟“

”بس ویسے ہی.....“ وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ تہذیب کا شکار ہے بنانا چاہتی ہے مگر بتانا نہیں سکتی۔ ارقم اتنی سی عمر میں بھجک اور حجاب نہیں سمجھتا تھا۔

اسے شہر کی عادت تھی، وہ تو دھڑلے سے ہر بات کہہ سن لینے کا عادی تھا۔ البتہ اپنے ہاتھ پر



جہاں ماہ نور کے ہاتھ کالس جاوداں تھا وہاں وہ اپنا ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔

”ماہ نور، ایک طرف تو تم چھنو سے اتنی محبت دکھاتی ہو اور دوسری طرف جب وہ اتنی تکلیف میں کر رہی ہے تو بے حس بن کر کھڑی ہو، تم کچھ کرنی کیوں نہیں ہو؟“ وہ سچ سا پوچھ رہا تھا۔

”میں ادھر نہیں جاسکتی..... جھلا۔“ وہ جھجھلائی، جیسے اپنی بات سمجھانہ کئے پر الجھی گئی ہو۔

”ویسے بھی ادھر چھنو کے پاس سب ہیں۔ ماں، مامی اور تائی..... اور انہوں نے بچوں کو ادھر آنے سے منع کیا ہے۔“ ماہ نور نے ایک بار پھر ارقم کو سمجھانے کی اپنی سی سی کی۔

دالان کے کونے میں لگے بڑے سے بلب سے چھن کر آتی زرد روشنی دونوں کے وجود روشن کر رہی تھی۔ ارقم کے کانوں سے ابھی تک چھنو کی درد بھری کراہیں نکل رہی تھیں۔

”پھر تو ہمیں ابا کو جگانا چاہیے۔ میری تیری ماں اور مامی کون سی ڈاکٹر لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں چھنو کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانا پڑے گا یا ڈاکٹر ڈاکٹر گھر بلانا پڑے گا۔“ وہ مزمل کر دالان کی طرف دیکھتا۔

اس کی نظر میں ماہ نور اور گھر کی عورتوں کی عقل ماری گئی تھی۔ اس نے تیزی سے اندر کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ماہ نور ابھی تک اپنا مدعا سمجھانے میں ناکامی پر ہاتھ مسل رہی تھی۔ ایک دم سے ہی اسی لمحے طویلے کے اندر سے خوشی کی چمکاریں بلند ہوئیں۔

”مبارک ہو، پورے چار بکروٹے تولد ہوئے ہیں، دو نیانیاں، دو نیانے (دو نر اور دو مادہ)۔“ ماہ نور اس کا راستہ چھوڑ کر طویلے کے قریب جا کر کان لگا کر سننے لگی۔

ارقم کے پاؤں جیسے قہقہے سے گئے اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں ماہ نور کو دیکھا اور پھر طویلے سے اٹھتی چمکاریوں کی سمت دیکھا۔

☆.....☆.....☆  
اگلی صبح بے حد کھری اور تازی تھی۔ بقیہ رات وہ اپنی نا سنجی پر شرمندہ ہوتا رہا تھا۔ چھنو کا بھری بھری دکھایاں اور مصلحت وجود دیکھ کر ہی اسے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ چھنو ماں کے عہدے پر فائز ہونے والی ہے۔ سب سے زیادہ انیسیر سمیٹ اسے اپنی اور ماہ نور کی رات ہونے والی گفتگو پر تھی۔

ماہ نور کی اسے سمجھانے کی کوشش اور اس کی نا سنجی کی باتیں..... اسے یاد آتا تو وہ خود بخود مسکراتے لگتا۔ اس وقت وہ چھنو کی کھری کے پاس اسے پیار سے ساتھ لیٹا رہی تھی۔

چار پانی پر لگے بچا کر چھنو کا سر گود میں لیے اس کا سر سہلا رہی تھی۔ وہ قریب آیا تو اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی آنکلی سے چھنو کو خود سے الگ کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی کہ کہیں چھنو کی نیند خراب نہ ہو۔

ارقم کا ہاتھ پکڑے طویلے میں لے آئی۔ وہاں چھنو کے چار تازہ نومولود، ننھی مٹی چوڑیاں بھرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ دو بالکل کالے جن پر اکا دکا سفید دھبے پڑے تھے۔ ایک بالکل سفید دھکی ہوئی روکی کے گالوں جیسا جبکہ چوتھا آدھا کالا آدھا سفید۔

ماہ نور نے وہاں لا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ان سب کو ایک ساتھ اپنی گود میں بھرنے کی کوششوں میں مگن تھی مگر دود کے بعد ہی اس میں ناکام ہو جاتی پھر بھی سنبھل جاتی ہوئی ہنسی کے ساتھ وہ کتنی ہی دیر اس کوشش میں مصروف رہی۔

”دو نہیں پتا ہے ان میں سے تین نیانے ہیں اور ایک نیانی..... یہ جو بالکل دودھ کی طرح سفید ہے نایہ بکری ہے اور باقی تینوں بکرے۔“ وہ سبک خرام جھرنے کے بہاؤ جیسی ہنسی ہنس دی تھی۔

ارقم دلچسپی سے اس کا صیغہ چہرہ دیکھتا رہا پھر خود بھی اس کی طرح گھٹنوں کے بل اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا اور چھنو کے دو بچے اٹھا کر اپنی گود میں بھر لیے۔

”اب ٹھیک ہے؟ دو تمہارے دو میرے.....“ وہ شیریں انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ماہ نور کے سرخ ہونٹ لرزے۔ چہرے پر سرخی سی جھانکی۔

ارقم کی آنکھیں اور لہجے کی پیش نے ماہ نور کے جسم و جاں کھلسا کر رکھ دیا۔ شرم سے سر جھکا دیا۔ اس لمحے ارقم کو لگا جیسے وہ کھیت میں اگنی تازہ سلاخ سبزی ہو..... کوری کوری اور کھری ہوئی لال مولی جیسی اور اس دن کے بعد ہر دن وہ اسے مختلف چیزوں میں دکھائی دیتی۔

جب چاچی بڑے سے مٹی کے ٹکے میں پڑی مدھانی کو دھاگے کی ڈوروں سے ہلا ہلا کر مٹھن در پافت کرتی تو وہ اسے مکھن کے پیڑے میں نظر آتی۔ نرم اور گرم گرم سفید دودھیا۔ وہ تازہ ہوا کے لمس میں اسے محسوس کرتا اور بے ساختہ اس ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتا جس کو وہ اکثر بے ساختہ تھام لیتی تھی۔ وہ سر سبز کھری فصلوں میں اس کی اٹھان دیکھا کرتا۔ ”اولہ سال کی عمر میں وہ محبت کی واردات دل پر محسوس کر رہا تھا۔

نیوب ویل کے پانی کی روانی دیکھ کر وہ اس کی پال پال کرنے لگتا۔ وہ اسے ”نیچرل“ لگتی تھی بالکل قدرتی سی۔

جیسی گاؤں کی فضا ہوتی ہے بالکل ویسی اور

نیچرل سی۔ جیسے وہ زمین میں اگی ہو یا فضا سے جنمی ہو۔ کچھ بھی تھا مگر وہ خالص تھی۔ مٹی کے ٹکے جیسی جو ہر دو شالہ میں لپٹا ہوتا ہے۔

وہ بھی اپنی شرم، حجاب اور جھجک کے دو شالہ میں لپٹی ہوئی سی رہتی۔

جس وقت وہ گاؤں سے بڑے جانور لیکر قربانی کے لیے شہر جا رہے تھے بابائے پچا سے کہا۔

”چھنو کے دو بلوٹلے میری امانت ہیں تیرے پاس اور ساتھ ہی دھی رانی ماہ نور بھی۔ دو سال بعد اپنی امانتیں لینے آؤں گا۔“ ارقم اس خیال سے ہی شاد رہنے لگا کہ دو سال بعد ماہ نور کو بھی لے آئیں گے اور چھنو کے بکروٹوں کو بھی۔

وہ واقعی جھلا تھا۔ بقرہ عید آئی اور گزر گئی۔ گاؤں سے لایا جانور قربان کر دیا گیا۔ اس کے لیے یہ سب روٹین تھی۔ وہ کہاں جانتا تھا قربانی کا اصل مطلب.....؟ قربانی جب تک دل و جاں سے گزر کر ادا نہ کی جائے اپنا مفہوم واضح نہیں کرتی۔ وہ خوش تھا دو سال بعد ماہ نور شہر کی ہو جاتی۔

وہ ہمیشہ کیلئے شہر آنے والی تھی۔ وہ ہر روز اسے دیکھ سکیگا۔ محسوس کر سکے گا۔ وہ شہر آ جائے گی تو ایسا لگے گا جیسے پورا گاؤں ہجرت کر کے شہر آ بسا ہو۔ وہ لچلچھن گن کر کاٹتا رہا۔ دو سال بعد تو نہیں تین سال بعد جب وہ انیس اور اس کا بھائی..... نکیس سال کا ہوا اور ماہ نور سولہ سال کی ہوئی تو بقرہ عید سے کچھ روز قبل پچا اپنے خاندان سمیت ان کے ہاں آئے۔

ماہ نور ویسی ہی تھی ”نیچرل“ سی مگر اب وہ قدرت کا شاہکار ہو گئی تھی۔ دراز نڈ، مست خرام جال، کسی جیسی دودھیا رنگت اس پر نین نقش جیسے میٹھی لسی پر مکھن کے تیرے ٹکڑے۔ وہ اسے دیکھ کر مہبوت ہوا تھا۔ ہر وقت چھنو کے شائو بانو کے جو

تین تین سال کے ہو چکے تھے اور قربانی کے لیے شہر لائے گئے تھے، پیچھے لگی رہتی اپنے آپ اور ارد گرد سے بے نیازی۔

ارتم کو اب وہ اپنی کتابوں کے صفحات پر متحرک سی نظر آتی اور کبھی چلتی موٹر سائیکل پر اس کے کاندھوں پر پیشانی ٹکائے بیٹھی محسوس ہوتی۔ وہ اسے اور خود کو ساگ، مکھن کی نظر سے دیکھتا آپس میں گھل مل کر کیجان ہو جائیں تو مکھن کا بس ذائقہ باقی رہ جاتا ہے۔

ارتم کی خوش گمانی تب ٹوٹی جب ماہ نور کو اس کے بڑے بھائی باقر کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ عید کے بعد دونوں کا نکاح ٹھہرا دیا گیا۔ چمن کر کے سارے خواب چکنا چور ہوئے تھے۔ اس کے آنکھوں میں خوابوں کا خون اٹھل پھل کر تار ہوتا۔ اس نے ماہ نور کو اپنے علاوہ کسی کے ساتھ بھی سوچا ہی نہیں تھا۔

مگر وہ سدا کی بے یوٹھری۔ عید آنے میں ابھی دس روز باقی تھے۔ ماہ نور شانوار بانو کے گلے میں ہانبوں کا ہار ڈالے اداس سی بیٹھی رہتی۔ دونوں اب مکمل بکرے بن چکے تھے۔

اچھی دیکھ بھال سے دونوں کی صحت بھی قابل رشک ہو چکی تھی۔ ماہ نور اداس دل کے ساتھ دن رات شانوار اور بانو کی خدمت میں حاضر رہتی۔ وہ اس کی سیٹی کی آواز پہچانتے تھے۔ سیٹی کی آواز سن کر فوراً ہشاش بشاش ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے جیسے اس کے عوض انعام میں گڑ کی ڈلی کے بجائے سونے کا نوالہ مل جائے گا۔ بلاشبہ ماہ نور کو وہ اسے جان سے پیارے تھے۔

مگر ارم کو وہ کچھ خاص اچھے نہیں لگتے تھے۔ ماہ نور عید قربان ہران دونوں کی قربانی کے خیال سے

کمزور اور چپ چاپ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی شرارتیں کہیں تم ہی ہو چکی تھیں۔ جیسے مفت اقلیم کا خزانہ کھو چکی ہو۔ ارم سے ماہ نور کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ چاند پہلی تاریخوں سے بڑا اور روشن ہو رہا تھا ویسے ویسے ماہ نور کا دل جیسے کوئی مٹھی میں دبوج رہا تھا۔

چاند کو روز بروز روشن تر ہوتا دیکھ کر اس کی اپنی رنگت ماند پڑ رہی تھی۔ آٹھویں روز آنکھوں میں یاسیت سی بھر کر وہ شانوار بانو کو دیکھ رہی تھی جب ارم سے رہانہ گیا وہ اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

”اگر تم ان کی جدائی پر اتنی دھی ہو تو میں یہ قربانی روک دوں گا۔“

ارتم لہجے کی ترشی پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ماہ نور نے افسردہ سا سر اٹھا کر ارم کو دیکھا۔

”جب شانوار بانو پیدا ہوئے تھے اسی وقت تایا اب نے ان کی قربانی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک بار جس چیز کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا سوچ لیا جائے پھر وہ چیز اس کی امانت ہوتی ہے اور امانت جتنی دیر مرضی اپنے پاس رکھ لیں اسے لوٹانا ہی پڑتا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہم ان کی جگہ بہتر اور بڑے جانور قربان کر دیں گے۔“

ارتم اپنی بات پر ڈنڈا رہا۔ وہ کسی صورت ماہ نور کو دیکھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”آپ کو پتا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیسے پتا چلایا کہ اللہ تعالیٰ نے خواب میں ان سے کس چیز کی قربانی مانگی ہے؟“ ماہ نور سر جھکائے پر غم لہجے میں بولی۔

”نہیں“ ارم نے اپنی اب تک کی زندگی میں کبھی اتنی باریکی سے مذہب اور اس سے متعلق چیزوں کو نہیں سوچا تھا اور نہ ہی ضرورت محسوس کی

اس کے بابا بچپن سے لیکر اب تک عید پر ماہ نور ان کرتے آئے تھے۔ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

”یہ چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے بڑی شے اس کی قربانی مانگی گئی۔ تو انہوں نے اپنا سب سے پیارا بیٹا اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی نہائی اسی لیے ہمارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں رہا۔ اب تک ہم میں سے ہر ایک اپنی پسندیدہ چیز ان کی راہ میں قربان کرنے کا حوصلہ پیدا نہ کر لے۔“

عید الفطرہ تو ایک نشانی ہے جو ہمیں ہمیشہ اپنے رب کی طرف لوٹ جانے پر مائل کرتی ہے۔ ہمیں اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کی سب سے عزیز شے اپنے مالک کی مرضی پر قربان کرنی چاہیے۔ یہی عشق ہے۔ بازار سے جانور لا کر اللہ کی راہ میں قربان کر دینے سے قربانی کی رسم تو پوری ہو جاتی ہے مگر عشق کا امتحان ادھر ہوتا ہے جہاں اس انسان سے گزر رہی ہوں۔ اپنا حوصلہ آزمایا ہی ہے۔ اللہ سے اپنی محبت کی آزمائش کی پیمائش ان ہی ہوں۔ اور آپ کو پتا ہے کہ اس قربانی کے لیے اللہ ہمیں بہت بڑے انعام سے نوازتا ہے۔ ابھی ہماری قربانی کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اللہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ باندہ کر دیے اور قیامت تک ہماری نمازوں میں اللہ علیہ السلام کا ذکر لازم و ملزوم کر دیا۔ اللہ اپنی رحمت سے قربانی کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔“ وہ اپنے

”تو پھر تم اتنی مغصوم کیوں ہو؟“ ارم نے ہاتھ باندھ کر پوچھا۔ وہ قربانی کے اس فلسفے سے ناواقف تھا۔ ایک چیز آپ کو پسند ہے پھر اسے جدا کر دینے سے بڑی سزا کیا

وہ سمجھ نہیں پاتا تھا۔

”اپنے افسردہ ہونے پر مجھے اختیار نہیں۔ مگر قربانی کی اس راہ پر آپ میرے قدم ڈنگاتے نہیں دیکھیں گے۔ بابا نے پچھلے سال ہی شانوار بانو کو یہاں شہر بھیجے کا ارادہ کر لیا تھا مگر مجھے افسردہ دیکھ کر ایک سال مزید انتظار کا فیصلہ کر لیا۔ اس سال بھی شاید میں ہمت جتنا نہ سکتی مگر پھر حوصلہ کر ہی لیا۔ کہ اگر دیر کر دی تو کہیں میری میت میں فتور نہ بھر جائے۔ کبھی کبھی خود کو بھی آزمائش کی کسوٹی پر پرکھنا پڑتا ہے۔“

بقرب عید پر قربانی سے پہلے اور بعد میں بھی وہ نہ روئی اور نہ ہی شور کیا۔ اس نے بڑے صبر سے شانوار اور بانو کو اپنے رب ذوالجلال کے حضور قربان کیا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا مگر اب شانوار بانو کی جگہ خالی تھی۔ وقت پر چارہ کھلانے کی فکر تھی اور نہ پانی پلانے کا خیال۔ جس تسلے میں وہ انہیں پانی پلاتی تھی وہ سوکھا پڑا تھا۔ ارم کو محسوس ہوتا تھا جیسے سب کچھ ادھورا سا رہ گیا ہے۔

”کبھی ایک لمحہ وہ اس کے لیے بھی اداس ہو؟“ ارم کا دل چاہتا مگر وہ جیسی بے نیاز آئی ویسی ہی واپس چلی گئی تھی۔ ارم کا دل بھی صحن میں لگے کھونٹے کی طرح خالی ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

دھان پان سی لڑکی کتنے آرام سے اسے قربانی کا فلسفہ سکھا چکی تھی۔ وہی طور پر وہ اس بات کو قبول نہیں کر سکا تھا مگر اس نے خود میں عجب تبدیلی دیکھی تھی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنے ارد گرد لوگوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنے لگا تھا۔ اس کا کلاس فیلو غریب تھا اسے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ تو ارم نے اسے اپنی سب سے قیمتی اور فیورٹ شرٹ گفٹ کر دی۔ کام والی ماسی کی بیٹی کی شادی میں اپنی پاکٹ منی سے مدد کی۔ وہ چپ چاپ خاموشی سے سرتاپا



# آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں !!

ایسے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہو جائیے۔



یہ ہارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے.....  
نو دو کمونائیے، اپنے قلم سے.....  
اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہوں نے اور لرزاؤں نے  
والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان  
واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان



واقعات و حادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔  
لو! پلک سنوار کر اسے کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔  
نہ پھر قلم اٹھائیے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز  
نہ کہ کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمائیے۔

ماہنامہ سچی کہانیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تشریف لے کر اپنے ہمارے

II C-88 - خیابان جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

بدل چکا تھا۔

اس کا بھائی اسے جان سے پیارا تھا۔ وہ اس کے لیے اتنی سی قربانی نہیں دے سکتا؟ اب وہ پورے دل سے چاہتا تھا کہ ماہ نور اس کے بھائی کی زندگی کا حصہ بن جائے۔ وہ پورے دل سے اس دن کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو اس کیفیت میں محسوس کیا جب ماہ نور شانو اور یانو کو عید قرباں پر قربان کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس وقت وہ خود کو مغموم ہونے سے نہیں بچا سکتی تھی اور آج ارم اپنے دل کو افسردہ ہونے سے روک نہیں پارہا تھا۔ وہ تیار تھا، اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اپنے بھائی کے نام کر دینے کو۔ . . . . برضا . . . . . بخوشی . . . . . ہنستے ہنستے۔ اسے قربانی دینے کا ڈھنگ آچکا تھا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ باقر نے تعلیم مکمل کرنے کے لیے دو سال کا عرصہ مانگا تھا۔ جو کہ اب ختم ہو رہا تھا۔ بچا چچی زیادہ دیر تک بیٹی کو گھر نہیں بٹھا سکتے تھے۔ وہاں رواج تھا بیٹیوں کو جلد از جلد پیادیں سدھارنے کا۔ مگر جیسے جیسے شادی کا وقت قریب آ رہا تھا باقر کے ہوش اڑ رہے تھے۔ پھر ایک روز اچانک وہ اپنے ساتھ اپنی کلاس فیلو شہینا کو لیکر گھر آ گیا۔ وہ شہینا سے شادی کا وعدہ کر چکا تھا۔ وہ اس کی پسند تھی۔

ماں باپ پر قیامت ٹوٹی بہت سمجھایا، زور دیا مگر اولاد کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے۔ باقر سے ماپوس ہو کر باپ نے ارم کے سامنے دست سوال رکھ چھوڑا۔ وہ کب انکار کر سکتا تھا جب قدرت سب کچھ ٹھیک کر رہی تھی تو اسے کیا ضرورت تھی بگاڑ پیدا کرنے کی۔

رب اپنے بندوں سے اتنا پیار کرتا ہے کہ اپنے بندوں کے لیے دی گئی قربانی پر بھی خوش ہوتا ہے۔

اور اسے رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ سچ کہا ہے کہ رب کو راضی کرنا ہو تو اس کے بندوں کو راضی کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ رب بندے کا خود پر کیا مان کبھی نہیں توڑتا۔ ارم نے سجدہ شکر بجالا کر دل میں سوچا۔

آج وہ اس کی زندگی میں شریک حیات حیثیت سے شامل ہو کر اس کے سامنے تھی۔ اتنی معصوم اور پور پور اس کی محبت میں بھیگی ہوئی سی۔ "چھنو کو اللہ نے پھر سے دنیا نے اور دو نیا نیا دی ہیں۔ میں نے ان کا نام شانو یاٹو۔ شاڈو یاٹو رکھا ہے۔" ماہ نور خوشی سے ہنسی تھی۔ ارم کا کھلتا ہوا چہرہ ادیکھ رہا تھا۔۔۔ "تم نے سچ کہا تھا۔ . . اللہ اپنی راہ میں قربان کی گئی نعمتوں کا بڑا اجر اور بدلہ دیتا ہے" سرشار اعتراف کیا۔

"ہے نا؟ جیسے مجھے نئے شانو، یاٹو دیکر اللہ کرم کر دیا" دہن بنی وہ دھور شوق سے پوچھتی اور دل میں اترتی محسوس ہوئی "اس کا جواب تو میرے سامنے بیٹھا ہے" نے اس کا ہاتھ تمام کر محبت سے سرشار لہجے میں کہا "کیا مطلب؟" اس نے آنکھیں پٹپٹائیں وہ بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ بیٹھا۔ "اپنی اداؤں سے کیا آج ہی مارڈالو گی؟ میں تو قطرہ قطرہ زندگی اس اپنے بدن میں اتارنا چاہتا ہوں تاکہ مکمل سکوں" وہ شوخ ہوا۔

"کیا؟" وہ نا سنجی سے اسے دیکھنے لگی۔ "ساری عمر پڑی ہے سمجھانے کے لیے" شوخ ہوا

زندگی ان کی ٹوک جھوک پر کلکلا کر مسکرائی گئی۔

اسلام آباد سے ارسال کردہ انتہائی مزاحیہ تحریر

## بہو کی کتھا

ساس کے ظلم اور سسرال کے

کاموں نے بے چاری کو ادھ موا کر دیا تھا

عظمیٰ شکور

میں اُن دنوں ایف اے میں تھی جب گھر میں میری شادی کے متعلق خبریں اڑنی اڑنی مجھے ملیں۔ اک لمحے کو حیرت ہوئی، کیونکہ مجھے تو ابھی بہت آگے پڑھنا تھا بلکہ بہت بہت پڑھنا تھا۔ ”یہ شادی..... اُف.....“ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اگلے دن کالج میں بھی بوریت رہی سارا دن شادی کی بات ذہن میں گھومتی رہی۔ میری دوست ماہا بولی۔ ”یار شکر کر تیری شادی ہو رہی ہے جان چھوٹ جائے گی پڑھائی سے.....“ ”حد ہے ماہا ویسے تم ایسا سوچتی ہو ذفر.....“ مجھے اُس کی اس بات پر غصہ آ گیا۔ اور پھر اگلے چند روز بعد ہی مجھے فراز کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔ کچھ عجیب سا احساس تھا یہ نہیں کچھ الگ سا لگ رہا تھا۔ میں نے تو نہیں دیکھا تک نہ تھا جس سے مجھے منسوب کر دیا گیا تھا اُن کی تصویر دکھائی تھی باجی نے.....

گزرتے دنوں میں وہ کچھ اپنے سے لگنے لگے تھے..... اور پھر چند مہینوں میں میں نے ایف اے کے پیپرز دے دیے۔ ادھر فراز صاحب کی اماں میری یاد ستانے لگی۔ ”اُف اس قدر محبت ساس صاحبہ کی.....“ جاواں..... ”بولتیں ہیں چاند کی چودہ تاریخ دے دو شادی کی اور منہ تو میٹھا کر کے ہی جاؤں گی۔ اب اُن کون سمجھائے کہ اس موٹا پے میں مٹھائی کھا لے جسم پر کیا بیٹے گی۔“ خیر بابا تو جیسے تیار بیٹھے تھے بولے۔ ”بہن جیسے آپ کہو۔“ سر صاحب تو جیسے وقت منہ میں الا بجی دبائے رہتے تھے۔ کئی بار گمان گزرا گویا کہ قوت گویائی سے محروم ہیں..... نہیں..... ساس صاحبہ بولنے کا موقع ہی کب دیتے کہ معصوم سر کچھ بولتے۔ ایک دیور اور ایک معصوم سی زندگی ہمراہ تھے شادی کی تاریخ لینے کو..... مطلب مجھے عمر قید سنا دی گئی تھی..... شادی

”اُف تھرڈ ایئر میں جانے کا خواب، خواب ہی رہ گیا۔“

میرے ارمان دل کے دل میں ہی رہ گئے۔

آنسو بھائی چاند کی چودہ کو..... چودہویں کا چاند بن کر فراز کے آنگن میں اتر آئی۔

محبوبوں کا ایک بستا سمندر تھا میرے گرد.....

ساس نظر اتار رہی تھیں اور فراز نظروں ہی نظروں

میں دل میں اُتارے جا رہے تھے۔ دیور پھولوں

کے گل دستے لیے مسکرا رہا تھا۔ اور نند اتر اتر کر اپنی

سہیلیوں سے میرا تعارف کروا رہی تھی۔

”دیکھو تو میری چاندی بھائی.....“

”مر نہ جاؤں کہیں.....“ دل نے سرگوشی کی۔

”ارے نہیں مجھے جینا ہے..... بہت جینا ہے.....“ خود کو سمجھایا میں نے..... دوسن کے لپٹنے



سمیت مجھے سمیٹ ساٹ کر پھولوں سے لدے  
کمرے میں پہنچا دیا..... دل اُس پر دھڑکا کہ  
قیامت کر دی..... جیسے پسلیوں سے باہر نکلنے کو بے  
چین ہو۔

کچھ عجیب سے احساسات لیے میں محترم  
جناب فراز صاحب کا انتظار کرنے لگی۔ دھرتیوں کو  
سکون کا مشورہ دے کر میں چپ چاپ بیٹھ گئی۔  
دروازے کی آہٹ پر جو نظریں اٹھائیں تو  
محترم خراماں خراماں اندر آتے دکھائی دیے۔ کالی  
شیر والی میں بالکل قائد اعظم دیکھتے تھے..... بارعب  
سے مگر آنکھوں میں شرارت نے انہیں عمران ہاشمی  
بنادیا تھا۔

خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے نکل کر ماتھے پر پسینے سے چمکنے لگے۔  
 بیڈ پر براجمان ہوئے جیسے کوئی جلے سے خطاب کرنا ہو کچھ ایسے ہی گلہ کھنا کر بولے۔  
 ”آداب.....“

اور پھر جو امن نامہ انہوں نے پیش کیا مت  
پوچھیں۔

”میری اماں کی عزت کرنا آپ‘ وہ بہت اچھی ہیں آپ کو بہت چاہتی ہیں وغیرہ وغیرہ.....“

”اے بھائی بھائی کی بہنوں کی تعریفوں کے پل.....

”اے ربا کتنے جاواں میں.....“

اچھا تو مجھے خادمہ بن کر یہاں رہنا ہو گا تو اسے کہتے ہیں شادی اوہ اب کبھی میں ..... میں سوچ رہی تھی جس وقت رومانٹک ماحول، خواب، محبتیں، پاپاتیں جیسے وقت نے سب بدل دیا تھا مگر .....  
نئے بس چند دن .....

ایک صبح ماس صاحبہ..... کمرے میں تشریف لائیں۔ آنکھوں میں چمکنے والی محبت کی جگہ آج شعلہ

برساتی آنکھیں میرے وجود کے آر پار ہو رہی  
تھیں۔

”بہت ہو گئے عیش و آرام گھر کی ذمہ داریاں  
سنہا الواب.....“

”جی۔۔۔۔۔ حج۔۔۔۔۔ جی جی۔۔۔۔۔“

”کیا جی جی لگا رکھی ہے۔“ وہ گرجیں..... جبکہ  
آسمان تو صبح صاف تھا اب جانے کیا ہوا۔

”جو حکم امی جی.....“ میں اس قدر ہی کہہ سکی  
کانیتے کانیتے.....

”ٹھجے آؤ اور ناشتہ بناؤ..... سورج سر پر آگیا اور مہارانی کی آنکھیں ہی نہیں چمکتیں۔“ وہ بولیں۔  
دھرمیری جان کانپ کانپ کر پرواز ہونے لگی۔  
خدا خدا کر کے وہ گئیں تو سانس بحال ہوئے.....

”اے اللہ..... یہ کیا..... یہ شادی..... او  
چھا..... نہیں نہیں..... میں نے شیم آراء کی طرح  
کانوں پر ہاتھ رکھے اور چلانے لگی۔“

سرتاج نے جو میری یہ حالت دیکھی تو لمحہ بھر کے  
بیٹھان ہوئے مگر اگلے ہی لمحے اماں کی آواز انہیں  
میں طرف متوجہ کر گئی۔

”فراز نیچے آؤ کب تک بیوی کے بغل میں  
 ہٹے رہو گے۔ حد ہو گئی بس کرو اب چھٹیاں کام پر  
 ماؤ.....“ ساس بولیں۔

”جی اماں جان آیا۔“ فرارز بولے۔  
ایسے بھاگے ہیں جیسے کوئی نیا آئین پاس ہے اور سائن کرنے کو جانا ہے۔  
ماتھے پر ہاتھ مار کر میں وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔

”مگر کہاں.....“ ڈیزر ساسواں پھر چلائیں۔  
 ”بہو کیا تمہیں فوج لینے آئے گی جلدی آؤ۔“  
 ”جو حکم..... جی بہتر..... بس آگئی۔“  
 اہلاناٹ میں جانے میں کیا کیا بول رہی تھی۔

”فراز میں کہے دیتی ہوں کل سے اپنی لاڈلی کو  
بھدا دینا کہ صبح کا ناشتہ وہ بنائے..... اور باقی گھر  
لے کاموں میں بھی ہاتھ بٹائے..... ارے ماہ نور  
لے پیڑ ہوئے کو میں بچی پڑھ نہیں پاتی۔ گھر کے  
بائوں کی زیادتی کی وجہ سے.....“ اماں جی نے  
انہیں رچھاڑ دی۔

میں دم بخود سنتی چلی گئی..... اور جب میں پڑھنا پانہی تھی جب ساسو ماں کو خیال نہ آیا..... اب خود لی بیٹی کو کپڑے بنانے چلی ہیں میں اندر ہی اندر رنج و غم اب کھا رہی تھی..... اتنے میں فراز ناشتے کی ٹیبل سے اندر اٹھ کر ہوئے۔ شاید ناشتے کا فرض ادا کر چکے تھے اور میں اُس وقت سے ہوش بنی سب کے منہ اب رہی تھی۔

بہرے منہ پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر ساس گویا

”سب برتن سمیٹ لو اور ماسی سے دھلو اور  
ایک کپ چائے میرے کمرے میں لے آنا۔“  
دعا کرتے ہوئے بولیں۔

”جیج..... جی جی.....“ میں سر ہلاتے ہوئے

”ان کتھے جاواں.....“ میں اُلجھ سی گئی۔ اتنے  
 کام اور میں اکیلے جان ہائے اور بار.....  
 ”ناروکی.....“ اماں جان پیچھے کومریں۔

صورت انہیں نہ دکھائی تھی۔  
آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ہتھیلی سے رگڑ  
رگڑ کر صاف کیا اور کچن کی طرف چل دی۔  
اتنے کام کرتی تو میں فوت ہی ہو جاؤں گی.....

اور اچانک سے ہی خالہ اماں کا چہرہ پیری نظر میں گھوم گیا ہائے کس قدر خوفناک لگ رہی تھیں وہ مرنے کے بعد..... نہیں نہیں مجھے نہیں مرنا..... سوچتے سوچتے چکرا گئی اور زمین پر آ رہی مگر جانے فراز وہاں کیسے پہنچ گئے اور اگلے ہی لمحے میں اُن کی ہاتھوں میں جھول گئی.....

”ہائے مجھے ہوش میں نہیں آنا.....“  
 فراز مجھ پر جھکے بولے جا رہے تھے۔  
 ”ٹوٹی، ٹوٹی ہوش میں آؤ ہوا کیا.....“  
 ٹوٹی.....“

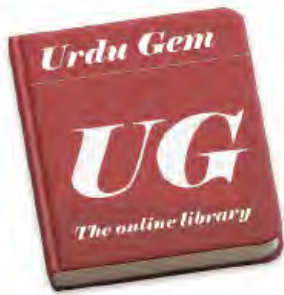
اور ان کی میٹھی آواز کے سحر میں گم میں ہواؤں  
میں اڑ رہی تھی دل ضد کیے جاتا تھا کہ یہ لمحے تھم  
جائیں۔

اور جیسے ہی ساس کی ٹھیکسی آواز کانوں میں  
پڑی میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔  
”اے لڑکی اگر محبتوں کے سب سین کھلے عام  
ہو چکے ہوں تو گھر کے کام کی طرف بھی توجہ دیں۔“  
وہ بولیں۔

فراز نے مجھے خود سے یوں الگ کیا کہ جیسے مجھے کہیں سے بھاگ کر لائے ہوں..... حد ہے ویسے..... اب ایسا بھی کیا ڈرنا ماں سے..... کہ پوری کونہ چپکا کیں خود کے ساتھ..... اب کیا وہ مجھے تسلی بھی نہ دیتے..... بس مجھے نہیں پتہ..... میں سوئے جاتی اور ساتھ ساتھ کام نہ رہا ہی تھی۔

اور پھر تو جیسے یہ روزمرہ کے کام عادت ہی بن گئے۔  
ہاں مگر کبھی کبھی فراز پریشان کرتے کہ میں





# UrduGem.com

## URDU KA KHAZAANA



انہیں نام نہیں دیتی مگر پھر میں انہیں ماں کی عظمت پر لمبی تقریر سناتی تو مسکرانے لگتے اور پیار سے کہتے۔

اوسان خطا کر دیے۔

... میں مکر اہٹ دہاتے ہوئے بولے۔

دن بھر کے کام تھا کہ رکھ دیتے ہیں مگر پھر بھی سب کرنا پڑتا ہے ماسی ہوں میں ماسی..... میں غصے میں سوچتے ہوئے سوئی۔



## تعارف

## فریدہ جاوید فری



پیارے منزہ سہام میں اپنا تعارف بھیج رہی ہوں بچپن ہی سے مجھے مطالعہ کا شوق تھا۔ بچوں کی کتابیں شوق سے پڑھتی تھی کچی کہانیاں کی دیوانی

ہوں بہت عرصے سے اس کو پڑھ رہی ہوں کہاں صرف ایک خالہ خیرن ہی لکھی ہے مگر شاعری شائع ہوئی ہے شادی جلدی ہو گئی صرف اے کر سکی پہلے بچے چھوٹے جب ذرا بڑے ہوئے تو رسائل لکھنا شروع کیا۔ کچی کہانیاں، دو شیزہ پاکیزہ اور ریشم میں بہت لکھا اور لکھ رہی ہوں شاعری خدا داد صلاحیت ہے مگر میں نے نامور شعراء اصلاح لی ہے راشد ترین اور محمود ارشد صاحب نے مجھے شاعری کی اصلاح کی ہے میرے مجموعے شاعری شائع ہوئے پانچواں موسم اور محبت یاد رکھو! دونوں مجموعوں کو بہت پذیرائی منزہ سہام اور پاکیزہ کی ایڈیٹر انصاف آج کل کے فرحت آراء

ملاہر بھائی صاحب ریشم کی ایڈیٹر بھری رہا ہے ان سب کی بہت بڑی فین ہوں اللہ ان سب کو خوش رکھے آمین میرا ایک ناول بار بار ہو جائے بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ ناول موسم کی پہلی بارش زیر طبع ہے۔ ان میں فیض احمد فیض، غالب، راشد ترین، یاسر آفتاب خاں اور ارشد محمود ارشد کی ان سے بے حد متاثر ہوں۔ رائٹرز میں عمیرہ، آصف، زہت جیوں اور طیبہ نصر مغل، آصف سنیل کمال اور عقیدہ حق اور سباس کی فری میں متاثر کرتی ہیں۔

پہلی پبلک ڈارک بلیو پسند ہے۔ پرفیوم پانی ہوں خوشبوؤں میں بسا رہنا پسند ہے۔ انباریں بارش سردیاں اور کوہسار ملکہ مری لکھانے میں مٹن پلاؤ اور ترکی کو فتنے لکھاتی ہوں پسندیدہ ہستی حضرت محمد نام کی پابند ہوں اللہ تعالیٰ منظور فرمائے اب ڈپریشن ہو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی اور انک ڈرائیو پر جاتی ہوں لکھنے میں میرا مال نہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔ مجھے دس ایوارڈ اور تین شوقیٹ لے ایوارڈ مجھے کھاریاں سے عبدالکلیم شرر ملا اچھی سے چار ریشم ڈائجسٹ سے اور آباد سے میرا پیغام سب کو یہی ہے کہ میں پیار محبت سے مل جل کر رہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی حفظ و امان میں رکھے سے تین بھائی ہیں ایک بھائی رائٹر تین ہیں پرس افضل شاہین جو کہ بہت اور بھائی پروین افضل جو کہ مجھے بہت

## پرتم مانویا نامانو

☆☆☆

گزرے دنوں کے ہر پرل میں ہم نے تم کو پہلے سے زیادہ چاہا ہم کو ہر وہ شے پیاری جس سے تمہارا کچھ رشتہ تھا ہم نے ان گزرے لمحوں میں نہ صرف یہ..... کہ..... ان چیزوں سے جن سے تم وابستہ رہی ہو بلکہ ان چیزوں کی شہادت رکھنے والی سب چیزوں سے "خود سے بڑھ کر پیار کیا ہے" اب خود سوچو اب بھی کوئی ہم کو گر "پاگل" نہ کہے تو اور کہے کیا؟

☆☆☆

وجہی ثانی

☆☆☆.....☆☆☆



## خناس

جب دماغوں میں خناس بھر جائے تو زمین تنگ ہو جاتی ہے اس کے دماغ میں بھی خناس تھا اسی لیے اس نے اپنی خوبصورتی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی.....

## حنابشری

جب عقل سوچ کی پاسبان نہ رہے تو انسانیت، درندگی اور حیوانیت کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے ہر باڑھیلا نگ کر آزاد ہو جاتی ہے اور ایسی منہ زور ہونے لگتی ہے کہ انسان کے دل سے مثبت پہلو چھین لیا جاتا ہے اور اُسے اُس کی منفی سوچ کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ.....

”جاؤ جو کرنا چاہتے ہو کرو تم آزاد ہو..... جہاں تک جاسکتے ہو جاؤ..... مگر اسی میں جتنا گر سکتے ہو گر جاؤ.....“ مگر پھر اُس کی حد شروع ہوتی ہے سزا دینے کی حد انصاف کرنے کی حد وہ اپنے معاملات میں مطلق العنانیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہر شے جتنی مرضی اکڑتی رہے مگر اُس مالک کے آگے جھک جاتی ہے۔ اور پھر اُس کی حد سے باہر نہیں نکل سکتی۔ وہ برداشت کرتا ہے اور کیا کمال برداشت کرتا ہے۔ اور پھر دبوچ لیتا ہے زندگی تماشہ بن جاتی ہے۔ نشانِ عبرت کے لیے تاکہ روحمیں کا نہیں دل لرزیں آنکھیں پتھر نہیں اور عقل سر تسلیم خم کرے۔ اُس قانون کے آگے

جس کا قانون آخر ہے۔ اُس کی حدود کو پار کر کے وہ انسانیت کی محراج سے گرے گا مگر یہ نہیں کہ جیوانوں یا درندوں کی فہرست میں شامل کر دیا جائے گا۔ ہرگز نہیں..... قطعی نہیں..... بالکل بھی نہیں..... وہ مردود قرار دیا جائے گا۔ انہیں ذلت و رسوائی کی علامت بنا دیا جائے گا کہ لوگ انہیں دیکھیں اُن کی نافرمانی سے نفرت کریں۔ اُن تھوکیں اور اُن پر لعن طعن کریں۔

میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ آپ سے کے لیے منفرد اور خاص الخاص موضوع ڈھونڈ لائوں میں دعویٰ کرتی ہوں کہ اس بار کا موضوع آپ کو بالکل ایسے ہی چوٹا کر رکھ دے گا جو طرح میں چوٹی۔ حیرتوں کے سمندر میں ڈبو دے گا اور عقل کو ماؤف کر دے گا۔ حیرانی و پریشانی کسی آسیب کی طرح آپ کے پیچھے پڑ جائے گی جیسے میرے ساتھ ہوا.....

”عام رائے تو یہی ہے کہ اس دنیا میں انتہاؤں کو ہمیشہ مرد چھوٹا ہے حدود کو توڑتا ہے

اپنی دوائی بے حسی اور بے رحمی کی کھال پہن کر کسی دندے کی طرح دندنا تا پھرتا ہے اور یہ باتیں غلط ہی نہیں..... جب خدائی کا دعویٰ ہوا تو مرد آگے ہاتھ جوئے مدعیانِ نبوت نے دعویٰ کیا تو پہلی آواز مرد کی ہی تھی مگر کہ سگنی اور آخری حد تک پہنچنا بانا مرد کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی ذہن اُس کی انتہاؤں کے مادی ہو چکے ہیں۔ مگر یہی فتنہ گری اگر صنفِ نازک کی ذات پر پا کرے تو قلب خاموش نہیں رہتا۔ اعصاب سن ہو جاتے ہیں اور آنکھوں سے پریشانی و حیرانی عیاں ہونے لگتی ہے۔ ذہن چاہتے دنا چاہتے بھی ان حقائق پر غور کرنے لگتا ہے کہ آخر ایسی کیا افتاد نگاہانی ٹوٹ پڑی کہ بنت

حوا باغی و سرکش ہو گئی کہ مردوں کو بھی مات دے گئی۔

یونیورسٹی کی طرف سے سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ کے گروپ کو سروے سونا گیا۔ (Eye Witness) کے لیے کسی دارالامان یا نفسیاتی اسپتال کا وزٹ ضروری تھا۔ بہت سے اسٹوڈنٹس نے ٹائم کی بچت اور ان نفسیاتی مجرموں سے ملاقات سے بچنے کے لیے ٹیڑھا راستہ نکالا۔ ویسے بھی پاکستانی قوم کے لیے سینڈوے نکالنا تو بائیس ہاتھ کا کام ہے۔ انہوں نے فرضی سروے تیار کیے اور نہایت اطمینان سے حوالہ ڈیپارٹمنٹ کر کے بری الذمہ ہو گئے۔ مگر میری یہ پیچہ نہیں تھی۔ میں نے ارادہ کر رکھا تھا کہ صرف سچ کہانی



ہوگی۔ سو اس عزم کے تحت شہر کے معروف نفسیاتی اسپتال جانا ہوا۔ میرا گروپ چونکہ چھ لڑکیوں پر مشتمل تھا اس لیے ہم نے زمانہ وارڈ کے لیے اجازت طلب کی۔ جو ہمیں مل گئی مگر احتیاطی تدابیر بھی بتائی گئیں کہ اگر کوئی مریض حملہ آور ہو تو فوراً گارڈ کی مدد طلب کی جائے۔ کیونکہ اس میں بہت سی خواتین سزا یافتہ ہیں بس عدالت کی طرف سے علاج کے لیے داخل ہیں۔

میری ملاقات جس عورت سے کرائی گئی وہ تقریباً 35 سال کی تھی۔ بد حال میں بھی اُس کا حسن مخفی نہ تھا۔ گوری رنگت، کھڑی بال، وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ کسی سنگ تراش کی تراشی ہوئی مورتی کا گمان ہونے لگتا تھا۔ خوبصورت آنکھوں کے نیچے حلقوں نے حسن چشم کو ماند تو کیا تھا مگر احساس ہوتا تھا کہ کبھی وہ آنکھیں جمیل جیسی گہری ہوں گی۔ میں اُس کے حسن سے اتنی متاثر تھی تو سوچے مردوں کے لیے اُس کا حسن کس قدر سحر انگیز ہوگا۔

”آپ کا نام؟“ متعدد بار سوال کرنے پر بھی جواب نہ دیا۔ وہ اپنی ہی دھن میں مگن تھی بھی اپنے گھوملہ نمبالوں میں اپنی لمبی غریبی انگلیاں گھسا کر شدت سے کھانے لگتی۔ کبھی تالی بجا کر رونے لگتی تھی یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ مکمل مجنون نہیں تھی۔ مجھے اسپتال کے عملے سے یہ معلومات ملیں تھیں کہ وہ اس قابل تھی کہ اپنی کھانا ساسکی تھی مگر شاید وہ کسی اور ہی دنیا میں تھی۔ جو اس کا ہماری دنیا سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ میری آواز سن کر یوں خلاؤں میں گھور رہی تھی جیسے بہری ہو۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ مجھے اب اُس کی حالت پر رحم آ گیا تھا۔

بڑھایا تو اُس نے جلائی انداز میں جھٹک دیا۔ ”ہٹ..... دور ہٹ..... ورنہ مار ڈالوں گی تجھے بھی.....“ مجھے پہلے ہی مطلع کیا جا چکا تھا کہ وہ مریضہ قتل کے جرم میں سزا یافتہ ہے اُس کی ذہنی حالت بہت ابتر تھی اس لیے اُسے علاج کے لیے یہاں لانا پڑا۔

”تجھے بھی مار ڈالوں گی۔“ وہ ابھی تک بڑبڑا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے دردنگی و وحشت چمکنے لگی تو مجھے اُس سے خوف محسوس ہوا۔

”جس پینس کی؟“ مجھے اُسے ٹریک پر لانا تھا۔ اور اس کے لیے سو تو کیا ہزار جتن بھی کرنا منظور تھے مجھے اُس کے کیس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

”ہاں..... ہاں.....!“ پڑی زدہ ہونٹ جو چند ثانیوں پہلے باہم ملے ہوئے تھے ان میں شکاف پڑا۔ وہ شدت سے چلائی اور ڈبہ میرے ہاتھ سے کھینچ کر اُس کو نوچنے کھسکے گئی۔ میں نے اسرار لگا کر اُسے نہایت شائستگی سے دیا مگر میری شائستگی کو اُس کی حوانیت نے اٹھا کر دور مارا۔ وہ وحشیوں کی طرح ایک ہی سانس میں جوس پی گئی۔ اُس کی حرکات و سکنات میرے اوسان خطا کر گئی تھی۔ مجھے لگا میں نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ میں نے ایک نظر جوس کے ڈبے پر ڈالی۔ مجھے لگا کچھ دیر بعد میرا بھی یہی حال ہوگا کہ وہ مجھے بھی یوں بھنبھوڑ کر رکھ دے گی۔ اس تصور سے میرا وجود کپکپا گیا۔ میرے ارادے کمزور پڑنے لگے تو مجھے اپنا فیصلہ غلط لگا۔ وہ اسٹوڈنٹس شاید ٹھیک رہے تھے جنہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالا اور کام نیا کر یہ جاوہر جا.....

خوف بھرے خیالات نے دل پر قبضہ جمایا تو دماغ نے واپسی کے قصد کا عندیہ دے ڈالا۔ میں نے اپنا فولڈر بیک اور دیگر اشیاء سمیٹی اور جانے کی گئی کہ دیکھی اور نقاہت سے بھرپور آواز بنے۔ بے قدموں کو روک دیا۔

”اور جوس..... ہے تیرے پاس.....!“ اب اُس کے چہرے پر وحشت کی جگہ پھینکی سی طراہٹ تھی کھنکھی ہوئی سی.....

”جی..... جی.....“ میں فوراً بولی۔ میں نے بیک میں ایک اضافی جوس رکھا ہوا تھا وہ نکال کر اُس کی جانب بڑھایا تو اُس نے ہاتھ سے میری طرف دھکیلا۔

”وہ لگنا..... وہ.....“ وہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

”کیا؟“ میں نا سمجھی سے بولی۔

”وہ سفید پائپ..... لگا کر دے نا.....!“ وہ بولی۔

میں نے سرعت سے اسرار لگا کر دیا تو وہ یوں بیٹھ گئی جیسے بہت دنوں بعد صحت بخش مشروب پیا ہو۔ وہ میری طرف مسکرا کر دیکھنے لگی۔

”اب یوں جیسے وہ اپنے حواسوں میں لوٹ آئی.....“

مجھے لگا اب وہ بات کرنے کے قابل ہے۔

”آپ کا نام؟“

”نذر.....!“

”آپ نے کس جرم میں سزا پائی ہے؟“ میں نے وضوح کی طرف آئی۔

”قتل.....“ وہ کھوٹی کھوٹی نگاہوں سے چھت

کر ادا ہوئے۔ اُس کی لہو رنگ آنکھیں اب میرے چہرے پر جمی تھیں۔

”اپنے ایک شوہر کے قتل.....“ وہ تنفر سے بولی۔

اُس نے ایک کہا تو میرا قلم رک سا گیا۔ اور حیرت دو چند ہو گئی۔

”ایک..... کک..... کیا مطلب؟“ میں خوف کے باوجود تجسس سے بولی۔

”بس ایک ہی مار سکی..... باقی تین حرام خور بیچ گئے۔“ وہ کسی بھڑیلے کی طرح دانت کچکپانے لگی جیسے کسی کو کچکا چبا جائے گی۔

”کمینہ..... مارنا تھا مجھے..... گالیاں دیتا تھا..... بدکردار کہتا تھا..... جیسے میں زرخید لونڈی ہوں مرد سب کچھ کرے تو جائز..... عورت کرے تو ناجائز.....“ اُس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں جاننے کے لیے بے تابی سے بولی۔

”پھر مار دیا کہینہ کو.....“ اُس نے نفرت سے کہتے ہوئے یوں ہاتھ جھاڑے جیسے بہت بڑا فریضہ انجام دیا ہو۔ گردن کو دائیں بائیں حرکت دے کر تھکاوٹ اتارنے لگی تو کبھی بالوں میں انگلیاں گھسا کر سر کھجانے لگتی۔ اُس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا یوں جیسے اُسے قتل پر کوئی ملال نہ ہو۔ شاید اُس کا شوہر بہت ظالم تھا جس کے ظلم سے تنگ آ کر اُس نے اُسے مار ڈالا۔ میں نے سوچا مگر کہانی ابھی میری نگاہوں سے مخفی تھی۔

اس مختلط الحواس عورت کے دو لفظوں نے میرا دماغ الجھا کر رکھ دیا تھا۔

لفظ ”ایک“ اور ”باقی تین حرام خور.....“

”تجھے پتہ ہے میں نے اُس موئے کو کیسے مارا

.....

.....

.....

.....

.....

تھا؟“ یکا یک وہ راز دانہ انداز میں ہونٹوں کے ایک طرف اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی جیسے کوئی بڑی بریلنگ نیوز ہواس کے پاس.....  
”کیسے مارا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کمینہ رات کو سویا تو میں نے اُس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ خبیث کو بچ نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا وہیں کتے کی موت مر گیا۔“ اتنا بہیمانہ طریقہ کسی کی جان لینے کا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ضرور وہ شخص کسی سنگین معاملے کی وجہ سے مارا گیا ورنہ عورت جو پھر کی دیوی ہے وہ کہاں اپنے مجازی خدا کو یوں قتل کرتی ہے۔ مجھے اُس عورت سے ہمدردی ہونے لگی۔ ویسے بھی معاشرے کا ٹریڈ بن گیا ہے کہ حقیقت جانے بغیر مرد کو ظالم نصائی اور عورت کو مظلوم بنت مظلوم قرار دے دیا جاتا ہے۔

”ایسی کیا بات ہوئی تھی کہ حالات یوں سنگین رخ اختیار کر گئے۔“ وہ کلڑوں میں قصہ سنا کر میری کوفت بڑھا رہی تھی مگر مجبوری تھی وہ مریضہ تھی اُس پر سختی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”کمینہ میرا راز جان گیا تھا اور دھمکی دینے لگا تھا کہ باقی تینوں کو بھی میری اصلیت بتائے گا۔“ مختصر سا جواب دے کر حسب عادت اُس نے پھر سے بریک لگائی تو میں جھنجھلائی گئی۔

”دیکھیں..... مجھے کھل کر ساری بات بتائیں مجھے آپ کی باتوں کی بالکل سمجھ نہیں آ رہی۔“ ضبط کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے میں نے محبت بھری درخواست کی تو اُس کے چہرے کا تناؤ نرم پڑ گیا اور رفتہ رفتہ وہ مکمل داستان سنانے کی طرف آ ہی گئی۔

”میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی مجھ سے بڑے تین بھائی تھے میرا باپ بہت حسن پرست تھا

مگر اُس نے غلط راستوں کا سہارا لینے کے بجائے چار شادیاں کر لیں..... اگر ایک بیوی مر جاتی یا طلاق لے لیتی تو وہ صبر سے نہ بیٹھتا بلکہ اُس کی جگہ ایک اور شادی رچا لیتا..... میں نے ساری زندگی اپنی ماں کو روٹے پینتے دیکھا۔ وہ اب کو جھولیاں بھر بھر کر بد دعائیں دیتی مگر اب پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اب آخر سے کہتا۔

”میں کون سا گناہ کر رہا ہوں۔ مذہب نے مجھے اجازت دے رکھی ہے۔“ ابائی دیکھا دیکھی تینوں بھائی بھی اسی راستے پر چل پڑے۔

جب گھر کا سربراہ اتنی دیدہ دلیری سے یہ سب کرے تو اولاد کہاں پیچھے رہتی ہے وہ تو ہونی ہی سوا سیر ہے۔ تینوں بھائیوں نے بھی چار شادیوں کا مشغلہ اپنا لیا۔ دولت کی ریل پیل تھی سو چار بیویاں کسی پر بھی بوجھ نہ ہوتی۔ مگر گھر میں ہر پل کی بک بک جھک جھک رہنے لگی۔ جب عورت کی زبان کھلے تو مرد کا ہاتھ اٹھتا ہے وہ مار پیٹ کر کے اپنا غصہ نکالتا ہے عورت کا مزید خون جلانے کے لیے مشہور زمانہ جملہ ہر وقت نوک زبان پر رہتا ہے۔

”مرد کو چار شادیوں کا حق مذہب نے دیا ہے کون ہے جو انہیں اُن کے حق سے دستبردار کر سکے۔“ میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ شروع شروع میں تو ان معاملات کو سمجھ نہ پاتی مگر پھر آہستہ آہستہ ان روتی چیتتی عورتوں سے ہمدردی ہونے لگی۔ جوں جوں دل میں ہمدردی بڑھنے لگی مردوں کے لیے نفرت میرے دل میں بیٹھ گئی۔

ابایا بھائی ببا بنگ دہل یہ بات کہتے۔  
”چار شادیاں کرنا ہمارا حق ہے۔“ تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ دل چاہتا پوری دنیا

کو آگ لگا دوں اور سارے مردوں کو جلا کر راکھ کر دوں اور اُن کی راکھ کو پاؤں کی ٹھوکر مار کر اڑا دوں۔

یہ سب صرف سوچا جاسکتا تھا عمل کرنا تو ناممکن تھا۔ تجھے بعض اوقات اپنی بے بسی پر بہت رونا آتا..... راتوں کو اذیت سے جاگتی رہتی، گھر کے مردوں سمیت دنیا کے تمام مردوں کو جی بھر کر گالیاں دیتی مگر نفرت کسی طرح بھی کم نہ ہوتی..... انسان کی فطرت ہوتی ہے کہ اصل سے پیارا جس طرح سود ہوتا ہے بالکل ایسے ہی انسان کو وہ چیز زیادہ بری لگتی ہے جس سے کسی برائی یا تکلیف کا آغاز ہوتا ہے۔ میرا دماغ بھی آغاز کے بارے میں سوچ کر تنگ ہونے لگتا۔

”آخر مذہب نے مرد کو چار شادیوں کا حق دیا ہی کیوں؟“  
اگر انہیں یہ حق نہ ملتا تو یہ ظلم نہ ہوتا..... مذہب نے سخت زیادتی کی اس معاملے میں عورتوں کے ساتھ مجھے مردوں سے نفرت تھی اب مذہب پر بھی غصہ آنے لگا۔ میرے دل میں غصے کا الاؤ دینے لگا۔

”اگر مرد چار شادیاں کر سکتے ہیں تو پھر عورت کیوں نہیں؟“

اس تمام بغاوت اور نفرت نے میرے دل میں سوچ کا نیا بچ بودیا اور مردوں کی بے حسی اور ابروائی اس پر مٹی بن کر گری اور اُسے زمین کی لہٹیوں میں لے گئی۔ عورت کی آنکھوں سے بہتا آب اُس کی سیرابی کے لیے کافی تھا۔ پہلے تنہا سا پودا نکلا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن گیا۔ زہر میں بھرا جس پر زہریلے کانٹے تھے۔ اس طرح مسیح کے دانوں پر انسانی زبان کوئی ورد لڑت سے کرتی ہے ویسے ہی میں یہ ورد کثرت

سے کرنے لگی۔  
”مرد چار شادیاں کر سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں؟“

”اسی دوران میرا رشتہ میرے چچا زاد سے طے ہو گیا اور میں رخصت ہو کر اُس کے گھر آ گئی۔ وہ مہینہ مہینہ کام کے سلسلے میں شہر سے باہر رہتا تھا۔ خالی دماغ شیطان کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ میرے پاس فراغت ہی فراغت تھی۔ فس بک پر فرینڈ شپ میرا مشغلہ بنا تو کافی لڑکوں کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا لیا۔ انشا گرام پر تصویر لگاتی تو لڑکے دیوانے ہو جاتے۔ بات دوستی سے آگے بڑھی اور شادی پر اصرار ہونے لگا۔ یہاں سے ہی میرے انتقام کا آغاز ہوا۔ وہ حسن بے مثال سے گھٹا لے ہوئے تو میرا کام آسان ہوتا گیا۔ اُن میں تین لڑکے تو میرے شہر کے ہی تھے سو میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دنیا میں تنہا ہوں اور اپنی شادی کا فیصلہ خود کر سکتی ہوں اور پھر میں نے چار کو چار سے شکست دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اُن تینوں سے بھی نکاح کر لیا حالانکہ میں پہلے ہی سے اپنے چچا زاد کے نکاح میں تھی۔

ایک زوردار قہقہہ اور تالی کی گونج مجھے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔ میرا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ وہ عورت تالیاں بجاتے ہوئے دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔

”میں نے بھی چار شادیاں کر لیں..... چار کے بدلے چار.....!“ وہ چار انگلیاں دکھاتے ہوئے تقریباً چیخنے لگی تھی۔

میں اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھے بھٹی بھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی جا رہی تھی۔ یوں لگا



زمین ڈول رہی ہو۔ ابھی شکاف پڑنے والا ہو۔ بس تھوڑی دیر تک میں اس میں دھنس جاؤں گی یا پھر..... یا پھر..... کمرے کی چھت مجھ پر آن گرے گی۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔ دل تھلانے لگا۔ میں کیا سمجھ رہی تھی اور قصہ کیا لکھا تھا۔

”آپ مذاق تو نہیں کر رہیں؟“ میں بے یقینی سے بولی۔

مجھے اس عورت سے ہرگز اتنی جرأت و ہمت کی امید نہ تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حقیقت جاننے کی کوشش میں خود ڈوبنے کے قریب ہو جاؤں گی۔

”مذاق..... جھلی ہو گئی ہے میں تجھ سے کیوں مذاق کرنے لگی کیا تیرا میرا مذاق بنتا ہے۔“ وہ میرے قریب آ کر کینٹی پرنفرت سے ایک چپٹ لگاتے ہوئے بولی۔

جیسے میرا دماغ ٹھکانے لگانے کی سعی کی ہو..... میں اُسے حیرت سے دیکھنے جا رہی تھی۔ سرتاپا بار بار..... متعدد بار نبجانے کتنی بار پھر بھی حیرت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”اوہ..... مائی گاڈ!“ میں نے سر ہٹا لیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

”مگر آپ تو عورت ہیں عورت ایک وقت میں چار شادیاں کیسے کر سکتی ہے اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے۔“ مجھے اب اُس پر شدید غصہ آ رہا تھا کتنا سنگین قدم اٹھایا تھا دنیا و آخرت کا عذاب مول لے لیا تھا اور اُسے فکر تک نہ تھی۔

یوں مذہب سے متصادم ہو کر وہ نادم ہونے کی بجائے وہ فخریہ انداز میں خوش ہو رہی تھی جیسے زندگی میں بہترین کارنامہ انجام دیا ہو۔ انسان چھوٹے موٹے گناہ کر کے بھی رب کی پکڑ سے ڈرتا ہے اور وہ شدید ناخرمانی پر اکر رہی تھی کہ اُس

نے جو کیا ٹھیک کیا۔

”کیا آپ کے پہلے شوہر کو کچھ خبر نہ ہوئی؟“ میرے دل میں سوال آیا۔

”شروع شروع میں تو سب ٹھیک چلتا رہا میرا پہلا شوہر تو شوہر سے زیادہ باہری ہوتا تھا صرف چند دنوں کے لیے آتا تھا۔ بس جانے کے بعد میں بالکل آزاد ہوتی تھی۔ میکے کا بھانہ بنا کر تینوں شوہروں کو خوب اُلوہاتی اور دل ہی دل میں خوب مزہ لیتی..... کبھی ایک کے پاس تو کبھی دوسرے اور پھر تیسرے کے پاس..... کسی کو رتی برابر بھی شک نہ ہوتا تھا۔ میں پہلے شوہر کے پاس آنے تک لوٹ آتی۔ یوں مردوں سے میرا انتقام پورا ہو رہا تھا۔ وہ جو انتہائی سنگین بنے چار شادیوں کے حق پر اکر رہے تھے اب وہ حق میرے پاس بھی تھا..... میری کبھی کسی شوہر سے اُن بن ہوتی تو وہ مجھے دھمکی دیتا۔

”میں دوسری شادی کر لوں گا۔“ تو میں اُس کی دھمکی پر ذرا بھڑکی نہ ڈرتی تھی اور نہ ہی روتی نہ ہی بین ذاتی تھی۔ بلکہ دل ہی دل میں قہقہے لگاتی تھی۔

”جاؤ کرلو..... جتنی مرضی شادیاں..... میری بلائے میری جوتی کو بھی اس کی فکر نہیں۔“ وہ میری حالت پر ششدر رہ جاتے کیونکہ مردوں نے تو یہی دیکھا ہوتا ہے کہ بیوی کے سامنے دوسری شادی کی بات کر دو وہ مرنے مارنے پر تزلزل جاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

پھر مجھے ملکا سا بخار رہنے لگا..... میں اس کو معمولی سمجھتی اور کوئی توجہ نہ دیتی۔ پھر آہستہ آہستہ بخار بڑھنے لگا۔ بہر حال میں اپنے پروگرام پر سختی سے عمل پیرا تھی۔ آخر مرد بھی تو ایسے ہی کرتا ہے

جا ہے جیسی مرضی حالت ہو ہر بیوی کے حضور حاضر ضرور ہوتا ہے۔ میرا جب بخار زور پکڑنے لگا تو میرا پہلا شوہر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا ادویات دی کیں مگر فائدہ نہ ہوا.....

ایک شام جب میں بخار میں جلتی ہوش سے بیگانہ بستر پر بڑی تھی کہ میرا پہلا شوہر گھر آیا اُس کے تنکے تیلور کسی طوفان کی خبر دے رہے تھے۔ اُس نے آؤ دیکھا نا تاؤ..... اسی حالت میں مجھے بے دردی سے مارنے لگا۔ اُس نے مجھے مار پیٹ کر لہلہا کر دیا۔ میں وجہ پوچھتی رہ گئی مگر وہ ہٹانے کی بجائے پیٹتا رہا۔ بہت منت ساجت کے بعد اُس نے ڈاکٹری رپورٹس میرے منہ پر دے ماریں جن میں انکشاف ہوا تھا کہ میرے جسم میں ایڈز کے جراثیم کی موجودگی کا اشارہ ملا ہے۔ میں نے بہت قسمیں کھائیں۔ پیر پکڑے مگر اُس کا اعتبار مجھ پر ختم ہو چکا تھا۔ اسی دوران میرے نیلے سے فون نے میرے راز کی مکمل قلمی کھول کر رکھ دی۔ اُن کے مطابق میں پورے ایک سال سے اُن سے ملنے نہیں آئی تھی۔ جبکہ میرا پہلا شوہر تو یہ ہی جانتا تھا کہ میں میکے جاتی ہوں باقی تینوں لوگوں نے یہ بتا رکھا تھا کہ میں دور یار کے رشتے داروں سے ملنے جاتی ہوں سو وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

میرا شوہر صرف مجھے بدکار سمجھ رہا تھا۔ اصل بات وہ نہیں جان سکا تھا کہ میں نے تین اور شادیاں کر رکھی ہیں اُس نے مجھے گھر میں قید نہ دیا۔ وقت زیادہ گزرا تو میرے تینوں شوہروں کی بے قرار یان عروج پر پہنچ گئیں۔ فون پر فون لانے لگے۔ میں ٹال مٹول کرتی مگر وہ پیش میں لانے لگتے۔ کوئی اصرار کرتا ابھی فوراً آؤ۔ کوئی

اصرار کرتا پتہ بتاؤ اپنے رشتے داروں کا میں تمہیں لینے آتا ہوں۔ مگر میں کسی نہ کسی طرح بات گول مول کر دیتی۔

میرا شوہر مجھ پر سخت پھرہ رکھنے لگا تھا۔ وہ گھر سے بالکل نہ نکلنے دیتا..... وہ کام کے سلسلے میں شہر سے باہر بھی نہیں جا رہا تھا۔ پھر ایک روز میں پکڑی گئی۔ میرا راز کھل گیا میرا پہلا شوہر کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا۔ تو میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے چوکس ہو گئی۔ مگر پہلا شوہر کہیں نہیں گیا تھا وہ اسی شہر میں تھا بس مجھے رکھنے ہاتھوں پکڑنے کے لیے موقع فراہم کیا تھا۔ میرا راز کھلا تو وہ میری جان لینے کے در پر ہو گیا۔ میں خوفزدہ ہوئی اور اُسے سب کچھ سچ بتا دیا۔ وہ خود کو پاگلوں کی طرح نوچنے لگا تو میرے دل کو بہت سکون ملا۔ عورتیں بھی تو سوتن کا سن کر اسی طرح روتی جیتی ہیں مگر مرد کب احساس کرتا ہے۔ بے لگام گھوڑے کی طرح بھاگتا ہے۔ کبھی کسی کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتا۔

وہ بالکل گم صم سا ہو گیا۔ یوں جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو کہ میں اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہوں وہ بالکل کسی بے بس عورت کی طرح لگ رہا تھا میرا دل خوشی سے جھوم رہا تھا اُس کی بے بسی پر..... مگر میں اُس کے قابو آنے والی نہیں تھی۔ وہ سویا اور میں نے کام دکھایا اُس پر مٹی کا ٹیل چھڑک کر آگ لگادی۔ ہا ہا..... وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگی۔ میں اُس کی سفاکی پر حیرت سے لگ رہ گئی تھی۔

”کیوں ٹھیک کیا نا میں نے ان خبیثوں کے ساتھ..... کیسا آئینہ دکھایا۔ بڑے حاکم بنے پھرتے ہیں بڑا اکڑتے ہیں اپنی حاکمیت پر..... مذہب کے نام پر بڑی بڑی باتیں مارتے ہیں..... چار

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید داغ قابل علاج مرض ہے

پہا بھری

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی ایوارڈ ہولڈر اجمل زیدی کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام



ASIAN EXCELLENCE  
PERFORMANCE AWARD



AWARD  
BEST ACHIEVEMENT



AWARD  
PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

مکان نمبر 62، ستر سائبر  
Q-8/1، پتہ 20  
سروایک (ٹیلی فونک) اسلام آباد  
فون: 051-2331725  
موبائل: 0300-8566188

9- اپریل تا 30 مئی  
9- اگست تا 30 ستمبر  
9- دسمبر تا 30 جنوری

لاہور

پشاور

14- فروری تا 27 فروری  
14- جون تا 27 جون  
14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

11- فروری تا 11 فروری  
11- جون تا 11 جون  
11- اکتوبر تا 11 اکتوبر

ملتان

کراچی

28- مارچ تا 6 اپریل  
28- جولائی تا 6 اگست  
28- نومبر تا 7 دسمبر

13- مارچ تا 27 مارچ  
13- جولائی تا 27 جولائی  
13- نومبر تا 27 نومبر

E-Mail: syedajmalzaidi@hotmail.com • syedajmalzaidi@yahoo.com.uk

مونی کی طرح آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جاؤ.....  
سرکشی میں جتنا دور جاسکتے ہو چلے جاؤ..... کوئی  
روک ٹوک نہیں ہوگی۔ بس اب تم اس خناس  
بھرے دل کے ساتھ باقی ماندہ ایام حیات گزارو  
اور عبرت کا نشان بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

یہ خناس ہی تو تھا جو بنت حوا کو اس مقام پر  
لے آیا کہ مردوں سے انتقام لینے کا جنون اُسے  
باغی بنا گیا کہ وہ مذہب سے بھی متصادم ہوگی۔  
افسوس بچھتاوے اور شرمندگی کی بجائے وہ سینہ  
تانا کر فخر سے کہہ رہی تھی.....  
”ٹھیک کیا تائیں نے..... صحیح انتقام لیا تائیں  
نے ان مردوں سے.....“

انسانیت کو حیوانیت نے چھاڑا تو انسانیت  
اپنی معراج سے کس بری طرح سے گری تھی۔ اُس  
نادان کو احساس ہی نہ تھا کہ وہ کس قدر بڑے گناہ  
کی مرتکب ہوئی تھی وہ ابھی بھی ناواقف تھی ایک  
ہی وقت میں چار شوہر..... میں نے اپنی چار  
انگلیوں کو دیکھا اور خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔  
مجھے اُس کے بھیا تک انجام سے بے پناہ خوف  
محسوس ہوا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار روٹنے  
لگوں۔

”اے بنت حوا یہ تیرے دل و دماغ میں کیا  
’خناس‘ بھرا کہ تیرے عمل نے ہر عورت کا سر  
شرمندگی سے جھکا دیا۔

’من شر الواسواس الخناس‘  
اب سمجھ آئی کہ خناس کے شر سے کیوں پناہ  
مانگی گئی ہے۔ جب انسان اپنا دل و دماغ اس کے  
حوالے کر دیتا ہے تو پھر اس جہان کا کوئی گوشہ اُس  
کے لیے گوشہ عافیت نہیں رہتا۔ پھر وحشتیں ہی  
اُس کا مقدر بن جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

کا بدلہ..... چار.....“ وہ اپنے فعل پر مطمئن تھی۔  
عقب سے آتی اُس کی آوازیں کور پڑورتک  
میرا پیچھا کرتی رہیں مگر میں نے پلٹ کر نہ دیکھا۔  
”چار کا بدلہ..... چار..... میرے حواس بے  
قابو ہونے لگے۔

اپنی ہی ہم جنس کی سوچ خود سری اور سرکشی پر  
میری روح ماتم کرنے لگی۔ میرے قدم  
لڑکھڑاہے تھے اور آنسو پھل رہے تھے باہر نکلنے  
کے لیے میری فریڈ ز مجھ سے میری گھبراہٹ کی  
وجہ پوچھتی رہیں مگر میں انہیں کیا بتاتی۔  
”چار کے بدلے چار.....!“ ان الفاظ کی  
بازگشت میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔

سرکشی کیلے سڑک پر بس بھاگی جا رہی تھی۔ ابر  
آلود موسم نے بارش برسا کر ہر سو جل تھل کر دی۔  
مجھے ٹھنک کا احساس ہونے لگا تو میں نے بس کی  
کھڑکی کھول دی۔

نرم ہوا کے لطیف جھونکوں نے زندگی کا  
احساس دیا ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ میں کسی  
اندھیری کوٹھری میں بند ہو گئی ہوں۔

”بڑے مذہب کی شہبہ پر اچھلتے ہیں یہ  
بد ذات..... دیکھا کیسا دماغ ٹھکانے لگایا۔“  
قبہ قبہوں کی آواز سامعوں میں سیہ بن کر اترنے لگی  
تو میں نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں  
اس کیفیت سے چھٹکارہ چاہتی تھی۔

”خناس..... خناس..... خناس.....“ کوئی  
دردناک آواز میں چیخا۔

”اور جب دلوں میں خناس بھر جائے.....  
اور جب ذہن بھی خناس سے خالی نہ رہیں تو پھر  
اچھے برے کی تمیز انسان سے چھین لی جاتی ہے۔  
نیکی پر قائم رہنے اور بدی سے دور رہنے کی طاقت  
شتم کر دی جاتی ہے اُسے ریوڑ سے نکال کر اُس

## قسمت کے کھیل

ضروری نہیں کہ صرف سوتیلی ماں ہی خراب ہو

بعض اوقات اولاد بھی اپنا دل بہت تنگ کر لیتی ہے.....

شیخ معظم الہی

لوگ عموماً یہی کہتے ہیں کہ اللہ پاک سوتیلی

ماں کسی کو نہ دے اس لیے کہ وہ اپنے خاوند کی پہلی اولاد کی قدر نہیں کرتی اور اس کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوتیلی ماں یہ بھی نہیں چاہتی کہ اس کے خاوند کی پہلی اولاد پڑھ لکھ جائے اور اسے کوئی اونچا مقام ملے۔

مگر سب سوتیلی ماںیں ایک جیسی نہیں ہوتیں بلکہ ان میں سے کچھ مائیں ایسی بھی ہوتیں ہیں جو سوتیلی اولاد کو ہمیشہ اپنے بچوں کی طرح چاہتی ہیں انہیں پڑھاتی لکھاتی ہیں اور دنیا میں ایک اونچا مقام دلانے کی کوشش کرتی ہیں اولاد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنا سکھ اور آرام بھی بھول جاتی ہیں۔ ایک ایسی ہی ماں کی کہانی میں تحریر کرنے جا رہا ہوں جس نے اپنے خاوند کی پہلی اولاد کو پالا پوسا اور خون جگر دے کر اس اولاد کی تربیت کی۔

خورشید آ پا کا خاندان تقسیم ہند سے پہلے امرتسر میں رہا کرتا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں

ہائش ایک مسئلہ ہی بن گئی وہ کبھی کسی بھائی کے پاس رہتی تھیں کبھی اپنی بڑی بہن کے پاس جب خورشید آ پا کی عمر اٹھارہ سال کی ہوئی تو ان کی بہن نے اس مسئلے کے حل کے طور پر خورشید آ پا کی شادی ابدالہ (انڈیا) میں اپنے ہی خاندان کے ایک شخص میاں نصیر احمد سے کر دی۔ نصیر احمد ایک امیر ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ پانچ بچوں نے باپ تھے۔

ان کے چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑا بیٹا ایف اے کا طالب علم تھا۔ باقی بچے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ یعنی حامد سے چھوٹا لڑکا سعود آٹھویں جماعت میں اس سے چھوٹا محبوب چھٹی جماعت میں اور سب سے چھوٹا لڑکا رفاقت پہلی

جماعت میں پڑھتا تھا۔ جبکہ لڑکی آمنہ نے پانچ جماعتیں پڑھ کر اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ نصیر احمد کا خاندان ابدالہ کا امیر کبیر خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔

خورشید آ پا نے سرال میں آ کر سب بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھال لی اور ان کی بہت اچھے طریقے سے پرورش کرنا شروع کر دی۔ ان کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ سوتیلی اولاد کی پرورش اور دیکھ بھال کر رہی ہیں بلکہ وہ انہیں اپنے بچے سمجھ کر یہ سب کچھ کر رہی تھیں وہ ان کو یہ احساس نہیں ہونے دیتی تھیں کہ وہ ان کی سگی ماں نہیں ہیں۔ مگر سب سے بڑے لڑکے حامد اور اس سے چھوٹے لڑکے سعود نے خورشید آ پا کو کبھی بھی اپنی ماں تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ







## گناہ گار

وہ مظلوم تھی..... معصوم تھی..... مگر پھر بھی گناہ گار قرار

دے دی گئی..... ایک حرماں نصیب کی داستان الم.....

مریم شاہ بخاری

ڈرائنگ روم کے فرش پر دو لاشیں خون میں

نہائی ہوئی پڑی تھیں۔ پاس ہی وہ پتھرے بالوں کے ساتھ کھڑی تھی ہاتھ میں اس کے پستول تھا گھر کے تمام افراد اس سے کچھ فاصلے پر دائرے کی صورت میں کھڑے تھے بھی غم و غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ جب ڈی ایس بی حیدر اندر داخل ہوا تو اُس نے خود ہی آگے بڑھ کر آئینہ اس کے حوالے کیا اور اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا تھا۔ وہ اس کی دیدہ دلیری دیکھ کر تعجب کا شکار تھا۔ بہر حال جو بھی تھا اُسے اپنی ڈیوٹی تو نبھانی تھی اس نے ساتھی اہلکاروں کو اشارہ کیا تو انہوں نے آگے بڑھ کر اسے ہتھکڑی پہنا دی۔ ڈی ایس بی حیدر نے گھر والوں کو مخاطب کیا۔

”آپ میں سے کون میرے ساتھ چلے گا تمہارے ضروری کارروائی کرنی ہے؟“

”میں چلتا ہوں جی.....“ ایک باوقار ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھا تھا۔

”آپ کا مقتولین سے کیا رشتہ ہے؟“ حیدر

اپنے اسپتال بھوانے کا بندوبست کرو۔“ حیدر نے ان دونوں سے بات کر کے اپنے ساتھی کو مخاطب لیا تھا۔

”جی سر.....“ فتح محمد نے فوراً کہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد حیدر وہاں سے تھانے کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ جیل کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گہری وج میں گم تھی جب ڈی ایس بی حیدر کے قدم وہاں ز کے تھے۔ 30'29 کے لگ بھگ اس ڈیوٹی کی عمر تھی اس کے چہرے پر چھائی مصدومیت اور خوبصورتی کا امتزاج اسے کہیں سے بھی مجرم ثابت نہ کر رہا تھا مگر دو گواہوں اور نو داس کے اعتراف جرم نے اُسے اس کال ٹوٹھری میں لا چننا تھا۔



”کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہے؟“ وہ تنہی سے بولی تھی۔

”آ رہا ہے نظر مجھے..... لیکن میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔“ حیدر نے اپنی بات پر خاصا زور دیا تھا۔

”جو آپ دیکھ رہے ہو وہی حقیقت ہے.....

اور کچھ بھی نہیں جو میں آپ کو بتاؤں..... ویسے بھی آپ کا مجھ سے کیا رشتہ ہے؟ کس حیثیت سے پوچھ رہے ہیں آپ؟“ اس کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

”رتبہ..... ہم دونوں کا بچہ زمانے میں

دوست رہ چکے ہیں۔ اگر یاد ہو تو اور سب سے بڑھ کر انسانیت کا رشتہ ہے میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“ حیدر نے دکھ سے اُسے دیکھا تھا جانے کیوں وہ اُسے مظلوم لگتی تھی۔

”مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے سسر

حیدر.....“

”پلیز آپ یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ اس کی

طرف سے رخ موڑ کر بولی تھی۔

”رتبہ میں حقیقت جانے بنا کہیں نہیں جاؤں

گا۔“ وہ ضدی لہجے میں بولا تھا۔

”بتاؤ مجھے..... ہری اپ.....“

”میں تمہیں بتانے کی پابند نہیں ہوں سسر

حیدر.....“ وہ اس سے بھی زیادہ ضدی تھی۔

”مگر.....“ حیدر نے کچھ کہنا چاہا۔

”اگر مگر کچھ بھی نہیں..... خدا کے لیے مجھے

اکیلا چھوڑ دو اور بس..... کوئی سوال مت کرنا.....“

اس کے لہجے میں اتنا درد اور التجا تھی کہ حیدر خاموشی سے بنا کچھ کہے پلٹ آیا۔

☆.....☆.....☆

مقدمہ عدالت میں پیش کیا جا چکا تھا مگر انہوں کے بیانات اور قاتلہ کے اعتراف جرم نے فیصلہ

بہت آسان بنا دیا تھا۔ رتبہ فجر کو اپنے شوہر اور اس کے دیرینہ دوست کے قتل کے جرم میں پندرہ سال

قید بامشقت اور سزائے موت سنائی گئی تھی۔ اس

کے گھر والے بے بسی سے بیٹی کو جیل کی سلاخوں

کے پیچھے جاتا دیکھتے رہے تھے۔ حیدر کی روح لرز

گئی تھی۔

جبکہ جسے سزا سنائی گئی تھی وہ ان سب سے

یکسر لاتعلقی نظر آ رہی تھی۔ بلکہ اس کے چہرے پر

طمانیت کے رنگ ابھرے ہوئے تھے۔ اُسے کوئی

پر واہ نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

حیدر کے لیے وہ دن بھی کسی جھٹکے سے کم نہ تھا

جب ”رتبہ فجر“ کا تسن پانچ سالہ بیٹا ادھیڑ عمر شخص

کے ساتھ اس سے ملنے کے لیے آیا تو وہ اُسے

دیکھتے ہی ہڈیاں انداز میں چلا اٹھی۔

”خان بابا..... کیوں لے کر آئے ہو اس کو

یہاں..... منع کیا تھا نہ مجھ سے ملنے کوئی نہ آئے۔“

وہ غصے سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

”جی بی بی..... منع کیا تھا آپ نے..... پر

چھوٹے صاحب بہت ضد کر رہے تھے آپ سے

ملنے کی۔“ وہ انکساری سے بولا تھا۔

”کہہ رہا تھا مجھے اپنی ماں سے ملنا ہے..... رو

رہا تھا۔“ ملازم نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھتے

ہوئے کہا۔

”ماں.....“

”کوئی ماں..... نہیں ہوں میں اس کی

۔ بیٹی تھی۔ حیدر سے اس معصوم کا یوں دیکھنا

الٹ نہیں ہوا تو وہ آگے بڑھا۔

”رتبہ ہوش کے ناخن لو..... یہ تمہارا بیٹا ہے

ابہرا خون ہے۔ دیکھو اس کو کیسے دیکھ رہا ہے

ابہرا ہی طرف.....“ حیدر نے اُس کی متا جگہ کی

پاس تھی۔

”نہیں..... نہیں ہے یہ میرا خون..... میرا

ہاں تعلق نہیں اس کے ساتھ..... گندے باپ کی

اندی اولاد ہے یہ..... یہ چوہدری دانیال کا بیٹا

..... اس کی جائیداد کا وارث بس.....

..... یہ اُس کا بیٹا بھی نہیں..... میرا بھی

..... پھر پھر یہ کس کا ہے؟“ وہ اپنے ہوش کھو

اٹ گئی۔

”ہاں بابا..... ہاں یہ..... گندے گند.....“ وہ

..... ہاں گارہی تھی۔

”میں مار دوں گی اس کو.....“ وہ بچے کو

..... نہ لپکی تو حیدر نے جلدی سے بچے کو اپنے

..... ہاتھ لایا۔

”رتبہ.....“ وہ زور سے چیخا تھا۔

”اسے لے جاؤ حیدر..... ورنہ..... میرے

..... نام کی نہیں پھٹ جائیں گی۔“ وہ بے بسی سے

..... زور زور سے دبا نے لگی تھی۔ حیدر نے اس

..... بچے کو لے جانے کا اشارہ کیا تو وہ

..... انہوں میں آئی نہی کو صاف کرتا ہوا بچے کو لے کر

.....

فجر کا ڈرائیور تھا جو صرف اُسی کے لیے مخصوص تھا۔

☆.....☆.....☆

حیدر نے رتبہ فجر کا کس از سر نو ترتیب دے

کر تفتیشی دائرہ کار بڑھا یا تھا لیکن سوائے ناکامی

کے اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا تھا اُسے جیل میں چھ ماہ

ہونے کو آئے تھے اُسے اُس کی جانب سے کسی

بھی قسم کی شکایت موصول نہیں ہوئی تھی۔ اس کا

رویہ بہت دوستانہ تھا۔ ہر ایک کے ساتھ خوش

اخلاقی سے پیش آ رہی تھی۔ وہ جب بھی اس

طرف گیا اسے ہمیشہ عبارت میں مصروف دیکھا

سر پر دوپٹہ اوڑھے ہاتھ اٹھائے کھڑی ہوئی رتبہ

فجر اسے جھنجھوڑ جاتی۔

”کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتا۔“ وہ

..... اکثر اسے دیکھ کر یہی سوچتا تھا ان چھ ماہ میں رتبہ

کے والدین بیٹی کا کم سینے سے لگائے اس دنیا سے

رخصت ہو چکے تھے۔ اس کا واحد کلوتا بھائی بیوی

بچوں اور غم روزگار میں اس قدر غم ہوا کہ بہن کو

بھول گیا حوٹلی سے بس خان بابا رتبہ کا ڈرائیور ہی

کبھی کبھار آتا اُس کا حال احوال پوچھتا اور چلا

جاتا۔ اس نے اس کے بیٹے کو دوبارہ ساتھ لانے

کی غلطی نہیں کی تھی۔

رتبہ کی زبانی اُسے معلوم ہوا تھا کہ خان بابا

اس کے والد کے پرانے ملازم ہیں اور وہ حق نمک

نہا رہے ہیں۔

حیدر رتبہ فجر کو کالج کے زمانے سے جانتا تھا

بچک ان کے ٹیپس الگ تھے لیکن ان کی ٹیپسری

آپس میں بہت ملتی تھی اور پھر دونوں ہی اپنے

کالج کے ہونہار اسٹوڈنٹ ہی نہ تھے بلکہ بہترین

مقرر بھی تھے بس یہی بات ان کی دوستی کی بنیاد بنی

تھی۔ خود حیدر کو سادہ سی رتبہ فجر اچھی لگتی تھی۔ اس

کی معصومیت خوبصورتی سب سے بڑھ کر اس کے



کردار کی مضبوطی بہت متاثر کرتی تھی۔ حیدر اور اس کے درمیان احترام کا رشتہ تھا۔ رتبہ فخر اور حیدر کی دوستی صرف کالج تک محدود تھی وہ بہت پازیسو تھی اس حوالے سے وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کے کردار اور دوستی پر حرف آئے۔ حیدر اس کی خوشی میں خوش تھا امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد وہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے آج اتنے برسوں بعد وہ اس کے سامنے آئی بھی تو قاتلہ کے روپ میں..... ایک مجرم بن کر..... جو حیدر کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

☆☆☆☆☆

آج اُسے فراغت ملی تو وہ اس سے ملنے چلا آیا۔ رتبہ اُس سے بہت کم بولتی تھی پر شکر تھا کہ وہ بولتی تو سی ناں۔

”رتبہ ایک بات کہوں؟“ حیدر نے اُسے کہا تو اُس نے دھیرے سے سر ہلادیا۔

”تم سپریم کورٹ میں جرم کی اپیل کیوں نہیں دائر کرتی..... تمہارے اچھے رویے کی وجہ سے ہو سکتا ہے سزا میں کمی ہو جائے؟“

”حیدر..... بچوں سی باتیں کیوں کرتے ہو؟ قتل کیے ہیں میں نے..... میری سزا کیسے کم ہو سکتی ہے؟“ رتبہ نے پشیمانی ہنسی میں کہا تھا۔

”پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“ حیدر نے اُسے قائل کرنا چاہا۔

”نہیں..... جو سزا تجویز ہو چکی ہے ٹھیک ہے..... دو سال گزر گئے ہیں باقی بھی گزر جائیں گے..... ایک دن تختہ دار بھی استقبال کر ہی لے گا..... اچھا ہے اس فانی دنیا سے رخصتی اختیار کروں۔“ وہ افسردگی سے بولی تھی۔

”ایسی باتیں مت کرو پلیز.....“ حیدر نے دھکے سے کہا۔

”یہی حقیقت ہے حیدر..... حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا مجھے پتہ ہے تمہیں میرے پاس کیا چیز سمجھ لانی ہے؟“ رتبہ کی آنکھیں شرارت سے چمکی تھیں۔

”کیا چیز سمجھ لانی ہے؟“ حیدر نے اُسے گھورا تھا۔

”یہی کہ تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں نے اپنے شوہر اور اس کے دوست کو کیوں قتل کیا تھا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ بات بھی ہے..... میں جاننا چاہتا ہوں لیکن مجھے تمہارے پاس میری اور تمہاری دوستی سمجھ لانی ہے محترمہ.....“ حیدر نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”اوہ اچھا جی..... گڈ.....“ رتبہ فخر نے ہنس کر اُسے سراہا تھا۔

”حیدر..... ٹینشن مت لو میں تمہیں بتاؤں گی..... ضرور بتاؤں گی..... مگر وقت آنے پر۔“ وہ تنبیہ کی سی بولی تھی۔

”ٹھیک ہے لیکن اب یہ بھی بتا دو وہ وقت کب آئے گا؟“ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

”پتہ نہیں.....“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی تو حیدر اُسے گھور کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

وقت کا پیہر بڑی تیزی سے گھوما تھا۔ پندرہ برس بیت گئے۔ حیدر کی شادی ہو گئی وہ دو بڑوں اور بچوں کا باپ بن گیا ڈی ایس بی سے وہ ڈی آئی جی کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ لیکن رتبہ فخر کے بنانے کا وقت ابھی تک نہیں آیا تھا وہ شدت سے منتظر تھا کہ کب وہ اس راز سے پردہ اٹھائے۔ آخر خدا خدا کر کے حیدر کا انتظار ختم ہوا اور اُسے رتبہ فخر کا پیغام ملا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔

پیغام ملا بھی تو کب؟ جب اسے تختہ دار پر لٹائے جانے میں صرف تین دن باقی تھے۔ حیدر پر کمرہ گیا تھا لیکن وہ بے بس تھا کہ وہ اس کے پاس بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس جانے پہلے وہ اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔

اُسے لگ رہا تھا موت کا خوف اس کے ہارے پر زردی بکھیرے ہوئے ہوگا۔ وہ اس کے سامنے روئے گی۔ لیکن اب جب وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا تو رتبہ فخر کے حوصلے اور ضبط کی دل میں دل میں داد دے رہا تھا۔ وہ اس کی طرح ہی مطمئن اور ہشاش بشاش تھی اس نے وجود میں ذرا برابر بھی لرزش نہ تھی اس کے ہارے پر موت کی زردی نہیں عجیب سا سکون پھیلا ہوا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ غلابی آنکھوں میں کسی پہچانناوے کا عکس تک نہ تھا وہ ابھی ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی۔

”تم جاننا چاہتے تھے ناں اصل کہانی.....“ اب اس کا بیج وقت آ گیا ہے..... میں تمہیں اس لیے نہیں بتا رہی کہ تم مجھ سے اظہار ہمدردی کرو یا اظہار کر دو نہیں بلکہ میں یہ چاہتی ہوں کوئی اور بہتر جرم نہ لے کوئی اور دانیال جیسا وحشی درندہ بنے..... فیضان احمد جیسے شیطان کا شکار کوئی اور انسان حوانہ ہو۔ اور کوئی مجھ جیسی گناہگار اس مقام پر نہ پہنچے۔“ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی وہ بڑی خوبصورتی سے حیدر سے چھپا گئی تھی۔ وہ ہنسنے کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر اُس نے اپنی ہاتھی ہونی گفتگو کا سلسلہ جوڑا تھا۔ حیدر ہمہ تن گوش تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اُسے لگ رہا تھا کہ وہ بہت بڑے راز سے واقف ہونے جا رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

رتبہ فخر بھی ایک عام سی لڑکی تھی جس کی آنکھوں میں بھی خواب اترتے تھے ایک اچھی اور خوبصورت زندگی کے..... ایم اے اکنامکس کے بعد فیشن ڈیزائننگ اس کا جنون تھا وہ فیشن کی دنیا میں اپنا نام پیدا کرنا چاہتی تھی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ایم اے اکنامکس کے امتحانات کے فوراً بعد ہی اس کا ایسے گھرانے سے رشتہ آیا کہ اس کے والدین دیگ رہ گئے۔ امیر ترین لوگ..... کروڑوں کا بزنس کرنے والے اور پھر حیات آباد کے علاقے میں اپنی زمینیں جن کی سالانہ آمدنی اتنی تھی کہ وہ لوگ بغیر کوئی کام کے سات پشتوں تک آرام سے کھا سکتے تھے۔ اُن لوگوں کو ان کی سفید پوشی سے کوئی سروکار نہ تھا انہیں مطلب تھا تو بس اُن کی بیٹی رتبہ فخر سے جو اُن کے پیٹے چوہدری دانیال سرفراز کے دل میں اتر چکی تھی۔ رتبہ فخر کو اُس نے پرنسپل کے آفس میں دیکھا تھا وہ وہاں کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اُس کا بیج کا وکس پرنسپل دانیال کا دوست تھا۔ ایک دو بار اُس نے رتبہ کو وہیں دیکھا تھا۔ اُس کی سادگی اور حسن نے دانیال کو اپنا امیر کر لیا تھا۔ اُسی دوست کے توسط سے یہ پرنسپل رتبہ کے والدین کے سامنے آیا تھا۔ دانیال کے گھر والوں سے چند دنوں کا ٹائم لے لیا گیا سوچنے سمجھنے کے لیے اس کے بھائی نوید نے خاموشی سے بالائی بالا ضروری چھان چھنک بھی کر لی۔ ہر ماں باپ کی طرح اس کے والدین کی بھی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی بھی اپنے سسرال میں سکھی رہے۔

اُسے ہر سہولت میسر ہو۔ اب انہیں یہ خواب دانیال کی صورت میں پورا ہونا نظر آ رہا تھا۔ نوید کی طرف سے سب اچھا ہے کا گنگل ملا تو یہ رشتہ

قبول کر لیا گیا۔ یوں رتبہ فجر ٹھیک ایک ماہ بعد چوہدری دانیال سرفراز کے نام کی ہندی ہاتھوں پر لگائے وہن بن کر جوہلی آگئی تھی۔ بیچ پر بیٹھی رتبہ فجر اپنے دلہا کا انتظار کر کر کے آکھ گئی تو اس نے ہنڈی کراؤں سے ٹیک لگالی۔ نیند زبردستی اُس کی آنکھوں میں اتر رہی تھی جسے وہ پلکیں جھپک جھپک بھگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر ناں ناں کرتے بھی اُس کی آنکھ لگی گئی۔ اُسے خبر ہی نہ ہوئی کب دانیال کمرے میں آ کر خود بھی سو گیا تھا۔ اگلی صبح اس کی آنکھ ملازمہ کی تیز دستک کی وجہ سے کھلی تھی۔ وہ ہڑا کر اٹھی۔ ٹائم دیکھا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ وہ رات سے دلہن کے لباس میں تھی۔ جلدی جلدی اٹھ کر دروازہ کھولا تو ملازمہ اسے ناشتہ لگنے کی اطلاع دے کر چلی گئی اس نے بے خبر سوتے اپنے شوہر پر نظر ڈالی تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا اب انہیں کیسے اٹھاؤں؟ وہ شرم اور جھجک سے اس کے سر ہانے کھڑی ہوئی تھی ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ دانیال کے فون بجنے کی تیز آواز نے اسے سائیڈ ٹیبل کی طرف متوجہ کر دیا۔ موبائل کی رنگ ٹون نے دانیال کو بیدار کر کے رتبہ فجر کی مشکل آسان کر دی تھی۔

دانیال کی نظر رتبہ پر پڑی۔  
”ارے تم نے ابھی تک چہنچ نہیں کیا؟ اوہ..... سو..... سوری یار..... رات تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا..... دراصل دوست یا ر سب اکٹھے تھے انہوں نے گھیرے رکھا..... آئی ایم سوری.....“ وہ مسکراتا ہوا اُس کے سامنے آکھڑا ہوا تو رتبہ فجر شرم سے سر جھکا گئی۔ موبائل بج بج کر خود ہی خاموش ہو گیا تھا۔

”ویسے ایک بات ہے یو آر سو بیوٹی فل.....“  
آئی ایم ویری ٹی کہ تم میری لائف پارٹنر ہو.....“  
وہ اس کے چہرے پر جھکا تو وہ حیا سے سمٹ گئی۔  
دانیال ہنس کر سیدھا ہو گیا۔  
”جاؤ جلدی سے چہنچ کر لو..... پھر ناشتہ کرتے ہیں۔“  
”جی اچھا.....“ وہ فرمانبرداری سے کہہ کر الماری کی طرف بڑھ گئی جبکہ دانیال اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆  
رتبہ فجر کے لیے یہ بات کسی دھچکے سے کم نہ تھی کہ دانیال نے ابھی تک ’حق زوجیت‘ ادا نہ کیا تھا۔ اب جبکہ وہ بیس جیسے خوبصورت ملک میں بنی مون کے لیے روانہ ہونے والے تھے تو اس کو کچھ تسلی ہوئی ہو سکتا ہے کہ وہ وہاں جا کر ان لحوں کو یادگار بنانا چاہتا ہو۔

☆.....☆.....☆  
وہ شاندار سا ڈنر کر کے واپس اپنے ہوٹل پہنچے تھے رتبہ فجر شاد و لے کر باہر نکلی تو دانیال کافی کے دھگ اٹھائے روم میں داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اسے مسکراتا ہوا دیکھ کر دانیال بھی مسکرا دیا۔ بلیک کلر کی ٹاکسی میں اس کا حسن لشکارے مار رہا تھا۔

دانیال غماز آلود نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔  
”یہ لو جانم بلیک کافی..... تمہاری فیورٹ.....“ وہ ایک گگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تھا۔  
”جلدی سے اسے ختم کرو..... اور..... بیڈ پر آ جاؤ..... آج بہت غضب ڈھا رہی ہوں تم سے اس رات کو حسین تر بنانا ہے۔“ وہ معنی خیزی سے

اُڑا دیا اس کی طرف جھکا تو رتبہ فجر کے گالوں پر لپٹا ہوا۔ دل کی دھڑکن دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر اہل کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بات پین کا سمندر ٹھانٹیں مارنا دکھائی دیا تھا۔ رات کی رات واقعی حسین تر تھی۔ وہ خود کو یکدم ہی لپٹ لگنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆  
انی مون ٹرپ سے واپسی کے دوسرے ہفتے ان سے لیدی ڈاکٹر ماں بننے کی خوشخبری سنارہی تھی خدا نے اُس کے پیروں میں جنت رکھ دی تھی۔ یہ بہت بڑی خبر تھی سبھی نے اُسے مبارکباد دی تھی بذات خود دانیال بہت خوش تھا۔ اسے اس شاپنگ کروائی تھی اور نیو ماڈل کی برانڈڈ خرید کر گفت کی تھی۔ وقت دھیرے دھیرے اُڑ رہا تھا۔ آخر وہ گھڑی بھی آگئی جب اُس نے کول مٹول خوبصورت سے بچے کو جنم دیا تھا۔ اہل سرفراز کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی بچے کے سامنے دنیا جہان کی نعمتیں لا کر ڈھیر کرے۔ رتبہ فجر اتنا مان اور پیار پا کر بے حد رنجی اس کے والدین اور بھائی بھی بیٹی کی بات پر نازاں تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے نہ سکتے تھے۔

☆.....☆.....☆  
نصفے راحم دانیال کی پیدائش کے ڈیڑھ ماہ بعد فجر کے بھائی نوید کی شادی کے ہنگامے جاگ رہے تھے۔ والدین کے ساتھ مل کر بری تیار تھی۔ دانیال نے رتبہ کو اچھی خامی رقم دی تھی۔ وہ بھائی کی شاپنگ دل کھول کر کرے۔ ہر اہل سے اعلیٰ خریدی جا رہی تھی۔ آج بھی وہن کا ڈریس اپنی والدہ کے ہمراہ اوکے

کرنے جانا تھا۔ نصفے راحم کو تیار کر کے خود بھی بلکل ریڈی تھی لیکن اب گاڑی کی چابی مل کے نہ دے رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی ہر چیز الٹ پلٹ کے دیکھ رہی تھی پر گاڑی کی چابی نہیں مل رہی تھی۔ ”ارے سینف میں دیکھتی ہوں وہیں ہوگی۔“ وہ خود سے باتیں کرتی الماری کی طرف بڑھی تھی۔ سامنے کیبن میں نیلی فائل پر رکھی چابیاں اُسے نظر آ گئیں۔

”اوہ ٹھیکس گاڈ.....“ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر چابی اٹھائی تو نیلی فائل بے دھیانی میں اس سے نیچے آن گری۔  
”ارے..... دانیال بھی پتہ نہیں کدھر کدھر فائلیں رکھ دیتے ہیں۔“ وہ نیچے جھک کر کاغذ سمیٹ کر اس نے فائل میں رکھے تو وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔

اس نے جلدی سے فائل دوبارہ کھولی جس کے اوپر دانیال سرفراز میڈیکل رپورٹ لکھا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔  
دانیال کی میڈیکل رپورٹ..... وہ جوں جوں رپورٹس دیکھتی جا رہی تھی اس کے پیروں تلے سے زمین نکلتی جا رہی تھی۔ اسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اس نے ہوشکل فائل بند کر کے الماری میں واپس رکھی۔

”اے کیسے ہو سکتا ہے..... دانیال سرفراز..... نہیں نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی بیڈ پر بیٹھی وہ اپنی ہی سوچوں میں گم ہو گئی۔ تب ہی موبائل کی تیز بیل اور راحم کے رونے کی آواز نے اُسے حال میں پہنچایا تھا۔  
اس نے جلدی سے بچے کو گود میں لیا اور موبائل چیک کیا۔ نوید کی کال تھی۔  
”ہیلو.....“ اس نے لیس کا بٹن پریس کر کے

موبائل کان سے لگایا۔

”کہاں رہ گئی یار..... جلدی آؤ..... اماں..... انتظار کر رہی ہیں تمہارا.....“ نوید نے چھوٹے ہی کہا۔

”ہاں ہاں..... بس آ رہی ہوں دس منٹ تک.....“

”اچھا..... بائے.....“ لائن ڈسکنٹ ہوئی تو وہ کچھ سوچ کر راحم کو لے کر اماں کی طرف آ گئی۔

یہ کیسا انکشاف ہوا تھا اس پر جو اس کی ذات کے پرچے اڑا لے گیا تھا۔ اس کی ذات جو بہت بلند یوں پر بھی یکدم ہی نیچے آن گئی تھی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ اس کا اعتبار خاک میں مل چکا تھا۔ جسے اپنی پاکدامنی اور پاکیزگی پر مان تھا اب وہ پتھروں میں چکری چکی تھی جسے اپنا ہر کار دار ہونے پر فخر تھا وہ فخر ٹوٹ چکا تھا اُسے اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی۔ وہ پلید ہو گئی تھی اس کا جسم اس کی روح ناپاک ہو چکی تھی۔ اُسے شرم آ رہی تھی خود سے اپنے خدا سے..... وہ گناہگار تھی۔ اس کی دماغ کی نہیں سمجھنے کو تھیں۔ اس کا شوہر اس کا محافظ اس کے کانوں میں گرم سیسہ انڈیل کر باہر جا چکا تھا اس کا تن من جھک رہا تھا۔ وہ اندرونی کرب اور جنگ سے بڑھ چلا ہوا ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے گھر والے اسے اسپتال لے کر دوڑے تھے۔ جہاں ڈاکٹر نے اسے فوراً امیرونیسی میں شفٹ کر دیا۔

اس کا زوریں بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ اسے ہوش نہ آیا تو مرلیفہ کو مہ میں جاسکتی ہے اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے آپ لوگ دعا کریں بس..... ڈاکٹر نے نوید اور دانیال کو تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ نوید شدید پریشانی

اور اضطراب میں تھا خود دانیال بھی اپنی جگہ چور کھڑا تھا۔ وہ کیا بتاتا کہ اس کی بیوی کس ذہنی اذیت سے گزر رہی ہے۔

☆.....☆.....☆

آخر خدا خدا کر کے پورے دو دن بعد رتبہ کو ہوش آیا تھا ان دو دنوں میں وہ بالکل بچو کر رہ گئی تھی۔ بے جان جسم اور زرد رنگ گویا کسی پلیدی گرا دی ہو..... اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے راحم کو گود میں لینے اور دودھ پلانے سے انکار کر دیا جب اس کے سامنے راحم لایا گیا تو وہ ہڈیانی انداز میں چیخنے لگی تھی۔

”اسے لے جاؤ یہاں سے یہ گندا ہے۔“ یار دوں گی اس کو.....“ اُس کی آنکھوں سے شے لپکنے لگے تھے۔

دانیال کی والدہ نے بڑے پیار سے رتبہ کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”بٹی..... تمہارا بیٹا ہے تمہارا راحم.....“

”نہیں ہے میرا بیٹا..... کون ہے یہ؟“

کس کا ہے؟ میں..... میں..... پلید ہوں مجھے نہیں ہے۔ مجھے پاک کرو.....“ وہ زور زور سے چیخ کر رونے لگی۔ دانیال کی والدہ گھبرا گئی۔ خود رتبہ کے والدین بٹی کی حالت پر سسک رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دانیال کی والدہ کو کہا کہ بچے کو اس سے دالے جائیں یہنا ہو کہ اسے نقصان پہنچا دے۔

اس کی ذہنی حالت سے کچھ بعد نہیں..... یوں راحم دانیال کے کزن کی بیوی کی گود میں ڈال دیا۔

جب تک رتبہ ٹھیک نہیں ہو جاتی وہ اس کی دیکھ بھال کرے۔ اس نے یہ ذمہ داری خوشی سے قبول کر لی۔ وہ خود صاحب اولاد نہیں تھی سو راحم پاکر خوش ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

دانیال سرفراز نے کھانوں میں پھینک دیا تھا اپنے اور سکنے کے لیے رتبہ فجر سے شادی محض ایک دن دکھاوا تھی۔ اس نے اس کا انتخاب کیا ہی اس قصد کے لیے تھا وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی باپ نہیں ملے گا اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے وہ خود کو تباہ کر چکا تھا۔ گھر والوں کی طرف سے شادی لینے پر زور دیا جا رہا تھا آخر تک وہ انہیں مانا رہتا۔ اس نے اپنی رضا مندی تو ظاہر کر دی مگر ساتھ ہی رتبہ فجر کا نام بھی رکھ دیا کہ وہ اس شادی کرے گا۔ گھر والوں نے اعتراض کیا تو اس نے دھمکی دی کہ وہ پھر ساری عمر شادی نہیں کرے گا۔ رتبہ فجر سے شادی کرنے کی دوسری

دعا اس کا دوست فیضان احمد بھی تھا جسے رتبہ فجر کا نام نہ بھول نہیں پایا تھا۔ وہ دانیال سرفراز کا

بڑا بھائی تھا۔ وہ اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

شادی کی ساری پلاننگ اُسی کی تھی۔ اس لوگوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔

یار کا بھرم بھی رہ گیا اور فیضان احمد کا انتقام بھی لے لیا گیا۔

☆.....☆.....☆

رتبہ فجر کی ذہنی حالت بہت خراب تھی۔ دانیال سرفراز نے اس کے علاج میں کوئی کسر نہ کی تھی۔ مسلسل علاج سے رتبہ فجر میں سوچنے کی صلاحیت واپس آئی تھی۔ اس پر پہلے کی

شرابیائی کے دورے نہیں پڑے تھے لیکن اس کی ذات بچ کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں

میں نالی پن اور ویرانی نے ڈیرے بہا لیے تھے۔

یہ کوہ آکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی اگر وہ اس کو باپ آنے کی کوشش کرتا تو وہ چیخ چیخ کر اسے نہ دیکھتی۔ جیسے ہی اس کی نظروں سے وہ دور

ہوتا وہ نارٹل ہو جاتی۔ چار سال ہو گئے تھے

☆.....☆.....☆

اسے اذیت کاٹتے ہوئے..... اس کے جسم و جاں میں بدلے کی آگ سگ رہی تھی۔ وہ پیرس میں گزرے وقت کو یاد کرتی تو اس کی روح کا پ

جاتی۔ فیضان احمد اور دانیال سرفراز اسے مسلسل ایک ماہ بے ہوشی کی دوا دے کر لوٹتے رہے تھے۔

فیضان احمد کا خیال آتے ہی اُس کا خون کھول جاتا اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اُس کی جان لے لے

اور دانیال سرفراز کو عبرت کا نشان بنا دے۔

☆.....☆.....☆

دانیال سرفراز کے موبائل کی رنگ ٹون بجی تو اس نے موبائل کی اسکرین پر جھگکتے فیضان

کا لنگ حرف کو ناگواری سے دیکھا تھا اس وقت وہ اپنے بیدروم میں بیٹھا۔ آفس کی کوئی ضروری

فائل دیکھ رہا تھا۔ اُسے یہ ڈسٹربنس پسند نہیں آئی تھی۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی ایس کا مٹن پر ایس

کر کے موبائل کان سے لگایا تھا۔

”ہاں یار کیا حال ہے تیرا.....“ اُس نے اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔

دوسری جانب سے جانے کیا کہا گیا تھا کہ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”ادھر بھی سب اوکے ہیں یار..... تو فکر نہ کر بس پاکستان آنے کی تیاری کر تیری بلبل کا دماغ

اب ٹھیک ہے.....“ دانیال کا لہجہ ذومعنی تھا۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑی رتبہ فجر نے ہنسنے

اپنے آپ پر قابو پا رکھا تھا۔

”چل تیرا بدلہ تو پورا ہوا اور مجھے وارث مل گیا۔“ وہ بے شری سے پھر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”کب آ رہا ہے تو.....“ دانیال نے سوال کیا تھا۔

”اچھا اسی دن پھر تو شاندار سی پارٹی بنی ہے یار.....“



”چل میں بندوبست کرتا ہوں تو بھی کمال کرتا ہے تیرا دل نہیں بھرا ابھی اُس سے.....“

”ٹھیک ٹھیک یار..... بس تو اپنے باپ سے اس شاپنگ پلازے کے لیے زمین اوکے کروا..... میں تیرا کام کروں گا۔ اوکے اللہ حافظ۔“ دانیال سرفراز نے ابطہ منقطع کیا تو اس کے لبوں پر ہر اسرا سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

رتبہ فخر نے بڑی نفرت سے اسے دلال شوہر کو دیکھا اور خاموشی سے واپس پلٹ گئی اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس رات دانیال سرفراز اس کے پاس آیا تھا اور بڑے واضح لفظوں میں فیضان احمد کا مطالبہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ اگر وہ خود سے راضی نہ ہوئی تو نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

”اگر میں نہ کروں تو؟“ وہ جانتا چاہ رہی تھی کہ یہ شخص کس حد تک گرسکتا ہے۔

”تو پھر پیرس کے خوبصورت ہوٹل میں فیضان احمد کے ساتھ گزاری گئی راتوں کی ویڈیو میٹ پر ڈاؤن لوڈ کر دی جائیں گی۔“ وہ سر دلچسپی میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ رتبہ فخر کے پاس سوچنے کے لیے کل بج تک کا وقت تھا اور پھر شام کو اُسے فیضان احمد کے روبرو پیش ہونا تھا چاہے رضامندی سے یا پھر زبردستی.....

☆.....☆.....☆

اگلی صبح اچانک ہی دانیال سرفراز کی فیملی کو دوسرے شہر رشتے داروں کے ایک فنکشن میں جانا پڑ گیا۔ گھر پر صرف رتبہ فخر دو ملازم اور دانیال سرفراز رہ گئے تھے۔ موقع دیکھ کر دانیال نے دوسری جگہ جانے کی بجائے فیضان احمد کو اپنے گھر

فون کر کے بلوایا تھا۔ رتبہ فخر نے اپنی رضامندی دے دی تھی۔

☆.....☆.....☆

فیضان احمد آچکا تھا اور ڈرائنگ روم میں تواضع کے لیے پیش کیے گئے لوازمات سے بھرپور انصاف کر رہا تھا۔ دانیال اور اس کے قریبی رتبہ فخر کو خنجر کی مانند جسم میں اترتے محسوس ہو رہے تھے وہ بیڈ روم میں تھی۔

”یار کہہ رہے تمہاری وائف اور میری.....“ فیضان احمد نے بیہودگی سے دانیال کو آنکھ مارنے ہوئے کہا تھا۔

”اوپر بیڈ روم میں ہے تیار ہو رہی تھی۔ آجاتی ہے تم چائے پیو۔“ دانیال نے مسکراتے ہوئے کہہ کر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔

”یار بلاؤ اسے..... اکیلے چائے پینے کا کیا مزہ.....“ فیضان صوبنے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا تھا۔

”رشید..... رشید.....“ دانیال نے ملازم کو آواز دی۔

”جی صاحب.....“ ملازم جلدی سے حاضر ہوا تھا۔

”جاؤ بیگم صاحبہ کو نیچے بلاؤ..... کہو صاحبہ لوگ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔“ دانیال نے آرڈر دیا تو وہ جی صاحبہ کہہ کر اوپر کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

دروازے پر ہونے والی دستک رتبہ فخر کی جان نکال گئی۔ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے چھپایا تھا۔

”کون ہے آجاؤ.....“ اس نے خود کو نارمل کیا۔

”بیگم صاحبہ آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔“

”تم چلو میں آرہی ہوں۔“ وہ چلا گیا۔ تو بعد وہ بھی سیزھیاں اتر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں پستول

☆.....☆.....☆

ایمان احمد کی نظر رتبہ پر پڑی تو گھبرا کر اٹھ لا اڑا۔ دانیال نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی دنگ آیا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے اواز گئے تھے۔

”یہ کیا ہے رتبہ.....“ دانیال نے خود کو یاد کرتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔

”یہ تم دونوں کی موت.....“ دانیال اواز.....“ اس کی آنکھوں سے شرارے لپک رہے تھے وہ ان پر پستول تانے کھڑی تھی۔

”دیکھو اسے پھینک دو۔“ فیضان نے کہا تو رتبہ لگا کر گیس پڑی۔

”کیوں..... موت کو سامنے دیکھ کر رنگ اداں اڑ گیا تمہارا فیضان احمد۔“ وہ طنز سے اس نکتہ زدہ چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ دانیال اس کی طرف بڑھا تو وہ الٹ ہو گئی۔

”خبردار..... جو میری طرف ایک قدم بھی..... میں گولی چلا دوں گی۔“ وہ انہیں دھمکی دے ہوئے بولی تھی۔ پستول کی نال سے دونوں ہٹانے پر لیے ہوئے تھی۔ اس کے قدم خود بخود گئے۔

”آج یوم حساب ہے تم لوگوں کا..... میں تم لوگوں کو نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ جنوبی انداز میں بولی تو وہ ڈر گئے۔ اس سے معافیاں مانگنے لگے۔ لیکن وہ بالکل سرد اور

سپاٹ چہرہ لیے کھڑی رہی۔

پھر اچانک ہی اس نے فیضان احمد پر گولیاں چلا دیں ایک گولی اس کے سینے پر اور دوسری پیٹ پر ماری تھی۔ وہ منہ کے بل گر پڑا تھا فرش پر..... دانیال بھٹی بھٹی آنکھوں سے اُس کے جسم سے اچلتے ہوئے خون کو دیکھ رہا تھا کچھ دیر بعد وہ ساکت ہو گیا۔ اب دانیال سرفراز کی باری تھی اس کے چہرے پر موت کی ڈر دی تھی۔

رتبہ فخر نے باہر سے اندر بھاگتے قدموں کی آواز سنی تو جلدی سے دانیال پر فائر کھول دیے۔ تمام گولیاں اس کے سینے میں اُتار دی تھیں۔ رتبہ فخر کی آنکھوں میں نفرت کی آگ تھی۔ رشید اور چوکیدار اندر داخل ہوئے تو ٹھٹھک کر رک گئے۔

ان دونوں کو دیکھ کر رتبہ نے پستول نیچے کر لیا۔

خود ہی رشید کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ دانیال کے گھر والوں کو فون کرے پھر پولیس کو اطلاع کر دے۔

رشید نے ایسا ہی کیا تھا کچھ ہی دیر میں حیدر پولیس نفری کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

☆.....☆.....☆

حیدر رتبہ کی داستان سن کر بھیگی پلکوں اور جھکے سر کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔ اس کا دل درد کی کروٹوں سے بے حال تھا وہ ساری رات سو نہ سکا تھا۔ اگلی صبح اس کے لیے ایک دل دوزخبر لے کر آئی تھی دوہرے قتل میں ملوث سزا یافتہ رتبہ فخر سحری کے وقت جیل کی حالت میں مردہ پائی گئی تھی۔ موت کی وجہ حرکت قلب بند ہو جانا بتائی جا رہی تھی۔

☆☆.....☆☆

کراچی سے ارسال کردہ جرم و سزائے موضوع پر جاندار تحریر



## حصار

~~~~~

وہ شہر کے امیر ترین صنعت کار کا اکوٹا وارث تھا مگر دولاکھ میں اُس

کی گزر بسر مشکل تھی تو اُس نے ایک پلان بنا ڈالا اپنے باپ کو چت کرنے کا.....

~~~~~

## سید علی ارسلان

~~~~~

آخری بازی بھی جیتنے کی امید پر ہارنے کے بعد

ارشاد پتے میز پر رخ کراٹھا تو اسے اپنے باپ پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ حالانکہ اس شکست میں باپ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ارشاد نے کوٹ کی جیب ٹٹولی اور اندر رہی اندر نوٹ گئے پھر دانت پیتا ہوا اپنی کار میں آ بیٹھا۔

جیب میں کل اتنی رقم باقی تھی کہ اپنی شکست کا غم وکی کے دو یا زیادہ سے تین گلاسوں میں گھول کر پیا جاسکتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اب دو تین پیگ ارشاد پر خاطر خواہ اثر ڈالنے میں ناکام رہتے تھے۔ اس نے کچھ اس انداز میں انکیشن کی چابی گھمائی جیسے اپنے باپ کی گردن مروڑ رہا ہو۔ پھر اتنی قوت سے اسٹیل پیر پر دباؤ ڈالا گویا ایک سیلیٹر نہ ہو باپ کا زرخرہ ہو۔

سے نوشی کے دوران بھی اُس کا ذہن جھنجھلاہٹ کا شکار رہا۔

”ایسے باپ کے ہونے سے تو میں یتیم ہی بہتر تھا۔“ اس نے تنقید کر سوجا اور پیگ حلق سے نیچے

اتارنے لگے۔

تیسرا بیگ چڑھانے سے قبل اس نے رسواچ پر نظر ڈالی اور ہنسا کر میز پر گھونٹہ دے مارا۔ اٹھارہ تاریخ تھی۔ مہینے کے تیرہ دن اور باقی تھے۔ جیب خالی ہو چکی تھی۔

”یہ کلینڈر کا سوچد بھی کوئی بہت بڑا حرام زادہ کتے کا پلا پنڈرہ دن کا مہینہ بنا دیتا تو کیا میا مرچا اُس کی۔“ وہ با آواز بلند بڑبڑایا۔ لیکن اُس پاس میز پر بیٹھے لوگوں نے ذرا برابر توجہ نہ دی۔

یہ جگہ ہی ایسی تھی کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا کہ اپنے دکھ گلاسوں میں حل کر کے خون میں جذب کر تھا اور کوئی اپنی خوشیوں سے بے حال ہو کر مست تھا۔ ارشاد خامسی دیر میز پر بیٹھا رہا مگر آج کی شکست کا داغ ذہن سے نہ ہٹا۔

”قسمت تو سالی پہلے ہی فریبی تھی اب شراب بھی دعا باز ہو چلی ہے۔“ پھر ارشاد نے پہلے قسم اُس کے بعد شراب کو مغالطات سنائیں اور جب کہ زبان کی کوئی گالی اسے یاد نہ رہی تو اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆

پہلے کا وقت تھا جب ارشاد گھر میں داخل ہوا۔ لہذا ارشاد صاحب معمول اپنے وسیع و عریض والی سبز و شبنمی گھاس پر ننگے پاؤں چہل قدمی نہ تھے۔ انہوں نے ناگواری اور تاسف کے لیے تاثرات کے ساتھ ارشاد کو کار سے اترتے لہذا ارشاد پھیر کر دوبارہ ٹہلنے میں مشغول ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر ان کے نزدیک آ گیا۔

”ایڈی مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ ارشاد صاحب نے رخ پھیرا وہ بی بیوں اٹھا ارشاد پر نظر ڈالی اور کچھ کہے بغیر اپنا مشغل جاری

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے ڈیڈی۔“ ارشاد بی بی سے اپنا سوال دہرایا۔

”تو کہو.....“

”ایسا آخر تک ہوتا رہے گا؟“

”کیسا؟“

”ایسا ہی جیسا میرے ساتھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔“ ارشاد باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا تھا۔ ”میرے خیال میں تمہارے ساتھ کچھ برا تو نہیں ہوا نہ ہو رہا ہے۔“ دھامڑا صاحب محل سے بولے۔

”مجھے تو شبہ ہے کہ میں آپ کی سگی اولاد ہوں اور بھی اکلوتی۔“

”اب تو مجھے بھی تمہاری اصلیت پر شبہ ہونے لگا ہے۔“

محض تمہاری حرکتیں دیکھ دیکھ کر مگر اس شبہ کو یقین میں ڈھالنے کا مطلب تمہاری مرحومہ ماں پر بے اعتمادی کا ثبوت ہوگا اور یہ گناہ کبیرہ میں بھی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسی پاکباز عورت کا



ایسا بیٹا اچھا ہوا وہ بے چاری پودن دیکھنے سے پہلے مرگئی زندہ رہتی تو درگور ہو جاتی صرف تمہاری وجہ سے۔

”آج میں آپ سے صاف صاف بات کرنے آیا ہوں۔“ ارشاد دھامڑا صاحب کی تقریر سن کر اکتا چکا تھا۔  
”میں نے تمہیں نہیں روکا۔“

ارشاد دو قدم بڑھا کر باپ کے بالکل نزدیک ہو گیا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔  
”دو لاکھ روپے ماہوار کے جیب خرچ میں میرا گزارہ نہیں ہوتا۔“ ارشاد کی سانسوں سے اٹھتی ہوئی شراب کی بو نے دھامڑا صاحب کی طبیعت مکر کر دی۔

”تم نے پھر شراب پی ہے؟“  
”ہاں۔۔۔۔۔“ ارشاد نے فخر سے جواب دیا۔  
”کیوں؟“

”غم غلط کرنے کے لیے۔“  
”جہیں ایسا کون سا غم ہے سب سے بڑے روگ تو تم خود ہو جو مجھے لگا ہوا ہے۔“ دھامڑا صاحب نے طنز کیا لیکن ارشاد نے سنی اُن سنی کر دی۔

”غم یہ تھا کہ میں اپنی کل پونجی فلیش میں ہار چکا تھا۔ آخری پونجی ہارنے کا غم کم تو نہیں ہوتا ڈیڈی۔“

بیٹے کی گستاخی پر دھامڑا صاحب کڑھ کر رہ گئے۔ خون کا تلخ اور آنسوؤں کا نمکین گھونٹ پیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”تمہارا جیب خرچ اس سے زیادہ نہیں بڑھایا جاسکتا۔ دو لاکھ روپے مہینہ میں تمہارا گزارہ نہیں ہوا اتنی رقم میں تو خاندان کے خاندان بیل جاتے ہیں۔ عادتیں تمہاری وہ ہیں کہ تمہیں ایک پیسہ دیتے

ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔“

”درست کہہ رہے ہیں ڈیڈی آپ ایک پیسہ دیتے ہوئے بھی آپ کو دکھ ہوتا ہے ارشاد زہر خند سے مسکرایا۔

”تمہاری تمام ضروریات میری ذمہ ہیں۔ اس کے باوجود دو لاکھ روپے تمہیں کم ہیں۔“

”جی ہاں کم پڑتے ہیں۔“ ارشاد تن کر بولا۔  
”اس لیے کہ میں کسی کلرک کا بیٹا نہیں

آپ کا بیٹا ہوں سیٹھ امداد دھامڑا کا اکلوتا لاکھوں کروڑوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث۔“  
”کسی طبقے کا متخیر اڑانے سے چیختر یہ بھولو کہ سیٹھ امداد دھامڑا ابھی کسی زمانے میں کلرک رہ چکا ہے۔“

”میں تو رونا ہے ڈیڈی کہ ایک کلرک سے امداد دھامڑا اپنے کے بعد بھی آپ میں وہی عادتیں برقرار ہیں۔“

”اپنی حدود سے باہر مت نکلو۔“  
صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔  
”میں اپنی حدود کے اندر ہوں مگر آپ سے زیادہ محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔“ ارشاد پر اثر نہ ہوا۔

”مطلب کیا ہے تیرا ذلیل۔“ سیٹھ صاحب دھاڑے۔

”مطلب صاف ظاہر ہے اور میں پہلے ہی مرتبہ بیان کر چکا ہوں۔“  
ارشاد زکا۔

”اپنی اس بے حساب دولت کا آپ کیا کر گئے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں مگر پیسہ دھامڑا سے پکڑا ہوا ہے حیرت ہے برسوں سے اسی حال میں رہتے رہتے آپ کے دانت بھی کمزور ہو

چمکا ہوا بھی چمکے ہیں مگر پیسے کے بارے میں انا احموری تھی کا شہجہ دیا کا دیا ہی ہے۔“

”افغان ہو جا یہاں سے میں تیری صورت لینا نہیں چاہتا۔“ سیٹھ صاحب کا چہرہ سرخ ہوا۔

”آج میں صاف صاف بات کر کے ہی اعلان ہوں گا۔ میں نے بھی بہت برداشت کیا

ارشاد نے بھرپور اطمینان سے جواب دیا۔  
”کیا بات کرے گا تو مجھ سے میں تیری کوئی بات نہ مانیں چاہتا۔“ سیٹھ صاحب کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

”اگر برداشت کا مادہ اتنا ہی کم تھا تو مجھے پیدا نہ کی حقاقت ہی کیوں کی تھی۔“ ارشاد تند کی دھاڑا۔

”اپنے جامے میں رہ کیے۔“  
”جامے کے متعلق ہی تو معلوم کرنا چاہتا

مجھے اپنی حیثیت سے آگہی ہونی چاہیے۔“  
”تو ک لہجے میں رواں تھا۔“

”آج فیصلہ ہو کر رہے گا آپ کو مجھے بتانا ہوگا۔“  
”میں نے اس قدر کجی کا مقصد کیا ہے۔ آخر آپ کی اتنی دولت کس مد میں صرف کرنے کے واسطے سڑ رہی ہے۔ اگر آپ مجھے عاقبت میں تو بہتر ہے۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔“

”بڑے باپ کا نام ساتھ لگا ہے اور جیب میں ہوائی لٹری بھی نہیں۔“  
”سیٹھ صاحب گھاس پر پڑی کرسی پر بیٹھ گئے

”میں نے کہا شروع کیا۔“  
”یقین کرو میں نے کئی بار تمہیں عاق کرنے کے بارے میں غور کیا لیکن اپنی ماں کو دعائیں دو جو

بد نصیب کو تم سے بے انتہا محبت تھی اور مجھ بد بخت کو تمہاری ماں سے بے انتہا پیار تھا۔ وہی ایک باریک سا دھا کہ ہے جس نے مجھے اور تمہیں باندھ رکھا ہے کاش مجھے تمہاری ماں سے اس درجہ محبت نہ ہوئی تو میں کبھی کا تمہارے عذاب سے چھٹکارا پا چکا ہوتا۔“

”مگوا آپ مجھے اس طرح ترسا ترسا کر سزا دے رہے ہیں اور اپنا دل ٹھنڈا کر رہے ہیں۔“  
ارشاد نے ہونٹ سمجھ کر سوال کیا۔

”نہیں تمہیں ترسانا ہی مقصود ہوتا تو اس کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ میری پوری کوشش یہی تھی کہ تم کسی طرح راہ راست پر آ جاؤ اور کل جائیداد کی باگ دوڑ سنبھال لو لیکن تمہارے پچھن وہ نظر نہیں آتے۔“

”یعنی میں اسے دو لاکھ روپے کا اکلوتا بیٹا ہو کر بھی تاحیات محرومیوں کا شکار رہوں گا۔“

ارشاد کے سینے میں طوفان اٹھ رہے تھے اور اس نے بمشکل تمام ان طوفانوں پر بند باندھا ہوا تھا۔

”تاحیات نہیں۔“ سیٹھ صاحب نے طویل سانس لی۔

”میں خدا سے اور تم سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ مجھے ہر باپ کی طرح اب بھی یہی توقع ہے کہ تم بھی نہ کبھی راہ راست پر آ جاؤ گے۔ پھر یہ سب کچھ تمہارا ہوگا۔“

ارشاد نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں قہقہہ لگایا۔

”بہت خوب تو اب قبلہ والد صاحب اپنے ناخلف و نالائق بیٹے سے نہ صرف یہ کہ مذاق فرما رہے ہیں بلکہ بھلا بھی رہے ہیں یوں کہنا اور مناسب ہوگا کہ بہکار ہے ہیں۔“



سیٹھ صاحب نے بیٹے کی بے ہودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا وہ عادی ہو چکے تھے۔ نہایت محل سے انہوں نے سمجھا یا۔  
 ”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ نہ میں تمہیں بہلا رہا ہوں اور نہ ہی بہکا رہا ہوں۔ ایک آس ہے جو تمہارے سامنے بیان کر دی ہے۔ تم سدا ہر گئے تو یہ سب تمہارا ہے۔ میں نے وکیل صاحب کو وصیت بھی کر دی ہے۔“  
 وصیت کا نام سن کر ارشاد کے کان کھڑے ہوئے۔

”کیسی وصیت؟“  
 ”تمہارے بارے میں ساری ہدایات اس وصیت میں موجود ہیں۔“  
 سیٹھ صاحب نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔  
 ارشاد کے سارے بدن میں جیونیاں ریگنے لگیں۔

”ڈیڈی پلیز مجھے میرے مستقبل کے بارے میں کچھ تو بتا دیجیے۔“ اس نے سانپ کی مانند کینچلی بدل لی اور اس کا لہجہ بھی ملتجیانہ ہو گیا۔ کوئی اسے دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ارشاد ہے جو چند لمحے قبل اپنے باپ کو کاٹ کھانے کے لیے دوڑ رہا تھا۔

”تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا مستقبل محفوظ ہے۔“  
 سیٹھ صاحب کی آنکھیں بدستور مندی ہوئی تھیں۔

”آپ صاف کیوں نہیں کہتے؟“ ارشاد بے چینی سے تشکیلیاں مسل رہا تھا۔  
 ”یہ سب کچھ تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔“  
 ارشاد کی باچیس کھل گئیں۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر

باپ سے چٹ گیا۔  
 سیٹھ صاحب دھیسے سے مسکرائے اور انہوں نے اپنا فقرہ مکمل کیا۔  
 ”لیکن اس وصیت پر عمل درآمد ہونے کے لیے ایک مدت معیاد بھی ہے۔“  
 ”وہ کیا؟“ ارشاد کی کچھ کچھ میں نہیں آیا۔  
 ”اس وقت تمہاری عمر کتنی ہے؟“  
 صاحب زیر لب مسکرا کر سوال کیا۔  
 ”اکیس سال۔۔۔۔۔“ ارشاد امید و بہم درمیان آہستہ سے بولا۔

”پینتیس برس کی عمر میں سب کچھ تمہارا ہو جائے گا۔ ابھی تمہیں چودہ برس انتظار کرنا ہے۔ اس دوران اگر میں دنیا میں نہ رہا تو تم وصیت کے مطابق تمہیں وہی دولاکھ روپے ماہانہ جیب خرچ ملتا رہے گا جو اب مل رہا ہے۔ یہ مدت پوری ہونے کے بعد اگر میں زندہ بھی رہا تو سب کچھ تمہیں سوئپ دوں گا۔“  
 ”یہ وصیت ہے یا پہلی؟“  
 ارشاد جھلا گیا۔

”یہ وصیت ہے اور وکیل صاحب کے پاس محفوظ ہے۔“  
 سیٹھ صاحب گرتے کی جیب سے کان کر پڑا نکال کر اپنے کان کریدنے لگے۔

”چہ نہیں آپ کے ذہن میں کیسے کا خیالات آتے رہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی وصیت ہے اگر مجھے کچھ دینا ہی ہے تو یوں ہی دے دوں گا۔ اس شرط شرط کی کیا تک ہے۔ دوسرے یہ کہ چھ سال تک مجھے کالے پانی کی سزا میں جتلا رکھیں۔ آپ کیوں غلے ہوئے ہیں۔“ ارشاد کی آواز سے بھاپ نکل رہی تھی۔ باپ کے لیے وہ سارا پیار و فخر ہو چکا تھا جو ذرا دیر پہلے اس پر طاری

”یہ کالے پانی کی سزا نہیں ہے ایک طرح کی لہجہ ہے۔“ ارشاد نے دورانیہ ہے۔“ سیٹھ صاحب پھر آنکھیں بند کر لیں۔  
 ”یہ کچھ نہیں ہے۔“ ارشاد دفعتاً کھڑے ہو کر بولا۔  
 ”یہ بخش آپ کے بوڑھے اور کنجوس ذہن کی بات ہے مجھے اذیت میں مبتلا رکھنے کا بہانہ۔ لعنت ہے ایسی وصیت پر۔“

وہ زور زور سے پاؤں پٹختا ہوا اور وصیت کو ادا کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سیٹھ صاحب کے لبوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ پھیلتی رہی۔

☆.....☆.....☆  
 ارشاد طوفان باد و باران بھر دفتر میں داخل ہوا۔ اشتیاق رضوی اپنے موکل کے ساتھ بحث میں مصروف تھے۔

انہوں نے بلائے ناگہانی کے اچانک نزول سے پہلے کہ وہ کچھ کہنا شروع کیا۔  
 ”ارشاد تیزی سے بولا۔“  
 ”وکیل صاحب مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“  
 ”آپ تھوڑی دیر باہر انتظار کر لیجیے میں ابھی بات بولا تا ہوں۔“

”نہیں وکیل صاحب میں اس وقت صلیب پر جا رہا ہوں آپ کو میرے لیے چند لمحات نکالنا چاہیے۔“  
 ”آپ بھی چند لمحات توقف کر لیجیے۔“ وکیل نے نرم لہجہ میں کہا۔

”آپ کو میرے حالات کا اندازہ نہیں ہے۔“ اسی انتظار کا نہ کہتے۔ اگر آپ نے میری سلی نہ لیا۔“  
 ”ارشاد نے جھٹ

کی۔ نجات کی کوئی صورت نہ پاتے ہوئے اشتیاق رضوی نے اپنے موکل کو بے بسی سے دیکھا۔  
 ”معین صاحب برا مت منائیے گا۔ آپ ہی تھوڑی دیر کی مجھے مہلت دے دیں۔ صاحبزادے مجھے کافی پریشان دکھائی دے رہے ہیں میں ان سے کچھ گفتگو کر لوں۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔“ موکل نے ارشاد کو بغور دیکھا۔

”واقعی انہیں کوئی شدید پریشانی لاحق ہے خاصے حواس باختہ لگ رہے ہیں۔ میں انتظار کیے لیتا ہوں۔“

معین صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔  
 ”اب فرمائیے مسئلہ کیا ہے؟“ اشتیاق رضوی نے ارشاد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”مسئلہ بہت بڑا ہے میرے مستقبل کا سوال ہے۔“ ارشاد کرسی پر بیٹھ گیا۔  
 ”آپ جیسے دولت مند بھی اپنے مستقبل کے آگے سوالیہ نشان لگا رہے ہیں کمال ہے۔“

”مہی تو رونا ہے۔“ ارشاد مایوس و دل گرفتہ ہو گیا۔  
 ”چلیں پھر تفصیل بیان کرنا شروع کر دیں۔“  
 ارشاد کی حالت دیکھ کر اشتیاق رضوی بھی حیران تھے۔

”کیسی تفصیل کہاں کی تفصیل آپ مجھے میرا نوشتہ تقدیر پڑھ کر سنائیں جو تباہی و بربادی کی تاریکی میں لپٹا ہوا ہے۔“ ارشاد کی آواز بوجھل تھی۔

”میں سمجھا نہیں۔“  
 ”آسان لفظوں میں پوچھ رہا ہوں۔ ڈیڈی نے آپ کو کیا وصیت لکھوائی ہے؟“ وکیل صاحب چوٹے۔

”آپ کو کیا وصیت لکھوائی ہے؟“ وکیل صاحب چوٹے۔

”میاں خیریت تو ہے، سیٹھ صاحب کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں وصیت کا خیال کیسے آ گیا؟“

”سب کچھ ٹھیک ہے سوائے میرے..... میں جو کچھ دریافت کر رہا ہوں آپ اس کا جواب دیں۔“

ارشاد اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔  
”سیٹھ صاحب کی وصیت اول تو بینک کے لا کر میں محفوظ ہے دوسرے یہ کہ وصیت کا انکشاف وقت پر ہوتا ہے اس سے پہلے نہیں۔“

”برائے مہربانی زیادہ سنسنس پیدا نہ کریں۔ کل ڈیڑی اس وصیت کے متعلق مجھے تھوڑا بہت بتا چکے ہیں۔ میں آپ کی زبان سے بھی اس کا متن سننا چاہوں گا۔ اس وصیت میں میری کیا حیثیت ہے؟“

”وہی جو کسی بھی اکلوتے بیٹے کی کسی بھی دولت مند باپ کی وصیت میں ہو سکتی ہے۔“ وکیل صاحب نے گول مول جواب دیا۔

”میں ذاتی طور پر آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔“

ارشاد نرم پڑ گیا۔

”بجائے فرمایا آپ کی درخواست سر آنکھوں پر پھر بھی میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”اس سلسلے میں کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“

ڈیڑی نے میری تباہی و بربادی کا جو پروانہ آپ کو لکھوا دیا ہے میں وہی منہوں وصیت سننا چاہوں گا۔“

ارشاد کی آواز میں کڑواہٹ تھی۔

”معاف کیجیے سیٹھ امداد صاحب نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے وصیت دی ہے۔ کوئی بھی وکیل اپنے موکل سے اس قسم کی خیانت نہیں

کر سکتا۔ وقت آنے پر آپ کو سب علم ہو گا۔“

وکیل صاحب نے اٹل لہجے میں کہا۔

”آپ ناحق ڈرامہ بازی کر رہے ہیں۔“

ڈیڑی نے سرسری طور پر وصیت کی بابت ہے۔“

”تو پھر آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

اشتقاق رضوی نے نا کواری سے کہا۔

”یہ چودہ سال کا کیا چکر ہے؟“

ارشاد نے ٹوہ لینے کی غرض سے ادھر اور سوال

جڑ دیا۔

”ادھ تو آپ کو یہاں تک خبر ہے۔“ اشتقاق

رضوی کے ہونٹ تھیرے سکھ گئے۔

”جی ہاں اور اب بھی آپ مجھے نہ بتائیں گے

تو اپنے اس اعتماد کو بخروج کریں گے جو میرے دل

میں آپ کے لیے ہے۔“ ارشاد نے متنبیہ کیا۔

”تو سن لیجیے۔“ وکیل صاحب نے ہتھیار

ڈال دیے۔

”پینتیس سال کی عمر کو پہنچ کر آپ سیٹھ امداد

دھامڑا کے کل اثاثوں کے مالک بن جائیں گے

بس یہ ہے لب لباس اس وصیت کا۔“

وکیل صاحب اپنے پائپ میں تمباکو بھر لے

گئے۔

”اور پینتیس سال کی عمر تک میں کیا کروں گا؟“

”جو آپ کا دل چاہے۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

”بات ہو یا نہ ہو۔ وصیت کی رو سے یہی

ہو گا۔“

اشتقاق رضوی نے پائپ ساکالیا۔

”انتہائی احتیاط اور تکلیف دہ وصیت ہے۔“

”اب کچھ مجھے ملنا ہے تو پھر یہ چودہ برس کی قید

کا لکائی گئی ہے۔“ ارشاد کی تیوریاں چڑھ

گئیں۔

”یہ آپ جا کر اپنے ڈیڑی سے پوچھیں۔“

”اس صاحب گھرے گھرے کش لگانے لگے۔“

”انہوں نے آپ سے بھی تو اس شق کے

میں اظہار خیال کیا ہو گا۔“

”ہاں..... ایسے ہی سرسری انداز میں۔“

”تو آپ بتاتے کیوں نہیں؟“ ارشاد کی بے

کالی، لینے سے تعلق رکھتی تھی۔

”سیٹھ امداد دھامڑا کے خیال میں ابھی آپ

مالیغہ نا سمجھ اور نادان ہیں۔ سیٹھ صاحب نے یہ

سات عشرہ کی انتھک محنت اور عرق ریزی کے صلے

میں حاصل کی ہے۔ معاف کیجیے گا آپ فی الحال

مالی تو قعات پر پورے نہیں اتر رہے ہیں وہ سمجھتے

ہیں۔ ابھی آپ کا ذہن کچا ہے۔ چودہ سال کی

عمر گزرنے تک نہ صرف آپ ذہنی طور پر بالغ

ہو جائیں گے بلکہ کافی حد تک تجربہ کار بھی یہ

مالی بھی ہو جائے گا کہ پیسہ کس طرح حاصل کیا

جانا ہے کیسے خرچ کیا جاتا ہے اور اس کی حفاظت

ان طریقوں سے ہو سکتی ہے۔“

”اور چودہ سال تک میں ان دو لاکھ روپے

کا گزارہ کروں جو بطور جیب خرچ مجھے عطا کیے

جاتے ہیں۔“

ارشاد نے طنز کیا۔

”یقیناً.....“

”اس رقم میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے جتنا آپ

چاہیں۔“

”وہ کیسے؟“

ارشاد نے بلبلا کر پوچھا۔

”وہ ایسے کہ آپ کوئی کام دھندا شروع

کر دیں سیٹھ صاحب بھی خوش ہوں گے اور ممکن

ہے وصیت میں تبدیلی کر ڈالیں۔ آپ کا وقت بھی

کلے گا اور نت نئے تجربے بھی ہو جائیں گے۔“

”لاحول ولا قوۃ.....“

وکیل صاحب کی تجویز سن کر ارشاد طیش میں

آ گیا۔

”ڈیڑی کی دولت سات پشتوں کو کافی ہے اور

میں کام دھندا شروع کر دوں۔ بہت خوب آپ

کے مشورہ کا بہت بہت شکریہ وکیل صاحب رہا

وقت تو وہ دیگر دلچسپیوں میں بھی کٹ جاتا ہے اور

نت نئے تجربے بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ رہے

آپ کے سیٹھ صاحب تو انہیں خوش کرنے کا مجھے

کوئی شوق نہیں وہ مجھے تکلیف دہ سپہری کے عالم میں

دیکھ کر ہی خوش رہتے ہیں جیسی انہوں نے یہ انوکھی

وصیت ایجاد کی ہے ٹھٹھ ہے ایسے باپ پر اور ایسی

وصیت پر۔“

ارشاد غصے میں بھرا ہوا کرسی سے اٹھا اور تپائی

کو زور وار ٹھوکر رسید کرتا ہوا دفتر سے رخصت

ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

سمندر کا کنارہ ہو خشک ہوا چل رہی ہو سورج

ڈوبنے کو ہو اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ساتھ میں کوئی

نہوانی وجود اور بھی پسندیدہ موجود ہو تو دل خود بخود

بلیوں اچھلنے لگتا ہے نظریں رقص کرنے لگتی ہیں اور

سمندر کی لہروں کے تھپڑے منتشر سے منتشر ذہن کو

بھی تھکنے لگتے ہیں۔

لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ ارشاد کو

خشک ہوا لوہو بن کر چسید رہی تھی سورج کے رنگ

رنگ دل بھی ڈوب رہا تھا آنکھیں بھی ہوئی تھیں

اور لہروں کے تھپڑے دماغ کو طمانچہ مار رہے

تھے غشی نے اسے اتنا افردہ بھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ منتظر رہی کہ ارشاد حسب عادت اس کی تعریف کرے میٹھی میٹھی باتوں سے دل بھائے اور انہی وعدوں کو از سر نو تازہ کرے جو وہ ہر ملاقات پر کیا کرتا تھا۔

وہی کیا ہر جوڑا شادی سے قبل کیا کرتا ہے۔ مگر ارشاد کی خاموشی نہ ٹوٹی وہ نہ جانے کن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ارشاد“ عشی نے آہستہ سے اُسے پکارا ارشاد پر کوئی اثر نہ ہوا۔  
”ارشاد“ اس بار عشی کی آواز قدرے بلند تھی۔

”ہوں“ ارشاد چونک پڑا۔  
”کیا ہو گیا تمہیں“ کہاں کھوئے ہوئے تھے۔ عشی نے لہجے میں محبت کی مٹھاس بھر کر پوچھا۔

”اپنی تقدیر کی گہری اندھی کھائیوں میں۔“  
”ہیں“ عشی نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“  
”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اب ارشاد دھماڑا کی حیثیت لگی کے آوارہ کتے سے زیادہ نہیں رہی۔“  
”کیا بکواس ہے۔“ عشی کے انداز میں بے یقینی تھی۔

”حقیقت ہے اور اس سے فرار ناممکن ہے۔“  
”آسان الفاظ میں بتاؤ۔“  
ارشاد نے عشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”جو میں پوچھوں سچ بتانا۔“  
”وعدہ کرو۔“  
”وعدہ۔“

”تم میرے ساتھ کہاں تک چل سکتی ہو؟“

”جہاں تک تم چلو گے۔“

”اور اگر میں راستے میں رک گیا تو۔۔۔۔۔“  
”تو میں بھی رک کر تمہارا ساتھ دوں گی عشی نے وثوق سے کہا۔

”زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ رک سکتی ہوں ارشاد نے جما جما کر پوچھا۔ اس کے سوالات نے عشی کو الجھا دیا تھا اور یہ ابھی سن چرے سے مترشح تھی۔

”جتنا تم ٹھہرے رہو گے۔“  
”سچ۔۔۔۔۔“ ارشاد خوش ہو گیا۔  
”ہاں۔۔۔۔۔“

”تو تم مجھ سے شادی کرو گی؟“  
”یہ سوال تم خدا جانے کتنی دفعہ پوچھ چکے اور ہر دفعہ میں نے اقرار میں جواب دیا ہے۔ شرماتے کی کوشش میں تھی۔

”شادی کے لیے کتنا صبر کر سکتی ہو؟“  
”الاحمدود۔۔۔۔۔ عورت کی محبت کی معراج شادی ہوتی ہے اس معراج کو چھوٹنے کے لیے وقت پابندی نہیں ہوتی۔“

”یعنی تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہے؟“ عشی خاموشی سے گردن جھکالی۔ اس کا سر اثبات میں چمکا تھا۔  
”لیکن۔۔۔۔۔ وہ شوکت مرزا؟“ ارشاد کی آواز میں طنز تھا۔ عشی کے خدو خال پر نفرت کی چادر گئی۔

”اوہو اس کا نام کہاں سے آ گیا۔ وہ دوست ہے میرا اور بس۔۔۔۔۔ بھلا اس کنگلے سے کون بدمعاش باندھے گا۔“ ارشاد کو جہاں سرت ہوا وہاں عشی کے جملے کے آخری حصے نے مغصوم کر دیا۔

”عشی۔۔۔۔۔ تمہیں۔۔۔۔۔ میرے ساتھ شادی کے لیے چودہ سال انتظار کرنا پڑے گا۔“  
”نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ عشی کو جھکا لگا۔“  
”کیوں۔۔۔۔۔ کیا تمہیں عمر قید کی سزا ہو گئی۔“  
”اس سے بھی بڑھ کر۔“ ارشاد مایوسی سے کہتا تھا۔  
”کل دو لاکھ روپے میں ہم دونوں گزارہ نہیں لیتے۔ میں اکیلا ہی مصیبت میں رہتا ہوں۔“  
”دو لاکھ۔۔۔۔۔ عشی کی شکل سوالیہ نشان میں اعلیٰ گئی۔  
”کھل کر کہو۔“  
”ڈیڈی کی وصیت کے مطابق میں چودہ سال ان کی ملکیت کا حقدار بن سکوں گا۔“ اس نے اتنی خود دہائی سے کہا۔  
”عشی نے قہقہہ لگا دیا۔  
”یہ وصیت ہے یا لطیف؟“  
”میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا مگر یہ جو کچھ بھی کہتا ہے جو میں نے تمہیں بتایا۔“  
”تو چودہ سال تک تم کیا کرو گے؟“  
”انہی دو لاکھ روپوں میں وقت کاٹنے کی کوشش کروں گا جو بطور جیب خرچ مجھے ملتے ہیں۔“  
”استان غم سناتے سناتے ارشاد پڑ مردہ بن گیا۔“  
”نرا لانا حق ہے مجھے تمہارے ڈیڈی سے اس مال کی امید نہیں تھی۔ تم ان سے بات کیوں نہیں کرتے۔ چودہ سال بعد جب وہ دولت تمہارے پاس آئے گی تو تمہارے کس کام کی ہوگی۔ جوانی نہ بے دن تو تم گزرا رہی جگے ہو گے۔ زندگی ان لطف اندوز ہونے کے لیے کیا باقی رہ جائے گا ان بیٹھے نوٹ گنتے خوش ہوتے رہنا پھر یہ کہ مال اتنی معمولی رقم میں بسر کرنا جوئے شیر

لانے سے بڑھ کر ہے۔ مہنگائی بھی وقت کے ساتھ بڑھتی رہے گی۔ میری رائے تو یہ ہے کہ تم چودہ سال کا یہ عرصہ جیل میں کاٹ لو۔ وہاں کم از کم اپنی حالت پر دل تو نہیں کڑھے گا۔ دو لاکھ روپے میں تو تم معاشرے میں اٹھنا بیٹھنا تو درکنار سانس بھی نہیں لے سکتے۔“

”تقریر کرنے سے بہتر ہے کہ تم مجھے کوئی تدبیر سمجھاؤ۔“ ارشاد نے بیزار سے کہا۔  
”میں بھلا کیا کر سکتی ہوں تم اپنے ڈیڈی کو سمجھاؤ قائل کرو اور انہیں اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے دلائل دو۔“

”کس قسم کے دلائل۔“  
پھر عشی دیر تک ارشاد کو سمجھاتی رہی۔ وہ سر ہلاتا رہا۔

☆.....☆.....☆

سیٹھ امداد دھماڑا کو چڑا سی نے مطلع کیا کہ ارشاد آفس میں آیا ہے تو انہیں تعجب ہوا۔ انہوں نے دیوار گیر کلاک کو دیکھا۔ شام کے آٹھ بجے تھے۔ یہ وقت ارشاد کلب میں گزارتا تھا۔ پھر بے وقت اُس کی آمد چہ معنی دارد۔۔۔۔۔

پہلے تو وہ یہی سمجھے کہ ارشاد کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو گیا ہے اور وہ کاروباری معاملات میں دلچسپی لینے کا آغاز کر رہا ہے۔ ان کے دل میں انبساط کی موج اٹھی لیکن۔۔۔۔۔ ارشاد کے ساتھ بات چیت نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔  
ارشاد نے بغیر کسی لپٹی رکھے کہا۔

”ڈیڈی میں اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر چکا ہوں اور اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ ارشاد کے طرز کلام نے سیٹھ امداد دھماڑا کو بہت کچھ سمجھا دیا۔

”جب تم فیصلہ کر ہی چکے ہو تو میرے پاس



آنے کا فائدہ۔“

”میں آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔“  
”مشورہ فیصلہ کرنے سے پیشتر کیا جاتا ہے۔  
کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد مشورہ فضول ہوتا ہے۔“  
ارشاد نے ان کے جملے کی گہرائی پر توجہ نہ دی۔  
”میں شادی کر رہا ہوں۔“

”اچھا فیصلہ ہے خوشی بھی ہے کہ تم نے پہلے ہی  
مجھے اطلاع دے دی میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کسی روز  
اپنی شادی کا دعوت نامہ مجھے پہنچاؤ گے۔ کون ہے  
وہ لڑکی؟“

”عشی۔“

”کیا تمہارا ارادہ ٹل ہے؟“

”جی ہاں۔“

”پھر مشورہ کس لیے؟ اگر عشی کے بارے میں  
پوچھنے آئے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی وہ اچھی لڑکی  
نہیں ہے۔“

”میری اس سے پرانی ملاقات ہے ڈیڑی۔  
میں آپ سے بہتر اسے جانتا ہوں۔“ ارشاد نے  
ہٹ دھری کا مظاہرہ کیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ جب میری رائے کی  
کوئی اہمیت نہیں تو تمہیں میرے پاس آنے کی  
ضرورت کیا تھی؟“

”یہ دریافت کرنے کی شادی کے بعد ہم  
دونوں کا کیا بنے گا۔ دولاہمیں دو افراد گزر بسر  
نہیں کر سکتے۔“

”کر سکتے ہیں۔“ سیٹھ صاحب نے اطمینان  
سے کہا۔

”جب میری شادی ہوئی تھی تو میری تنخواہ چند  
ہزار تھی۔“

”اُس زمانے کا تذکرہ چھوڑیں۔ اس وقت  
آپ صرف امداد و ہامڑا تھے سیٹھ امداد و ہامڑا

نہیں اور آپ کے والد بھی معمولی حیثیت کے  
مالک تھے۔ میری پوزیشن دوسری ہے میں  
امداد و ہامڑا کی اکلونی اولاد ہوں وہ سیٹھ امداد و ہامڑا  
کا شمار ملک کے گئے چنے سرمایہ داروں میں  
ہے۔“

”جو بھی ہے۔۔۔۔۔ میں تمہارے فیصلے میں دخل  
نہیں ہورہا تو تمہیں بھی مجھے نصیحت کرنے کا حق  
نہیں پہنچتا۔“

”یہ نصیحت نہیں ہے مسئلہ ہے۔“

”تو اس مسئلے کو حل کرنا بھی تمہارا کام ہے اگر  
دو لاکھ روپے کم پڑتے ہیں تو تمہیں اس میں  
اضافے کے لیے ہاتھ پاؤں بلانا چاہیں۔“

”مجھے یہ زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے  
آخر آپ کی بے حساب دولت جسے بڑے بڑے  
دیمک لگ رہی ہے کس کے کام آئے گی؟“ ارشاد  
کی آواز سے شعلے پھنکائیں مار رہے تھے۔

”یہ دیمک زدہ دولت تمہارے ہی کام آئے  
گی لیکن چودہ سال کے بعد اس وقت تک تمہیں اپنے  
بند و بست خود کرنا ہوگا۔“ سیٹھ صاحب نے فیصلہ  
کن لہجے میں کہا اور سر جھکا کر فائلوں میں غرق  
ہو گئے۔

ارشاد کے رگ دپے میں آگ دوڑ رہی تھی  
اُس کا جی چاہا کہ سیٹھ صاحب کو کچا چبا جائے مگر  
مسئلے کا حل نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

”تو تمہارے ڈیڑی ٹس سے بس نہیں  
ہو رہے۔“ عشی نے ارشاد کی داستانِ غم سن کر  
حسرت سے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“

”مجھے تو تمہاری دلہیت پر شک ہونے لگا  
ہے۔ کہیں تم سیٹھ صاحب کے لے پالک تو نہیں

لائی ہاپ اس قدر عالم نہیں ہو سکتا۔“ عشی کے  
انداز میں استہزائیہ کاغذ نمایاں تھا۔

”مجھے بھی شبہ ہے اپنی دلہیت پر نہیں بلکہ  
ایلی کی دماغی حالت پر۔۔۔۔۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔ اب کیا ارادہ ہے؟“

”میں تو خود تم سے یہی معلوم کرنے آیا  
اں۔“ ارشاد نے امید و بہم کے درمیان کہا۔

”میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔“ عشی کسی قدر نخوت  
نے بولی۔

”فیصلہ۔۔۔۔۔“

”کیا فیصلہ؟“

”شادی کا فیصلہ ان حالات سے دوچار رہتے  
اے بھی تم مجھ سے شادی کر لو گی؟“ عشی تذبذب  
میں مبتلا ہو گئی پھر سمجھاتے ہوئے بولی۔

”یہ تو تمہیں سوچنا چاہیے اتنی معمولی رقم تمہیں  
اپنی پوری نہیں پڑتی۔ اوپر سے میرا بوجھ۔“ عشی نے  
جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ لیکن یہ ادھورا  
بہلہ اپنی جگہ مکمل تھا۔

”یعنی تمہارے وہ سارے وعدے وعید  
بھوٹے تھے۔“ ارشاد نے اُسے قہر آلود نگاہوں  
سے گھورا۔

”وعدے وعید حالات کے پابند ہوتے ہیں  
ارشاد۔“

”اور وہ محبت کے دعوے۔“

”دعوؤں سے نہ تو تن ڈھانپا جاسکتا ہے نہ  
ہایت بھر سکتا ہے تم غور کرو تو مجھے غلط نہیں پاؤ گے  
اپنی حسرت زدہ زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ ہم  
تباہی رہیں۔“

ارشاد کے دل میں ایک کرنی پھوٹی اس  
نے جھٹ کہا۔

”تو تم میرا چودہ سال انتظار کرو گی۔“ عشی

سوچ بچار میں پڑ گئی۔ ارشاد اسے ایسے ہی دیکھ رہا  
تھا جیسے مقدمہ کے اختتام پر طرمج کو دیکھتا ہے۔

”بولو نا جواب دو۔“

”اگر تم بھی یہی وعدہ کرو تو میں تیار ہوں۔“  
عشی کے طرزِ مخاطب میں اعتماد کا فقدان تھا لیکن  
ارشاد محسوس نہ کر سکا۔ اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا  
کہ عشی چودہ برس اس کا انتظار کرنے کو تیار ہے۔ وہ  
سرت سے دیوانہ ہو گیا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں عشی۔۔۔۔۔ چودہ سال تک  
میری زندگی کا یہ فریم خالی رہے گا اور اس میں فقط  
تمہاری ہی تصویر لگے گی اب تو خوش۔“

”بہت خوش۔“ عشی کے الفاظ اس کے انداز  
سے میل نہیں کھا رہے تھے۔ مگر ارشاد کو اتنا ہوش ہی  
کہاں تھا کہ اس کے الفاظ و انداز پر توجہ دیتا۔

☆.....☆.....☆

وقت کو گزرنے سے کوئی نہیں روک سکتا نہ ہی  
اُس کی رفتار بڑھائی جاسکتی ہے۔ خوشیوں کے  
زخموں میں گھرے ہوئے دلوں سے یہی دعا نکلتی  
ہے کہ وقت قلم جائے ایسا نہیں ہوتا۔ وقت کو قید کبھی  
کر کاٹنے والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وقت میں  
جہاز کا انجن لگ جائے اور وہ برق رفتاری سے اڑتا  
چلا جائے۔ ایسا بھی کبھی نہیں ہوتا۔

ارشاد جس طرح ایک ایک دن کاٹ رہا تھا یہ  
اُس کا دل ہی جانتا تھا۔ روزِ منج اٹھ کر وہ کلینڈر  
دیکھتا اور گزری ہوئی تاریخ پر قلم سے کراس کا نشان  
لگا دیتا۔

عشی سے ملے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور  
ان سات دنوں میں ارشاد شدید اعصابی تناؤ کا  
شکار رہا تھا۔ وقت کی سست رفتاری اس کے لیے  
دوبال جان بنی ہوئی تھی۔

اس ایک ہفتے میں سیٹھ امداد و ہامڑا کے ساتھ

بارہا اس کے معر کے ہوئے تھے۔ جھنجھلاہٹ کے باعث اس نے اپنی زبان درازیوں کے جوہر خوب دکھائے تھے، بعض اوقات تو سیٹھ صاحب بھی اُس کے گڑے ہوئے تئور دیکھ کر کہم جاتے اور درگزر سے کام لیتے لیکن ارشاد کا پارہ اپنے عروج پر تھا۔ کئی بار تو ہاتھ پائی تک نوبت پہنچ گئی اور یہاں سیٹھ صاحب کی فہم و فراست نے ٹال مٹول کی وگرنہ خدا معلوم کیا ہو جاتا۔

وہی تناؤ اور اعصابی تحکین کو دور کرنے کا واحد علاج ارشاد کے نزدیک عیسیٰؑ۔ وہ اٹھتا رہا کپڑے بدلے اور عیسیٰؑ فلیٹ کو روانہ ہو گیا۔ فلیٹ کے دروازے پر دستک دی تو کافی دیر کوئی جواب نہیں آیا۔ ارشاد نے دوبارہ دروازہ دھڑ دھڑایا۔

”کون ہے بھئی کیا مصیبت ہے۔“ اندر سے  
عشی کی بیزاری میں ڈوبی ہوئی آواز طلوع ہوئی۔  
”میں ہوں ارشاد.....“

توقع تھی کہ نام بتاتے ہی دروازہ کھل جائے گا مگر پھر بھی دس منٹ کے لگ بھگ لگا۔ عشی نے دروازہ کھولا وہ اس کے سامنے تھی۔

”ارشاد تم اس وقت کیسے؟“ عیسیٰ کی گھبراہٹ نے ارشاد کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس کا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنک رہا تھا جب نام بتانے کے باوجود دروازہ کھلنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ اس نے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہیں کیا۔

”ایسے ہی آ گیا۔ طبیعت بوجھل تھی۔ سوچا تم سے مل آؤں۔“ ارشاد نے اندر داخل ہونے کے لیے قدم بڑھائے۔ عشی بڑھلا گئی۔

”اندر کہاں جا رہے ہو کمرے کی حالت بہت خراب ہے۔ تم ٹھہرو میں تیار ہو کر آتی ہوں کہیں باہر چلیں گے۔“

”باہر جانے کی کیا ضرورت ہے میں تم سے باتیں کرنے آیا ہوں کمرے میں ہی مناسب رہے گا۔“ ارشاد ڈٹا ہوا تھا۔

”اندر بہت ٹھٹھن ہے۔“ عشی برابر مدافعت کر رہی تھی۔

”تمہاری طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔“

”باجہری بہت مٹھن اور جس ہے عشی“ تم میری طبیعت کی فکر نہ کرو یہ تو پہلے ہی خراب ہے اور بکڑ مٹی تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔“ ارشاد نے عشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ذوق منعی فقرہ کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں پھیلی ہوئی تباہ کوکی ہبک سوکھ کر ارشاد نے تنہے پھلائے۔

”عشی یہ تمہا کو کیوں کیسے..... تم تو سگریٹ نہیں  
 پیتیں؟“ ارشاد نے عشی کی سمت رخ کیا۔ عشی کے  
 چہرے پر ہوا بیاں اڑ رہی تھیں۔

”عادی نہیں ہوں، تنہائی میں دل گھبراتا ہے تو کبھی کبھی پی لیتی ہوں۔“

”بس تہائی میں پیتی ہو؟“ ارشاد کی آواز میں  
لاکی کاٹ تھی۔

”ہاں.....“ ہشی نے اقرار میں گردن ہلائی۔  
 ”کون سا سگریٹ پیتی ہو؟“

”گولڈ ایف.....“ عشی کو سگریٹوں کے براؤں  
س پہنی نام فی الوقت یاد رہ گیا تھا۔ ارشاد نے پھر  
سے فضا کو سونگھا۔

”لیکن عشی ڈیر یہ خوشبو گولڈ لیف کے تمباکو کی نہیں ہے۔“

”پھر غالباً کیپٹن ہوگی۔“ ہنسی کا رنگ فق ہوتا  
ارہا تھا۔ دوسرا نام اُسے کیپٹن کا یاد آیا۔

”نہیں جان یہ تو ارن مور کے تمباکو کی مخصوص  
شبو ہے اور یہ تمباکو سگریٹ کا نہیں..... پائپ  
س بھر کر پیا جاتا ہے۔“ ارشاد نے آگے بڑھ کر

۱۔ قدم مسہری کے کنارے پر رکھا اور ہاتھ بڑھا  
۲۔ نیلیے کے نیچے سے جھانکتی ہوئی ایرین مور کی ڈبیہ  
۳۔ اٹھائی۔

”چند!..... یہ تمہا کو تو شوکت مرزا پیتا ہے۔ کیا نہیں دےئے کو اس کے پاس یہی تحفہ رہ گیا تھا؟“

اور اس مسلسل تیر برد سار ہا تھا اور تمام راستے مسدود  
پاراشی نڈ حال ہو چکی تھی تاہم اس نے ہمت نہیں  
ہاری۔

”ہاں..... وہ یہاں آیا تھا..... کبھی کبھی آ جاتا  
نہ میرے منع کرنے کے باوجود۔“

”تو ڈارنگ اسے سختی سے روکنا“ ارشاد کا  
ابن اہل رہا تھا لیکن آواز میں غضب کا ٹھہراؤ اور  
”نوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔“

”ہاں اب میں اسے ہمیشہ کے لیے منع  
لڑووں گی۔“ رفتہ رفتہ عیسیٰ کی جان میں جان آرہی  
تھی۔

”وہ کب آیا تھا؟“  
”بہت دیر ہو گئی۔“

”کب واپس گیا؟“  
”تقریباً دو گھنٹے پہلے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ ارشاد نے پُرسکیون جو کر اپنا  
ہن صوفی برگر ادا کیا۔

” کافی بناؤں تمہارے لیے۔“ عشی کی  
بلایت بحال ہو چکی تھی۔

”نہیں..... رہنے دو اتنا ہی کافی ہے۔“  
 ارشاد کا عمیق جملہ عشی کو جو کتنا کر گیا۔

”کتنا کافی ہے۔“

”یہی کہ دو گھڑی تمہارے ساتھ گزاروں۔“

اسرار اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اٹھتے ہوئے ارشاد انانیت سے بولا۔

”عشی ڈیراب میں پرسوں آؤں گا۔ شام کے ٹھیک سات بجے سینڈس پٹ چلیں گے۔“

”بہت نیک خیال ہے۔“ عشی اب مسکرانے

”میں سینڈوچز اور کافی تیار کر لوں گی۔“

”ہاں سینڈ وچز..... واقعی سینڈ وچ بھی حیرت انگیز سے ہے۔“ ارشاد نے گھمبیر آواز میں کہا۔

”اور تمہارا تو کوئی جواب ہی نہیں.....  
سینڈوچ بنانے میں۔“ مکالمے کا آخری حصہ اس

”اچھا خدا حافظ‘ پرسوں شام ٹھک سات

بجے۔“ ارشاد نے یاد دہائی کرائی۔  
”مجھے یاد ہے خدا حافظ۔“ عیسیٰ نے الوداع کہا

میں آ کر بیٹھ گیا۔ مگر اس نے کار اشارٹ نہیں کی۔

پندرہ بیس منٹ اس نے انتظار کیا اور پھر سے عشی کے فلیٹ کی جانب قدم بڑھا دیے۔

پوچھا۔

”پتہ نہیں بے وقت کیسے آگیا۔ دراصل اس کے باپ کی وصیت نے اس کے پیچ ڈھیلے کر دیے ہیں۔“ عیسیٰ کا طنز آلود فقرہ ارشاد کے سینے میں برما بن کر اتر گیا۔

”بے چارہ اپنے حواسوں میں ہی نہیں رہا ہے۔ نہ جانے چودہ سال زندہ بھی رہے گا یا اسی غم میں کھل کھل کر بہہ جائے گا۔“

”اب کیا کہہ رہا تھا؟“ شوکت مرزا حسد سے بولا۔

”پرسوں اے گا اور مجھے ساتھ لے کر سینڈس پٹ جائے گا۔“ عیسیٰ نے ارشاد کا مضحکہ اڑایا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اسے اتنا سر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ چودہ سال تک تو اس میں اور کسی فقیر میں کوئی فرق نہیں۔“

”ڈرائنگ..... وضعداری بھی کسی چڑیا کا نام ہے ایک دم پتہ کاٹنا مناسب نہیں مجھے تو بے چارے پر ترس بھی آتا ہے میں نے یکا یک ہری جھنڈی دکھا دی تو کہیں خود کی نہ کر لے۔“

”تمہاری بلا سے کس کم جہاں پاک۔“

”اتنے ظالم نہ بنو۔ وہ بھی میرا دوست رہ چکا ہے۔ تمہیں تر دہیں کرنا چاہیے مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔“

”یہی وعدہ تم نے ارشاد سے بھی کیا تھا۔“ شوکت مرزا نے شکوہ کیا۔

”وہ وعدہ جھوٹا تھا بھی تو تمہیں بھی اس کے متعلق بتایا۔“ عیسیٰ زور سے ہنسی ارشاد کی آنکھوں کی جگہ انگارے دکھ رہے تھے دماغ کی جگہ لاوا ابل رہا تھا۔

”اچھا..... اب میں چلتا ہوں۔“

”پھر کب آؤ گے؟“

”کل اسی وقت.....“

”میں انتظار کروں گی۔“ عیسیٰ نے بڑے چاؤ سے کہا۔

”میں زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا کیونکہ میں خود بھی زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“ شوکت مرزا کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پٹاخہ چلنے کی صدا بھی ارشاد کے کانوں نے سنی۔ وہ تیزی سے ہٹ گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس مرتبہ اس نے کار اسٹارٹ کرنے میں پھرنی کا مظاہرہ کیا اور ایسیلیٹر پر پورا دباؤ ڈال دیا۔ اس کا چہرہ شعلہ رنگ ہو چکا تھا۔ عضلات تنے ہوئے تھے اور سارے بدن میں شکست و ریخت کا عمل جاری تھا۔

پھر دفعتاً اُس کی آنکھوں کے انگارے بھگ گئے اور ان انگاروں کی جگہ کامیابی کی چمک نے لے لی۔ چہرے کے نقوش بھی ڈھیلے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ ایسا نتیجہ جو ہر پہلو سے اس کے مفید تھا۔ بغیر لاٹھی کے سانپ مر رہا تھا اور سانپ کا منکا بھی ہاتھ آ رہا تھا۔ اس نے خوشی سے بے قابو ہو کر گاڑی کو دیوانہ وار لہرانا شروع کر دیا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سڑکوں پر ناچنا شروع کر دے۔ چلا چلا کر لوگوں کو بتائے کہ اس کے سارے دلدھر ہو چکے ہیں ساری مشکلات پر اس نے قابو پالیا ہے اور اب..... اسے چینی سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بازی اس کے ہاتھ لگ رہی تھی لیکن ابھی..... انتظار کرنا تھا۔

☆.....☆.....☆

کہتے ہیں کہ بڑا وقت کہہ کر نہیں آتا لیکن یہاں بات دوسری تھی۔ ارشاد کو الہام ہو چکا تھا کہ بڑا وقت آگیا ہے کس کا؟ اس کا فیصلہ وقت کو کرنا تھا لیکن پھر بھی یہ طے تھا کہ بڑا وقت آگیا ہے اور

ارقت شوکت مرزا اور عیسیٰ کا تھا اتنا اندازہ ارشاد لہ تھا اور یہ یقین بھی کہ خود اس کا اچھا وقت آن رہا ہے حالانکہ اچھا وقت بھی ڈکے بجاتا ہوا نہیں آتا۔ ارشاد جن خطوط پر سوچ رہا تھا ان پر عام انسانی ذہن نہیں سوچ سکتا۔ یہ ارشاد کا ہی دماغ تھا اس کا منصوبہ اس کی نظر میں مکمل تھا ہر پہلو اس کے لیے سودمند تھا۔ ہاں ذرا سی قربانی دینا بھی پھر..... اس کی اجازت بنجر زندگی پھولوں سے عبارت ہو جاتی۔ دل ہی دل میں پلان ترتیب دیتے وہ نے اس نے خود کو گلاب کی پتیوں سے بڑھ کر ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اپنی حکمت عملی پر آخری بار ناقدانہ نگاہ ڈالنے اور اسے ہر لحاظ سے مستحکم پانے کے بعد جب وہ بستر پر لیٹا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پریاں اپنی ہانہوں میں جھلائے ہوئے لوریاں سنا رہی ہیں۔ عالم خواب میں انسان کی حیات بھی نوا بہیدہ ہو جاتی ہیں مگر ارشاد بھانت بھانت کی دہر با خوشبوئیں اپنی روح میں اترتی محسوس کر رہا تھا۔ دوسرے دن کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے وہ گہری نیند سو گیا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن کو آنا تھا سو آگیا۔ دنوں کا تو کام ہی آنا اور جانا ہوتا ہے۔ ارشاد سو کر اٹھا تو بے حد ہشاش بشاش اور تروتازہ تھا۔

اب اسے شام کا انتظار تھا۔

شام بھی آگئی کیونکہ شام کا کام بھی آنا اور رات میں ڈھل جانا ہوتا ہے۔ یہ ارشاد ہی جانتا تھا کہ یہ شام کس کی زندگی کی غروب ہوئی ہوئی شام ہے۔

وہ اٹھا کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا آٹھ بجے تھے۔ بے ساختہ اس کے حلق سے ایک قہقہہ برآمد ہو گیا۔ وارڈ روب سے ریوالور نکال کر اس

نے چیبر کا معائنہ کیا۔ چیبر خالی تھا۔ گولیوں کا پیکٹ تھوڑی سی تلاش پر مل گیا۔ اس نے ریوالور کا چیبر بد کیا اور چرخی گھما کر دیکھی۔ اس نے بھرا ہوا ریوالور پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور باہر جانے کے لیے مڑا۔ دروازے تک بھی نہ آیا تھا کہ کسی یکا یک آنے والے خیال کے تحت رک گیا۔ واپس وارڈ روب کے نزدیک آیا۔ ریوالور نکال کر اس کا چیبر خالی کیا اور گولیاں دوبارہ پیکٹ میں ٹھونس دیں۔ ریوالور بھی وارڈ روب میں اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ وہ بے بات مسکرا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

عیسیٰ کے فلیٹ تک پہنچتے پہنچتے ساڑھے آٹھ بج گئے۔ اس نے اطمینان سے گاڑی پارک کی اور دبے پاؤں چلتا ہوا عیسیٰ کے دروازے پر کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ مدہم مدہم بے ہنگم سی آوازیں آرہی تھیں جن کو سننے کے لیے ارشاد کو سماعت کا پورا زور لگانا پڑا۔ اس کے ہونٹ دانتوں پر کسی بھیڑیے کے انداز میں کھینچ گئے۔ اس کی وہی کیفیت تھی جو حکار سامنے دیکھ کر خونخوار درندے کی ہوتی ہے۔ اس کا کان دروازے میں بنے ہوئے چابی کے سوراخ سے پیوست ہو گیا۔ تمام قوتیں سرگرم عمل ہو گئیں۔ بھڑکی ہوئی سانس سن کر اس کی سانسیں بھی بے ترتیب ہو گئیں نفس تیز ہو گیا۔ سارا بدن بھی میں تپنے لگا انتقام کی بھٹی میں وہ انتقام جس کی سزا نہ تھی جزا تھی اور ارشاد کی آرزوؤں کے عین مطابق تھی۔

وہ سیدھا کھڑا ہوا اور بائیں کاندھے کی بھرپور ٹکر دروازے پر ماری۔ ٹھیکے پر بنے ہوئے ابارشمنٹ کا بظاہر دلکش دکھائی دینے والا لیکن باطن کھوکھلا کواڑ ارشاد کی ٹکر نہ سہار سکا اور قدم بوس



ہو گیا۔ اندر ارشاد نے جو کچھ دیکھا وہ غیر متوقع نہ تھا۔

شوکت مرزا اور عشی سکتے میں رہ گئے پھر ذرا ہوش ٹھکانے آئے اور اپنی حالت کا احساس ہوا تو یوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے جیسے مٹنا طمس کے دوسرے قریب لانے پر جھٹکے سے الگ ہوتے ہیں۔ عشی ہونق، شوکت مرزا سن تھا۔ اور ارشاد..... کمرے کے وسط میں دونوں ہاتھ کمر پر لگائے خون آلود لگا ہوں سے دونوں کو گھور رہا تھا۔

”کپڑے پہن لو شوکت مرزا..... میں نہیں چاہتا کہ تمہاری برہنہ لاش دنیا کے سامنے تماشہ بنے۔“ ارشاد کی نچرلی آواز عشی اور شوکت مرزا کی ہڈیوں میں تیرتی چلی گئی۔ شوکت مرزا ایک کراٹھا اور پانی پر رکھے کپڑے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر ارشاد نے اُسے مہلت نہ دی۔ اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو کر پھٹک اٹھا تھا۔ اس نے قالین پر رکھی ماربل کی خوبصورت تپائی اٹھائی سر سے بلندی پھر اس کا ہاتھ اس وقت رُکا جب شوکت مرزا کی لہو لہان عریاں لاش بے جان اور بچی پھٹی بے نور آنکھوں سے پھٹت کو گھور رہی تھی اس کے پیچھے کے چپترے کھوپڑی سے نکل کر سرخ قالین کو داغدار کر رہے تھے۔

عشی سنائے میں بیٹھی چپ چاپ سب دیکھ رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور جھمک رہا تھا شوکت مرزا کی عبرت انگیز لاش پر جی ہوئی تھیں۔ عشی کے چہرے پر نفرت سے تھوک گر ارشاد واپس ہوا تب بھی عشی کے گنگ جیسے میں جنبش نہ ہوئی۔

جاتے جاتے ارشاد نے دیکھا آس پاس کے لوگ فلیٹ کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے جھانک کر اندر ہونے والی واردات کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اُن کے رنگ فق تھے ہر ایک کی شکل پر

مختلف تاثرات تھے۔ ارشاد کو باہر آتا دیکھ کر اس میں بھلکارے گئی وہ یوں منتشر ہوئے جیسے ہلکے پھلکے بادل تیز آندھی کا سامنا ہونے پر چھٹ جانے ہیں۔ ارشاد اُن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نکلتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

مقدمے میں ذرا بھی جان نہیں تھی۔ ارشاد بلا پس و پیش کیے اقبال جرم کر چکا تھا۔ چشم دید گواہ بھی موجود تھے۔

وکیل صفائی نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اتنا ہی ثابت کر سکا کہ یہ قتل عمد نہیں بلکہ اشتعال کا رد عمل ہے۔ دلیل پر مغزی گواہوں نے بھی اس کی تائید کی موقع واردات پر ارشاد کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ گھر سے ارادہ قتل لے کر روانہ نہیں ہوا تھا۔ جس تپائی سے اس نے شوکت مرزا کو ہلاک کیا وہ عشی کی ملکیت تھی اور دوران قتل ارشاد نے عشی کے کمرے سے ہی اٹھا کر استعمال کیا تھا۔

عشی اور ارشاد کی محبت کے بھی لاتعداد شہادت تھے اور عشی کی بے وفائی کی ٹھوس شہادتیں بھی دستیاب تھیں سب سے بڑی شہادت تو موقع پر شوکت مرزا کی قابل اعتراض حالت میں پڑی ہوئی لاش تھی۔

عدالت میں ارشاد نے آخر کیا کہ عشی اس کی پہلی اور آخری محبت ہے اور وہ اپنی اس پونجی میں غبن برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا چنانچہ یہ قتل اس سے سرزد ہوا۔“

چونکہ ملزم ہی مزاحمت پر آمادہ نہ تھا لہذا چند ہی بیسیوں میں فیصلہ ہو گیا۔

عمر قید کی سزا سن کر کوئی اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا ارشاد نظر آ رہا تھا۔ نہ تو اس کے سر اپنے پر سو گوارا طاری تھی اور نہ ہی کسی قسم کے پچھتاوے یا قلق کا

اظہار ہو رہا تھا۔ عدالت کے کٹہرے سے اتر کر وہ جیل جانے لگا تو اس کا وکیل تاسف سے بولا۔

”مجھے بے حد افسوس ہے ارشاد صاحب، میں آپ کو اس طویل سزا سے نہ بچا سکا۔ آپ نے میرا اپنا بھی تو نہیں مانا آسانی سے ہتھیار ڈال دیے۔“

”آپ ناحق افسوس کر رہے ہیں وکیل صاحب، مقدمے کا فیصلہ میری مرضی کے عین مطابق ہوا ہے اور یہ مجرم کی خوش بختی ہوتی ہے کہ وہ حسب مزاج سزا پانے میں کامیاب ہو جائے۔“ ارشاد نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

”پھر بھی..... درست ہے کہ حالات سے بھوتہ کر لینا دل گردے کی مضبوطی کی دلیل ہے لیکن یہ عرصہ بہت طویل ہو گا۔ آپ ذرا سی ہمت لرتے تو اس مدت معیاد میں کی ہو سکتی تھی۔“ ارشاد نے وکیل کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں آپ کی ذہانت کا تہہ دل سے معترف ہوں۔ آپ نے حتی الامکان سعی کر ڈالی مگر وکیل صاحب..... اپنی پسند کی سزا پانا بھی تو اعزاز ہے آپ مطلق شرمندہ نہ ہوں۔ میں بہت خوش ہوں مگر قید کی سزا چودہ برس ہوتی ہے نا۔“ وکیل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ارشاد زور سے ہنس دیا۔

وکیل صاحب سمجھے کہ چودہ برس کے عرصے کی تعمیق اُن کی زبان سے سن کر ارشاد کے اوسان ظاہر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔

”اس مدت میں تھوڑی بہت کی بیشی بھی روکتی ہے اور اس کا دار و مدار جیل میں آپ کے چال چلن پر ہو گا۔“

”اوہ وکیل صاحب..... آپ کیسے وکیل ہیں

کہ اپنے موکل کو نہیں سمجھتے، میں ذرا برابر پریشان نہیں ہوں اور نہ ہی سزا میں کمی کا خواستگار ہوں جتنی بیشی ہوا اتنا ہی اچھا ہے۔“

”آپ جیسا آپنی اعصاب کا مالک میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔“ وکیل صاحب اسے ستائش سے دیکھ رہے تھے۔ ارشاد نے وکیل صاحب کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور جانا چاہا کہ بولا۔

”آپ کے تجربے میں مجھ سا مجرم کوئی نہ آیا ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ بھی نہ آئے..... میں نے..... نرالا کھیل کھیلا ہے وکیل صاحب۔ ایک تیرے دو شکار کر لیے ہیں۔ ایک مینٹھ دو کاج والا محاورہ مجھ پر صادق آتا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ میں نے محاروں کو خود پر صادق کر دکھایا ہے۔ جس سزا کو آپ سزا کہہ رہے ہیں میرے لیے وہ جزا ہے اور میں اسی جزا کا طالب تھا۔ میں نے بازی جیت لی ہے وکیل صاحب ہمارا نہیں ہوں۔“ وہ زکا پھر اس نے بے حد تشکر سے کہا۔

”میں آپ کا بے حد مشکور ہوں وکیل صاحب کہ آپ نے مجھے پھانسی سے بچالیا اور نہ..... سارا کھیل بڑا جاتا۔“ سپاہی ارشاد کی پھٹکیاں کھینچتا ہوا چل پڑا۔ وکیل صاحب ہکا بکا کھڑے اس سر پھرے نوجوان کو تنک رہے تھے جس نے عمر قید کی سزا پائی تھی پھر بھی اپنے وکیل کے لیے اس کی آنکھوں میں ممنونیت کا طوفان موجزن تھا اسے اپنے وکیل سے گلہ نہ تھا نا انصافی کا شکوہ نہ تھا بلکہ وہ وکیل کا شکر گزار تھا سزا پانے کے باوجود.....

☆.....☆.....☆

سزا بھگتے کے دوران ارشاد نے وابستہ ایسے چال چلن کا مظاہرہ نہیں کیا جو اس کی معیاد اسیری میں کمی کا سبب بن سکتا۔



جائے اور حال سے بھی کم از کم رابطہ رکھا جائے۔“  
ارشاد مختلف زاویوں سے غشی کو قائل کرتا رہا۔  
بات معقول تھی غشی کی سمجھ میں آگئی اب اس نے  
ملاقات کے لیے آنا کم کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

چار برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ارشاد کا  
تبادلہ ملتان جیل ہو گیا۔ اسے اطمینان ہوا کہ فاصلہ  
زیادہ ہو جائے گا تو غشی کی آمد و رفت بھی خود بخود  
کم ہو جائے گی۔ ایسا ہی ہوا آہستہ آہستہ غشی نے  
آنا بند کر دیا۔ اس کے لیے لاہور سے ملتا کا سفر  
آسان نہیں تھا دوسرے اس میں ارشاد کی بھی رضا  
تھی۔

روشن مستقبل کی تیاریاں ارشاد نے زور و شور  
سے شروع کر دی تھیں۔ اس کا رویہ اپنے ساتھی  
قیدیوں سے بالکل بدل گیا تھا ہر وقت ہونٹوں پر  
مسکراہٹ رہتی دکھ سکھ میں پیش پیش رہتا تھا اور وہ  
جیل کے حکام کو بہتر سے بہتر چال چلن کا ثبوت مہیا  
کر رہا تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وقت کے  
پرنکل آئے اور ناگوں میں بجلی بھری۔

☆.....☆.....☆

نیا قیدی آتا ہے تو کچھ دن اداس رہتا ہے اور  
پھر ماحول سے ساقبت پیدا کر کے گرد و پیش میں  
دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی  
چارہ نہیں ہوتا۔ مگر تین مہینے گزر گئے اور ظفر جوں کا  
توں رہا دلیرداشتہ و بیگانہ اس کے رویے میں کوئی  
تبدیلی نہ آئی۔ ارشاد کو اس نوجوان کو بجا بجا دیکھ  
کر افسوس ہوتا تھا۔ کوئی بہت گہرا ذمہ اس کے دل  
پر نقش تھا جو کسی طرح مندمل ہونے کا نام نہیں لے  
رہا تھا۔

کئی مہینے ارشاد اس کا خاموشی سے جائزہ لیتا  
رہا۔ تجزیہ کرتا رہا اور منتظر رہا کہ وہ حالات سے

بکھوٹ کر لے لیکن بے سود..... دن گزرنے کے  
ساتھ ساتھ ظفر کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔  
صحت جواب دے رہی تھی آنکھوں کے گرد حلقے  
پڑ گئے تھے۔ رخسار پچک گئے تھے اور بالوں میں  
سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ ارشاد کو اس پر بڑا ترس آیا۔  
اس نے تہیہ کر لیا کہ ظفر کو کھانا کرا رہے گا۔  
موقع پا کر اس نے گفتگو چھیڑی۔

”دوست..... مجھے تمہارا نام تو معلوم ہے لیکن  
اس کے باوجود ہم آپس میں اجنبی ہیں۔“ ظفر نے  
گردن اونچی کر کے اپنی نظر ارشاد پر ڈالی اور  
دوبارہ ہان بننے میں مشغول ہو گیا۔

”ایسا لگتا ہے کہ تم ابھی تک جیل سے آشنا نہ  
ہو سکے ہو یہ غلط ہے۔“ ظفر اب بھی کچھ نہ بولا۔  
ارشاد کہتا رہا۔

”جیل کی دنیا باہر کی کائنات سے جدا ہوتی  
ہے۔ یہاں سب ایک جیسے ہوتے ہیں لہذا آپس  
میں میل محبت سے رہتے ہیں۔ دوسرے سے دل کا  
حال کہہ دینا بہتر ہوتا ہے جو بوجھ ملکا ہو جاتا ہے۔  
حالانکہ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ جب تک  
تمہاری سزا پوری نہیں ہو جاتی باہر کی خود غرض دنیا  
کو بھول جاؤ وہاں بڑی نفسانسی ہے بڑی بھیڑ  
بھاڑ ہے اتنی کہ بھائی بھائی کو نہیں پہچانتا۔ آزاد  
ہو کر نئی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کرنا۔ لیکن  
تمہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تم آزاد ہونے تک  
زندہ نہیں رہو گے مگر جاؤ گے۔ تم خود اپنے آپ کو  
قتل کر رہے ہو۔“ ظفر کا دل بھر آیا اس کی آنکھوں  
میں نمی تیر گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے بھی علم ہے کہ تمہارا نام ارشاد ہے۔“  
”اور کیا جانتے ہو؟“ ارشاد مسکرایا۔

”تمہارے جرم کی نوعیت بھی پتہ ہے۔“  
اپنائیت پا کر دھیرے دھیرے ظفر کھل رہا تھا۔

”پھر بھی تم سبق نہیں لیتے۔“  
”مجھے حیرت ہوتی ہے۔“  
”کس پر.....“

”تم پر..... تمہاری حالت پر..... قتل کا کوئی  
ہرم میں نے اس قدر مطمئن نہیں دیکھا۔“ ارشاد  
نے قہقہہ لگایا۔

”تو تمہیں یہ بھی خبر ہوگئی کہ میری رہائی میں  
صرف چار دن باقی رہ گئے۔“

”اسی پر تو تجب ہے پوری سزا کاٹ کر بھی تم  
بے حد تردد تازہ نظر آتے ہو۔“ ظفر نے ارشاد کی  
سنت کو سراہا۔

”اسیری کے دوران میرے وزن میں بائیس  
پانڈا کا اضافہ ہوا ہے۔“ ارشاد نے سینہ پھلا کر فخر  
سے بتایا۔

”مجھے اپنے آپ پر دکھ ہوتا ہے اور تم پر  
انتقاب..... وجہ یہ ہے کہ میرے اور تمہارے جرم  
میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں ہے۔ قریب قریب ایک  
ایسا جرم ہے ایک سی سزا ہے۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا۔“ ارشاد نے سفید جھوٹ  
بلا۔

”ذرا بتاؤ تو سہی تم یہاں کیسے آن پہنچے؟“  
”ایک عورت کی خاطر۔“ ظفر نے پھر سر  
ہلاتا۔

”کیا اُسے دوسری دنیا روانہ کر دیا؟“ ارشاد  
نے بٹاشت سے دریافت کیا۔

”نہیں..... اُس کے آشنا کو..... میں بھی  
تمہاری طرح غصے سے دیوانہ ہو گیا تھا۔“

”اس دیوانگی پر شرمندگی نہیں غرور ہوتا  
پا ہے۔“ ارشاد نے اس کا دل بڑھایا۔

”اپنی محبت میں نقب برداشت کرنے والے  
بے غیرت ہوتے ہیں مجھے مسرت ہوگی اگر تم مجھے

تفصیل سے ایک ایک بات سناؤ۔ اپنے جیسے  
دیوانوں سے مل کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔“  
اس سے قبل کہ ظفر اپنی داستان سنا تا سپاہی  
نے ارشاد کو پکارا۔

”کیا ہے؟“ بے وقت کی خلل اندازی ارشاد  
کو گراں گزری۔

”تمہاری ملاقات آئی ہے۔“  
”غلط فہمی ہے تمہاری مجھ سے ملنے بھلا کون  
آ سکتا ہے۔ جاؤ کسی اور ارشاد کا بلا دیا ہوگا۔“

”نہیں..... سارے قیدیوں میں ارشاد  
دھامڑا اولد امداد دھامڑا تم اکیلے ہو اور ملاقاتی نے  
اسی نام کے قیدی کو بلوایا ہے۔“ سپاہی نے بیزار  
سے کہا اور ارشاد کا جواب سننے بغیر واپس روانہ  
ہو گیا۔

ارشاد اُسی الجھن میں گرفتار تھا کہ اس سے  
ملاقات کرنے کون آ سکتا ہے۔ بہر حال وہ ملاقاتی  
کمرے میں پہنچا۔

”ارے وکیل صاحب آپ کیسے؟“ اشتیاق  
رضوی کو مقابل دیکھ کر ارشاد دم بخود رہ گیا۔  
”بس ایسے ہی..... تم سے ملنے آ گیا۔“ وکیل  
صاحب نے مسکرانے کی کوشش کی اور سر جھکا کر  
سوچنے لگے۔

”فرمائیے۔“ ارشاد نے بے تاب سے پوچھا۔  
”سیٹھ صاحب کی وفات کی اطلاع تو تمہیں مل  
گئی ہوگی۔“

”جی ہاں لیکن یہ تو بہت پرانی خبر ہے کئی سال  
گزر گئے ڈیڈی کے انتقال کو۔“

”ہوں.....“ وکیل صاحب نے ہنکارا بھرا اور  
ارشاد اُن کی خاموشی پر کھلا کر رہ گیا۔

”تمہاری سزا کب ختم ہو رہی ہے۔“  
”چار دن اور رہ گئے ہیں۔“

117



## بے مصرف اور بے قیمت

لاشیں سب اٹھوا لی گئی ہیں  
جتنے زخمی تھے اُن کو امداد فراہم کر دی گئی ہے  
جسموں کے ٹکڑے اعضا اب وہاں نہیں ہیں جہاں پڑے تھے  
سب کچھ دیا ہے جیسا اُس بم کے پھٹنے سے پہلے تھا  
البتہ مرنے والوں کے ٹوٹے ہوئے ارنائوں کا اک ڈھیر ابھی تک وہیں پڑا ہے  
جھلے ہوئے اور سُرخ شدہ خوابوں کا بھی انبار لگا ہے  
ارمانوں اور خوابوں کا کیا کر سکتے ہیں ہم  
اُن کو دفنانے کے بارے میں بھی کوئی حکم نہیں ہے  
جن کے تھے یہ اُن کے سوا کسی اور کے کام نہیں آسکتے  
ان کی کوئی قیمت ہوتی تو کسبازی ہی لے جاتا  
بالکل ہی بے مصرف ہیں بے قیمت ہیں یہ  
آؤ کہ ہم سب مل کر ان کو دور نہیں پھینک آئیں جا کر  
اس سے قبل کہ گلے سڑے ارمانوں اور خوابوں سے اٹھنے والا لعفن ساری فضا آلودہ کر دے  
آخر ہم اس شہر کو صاف رکھیں گے تو آئندہ نسلیں  
صحت مند اور صاف فضا میں پیدا ہوں گی  
یہ نسلیں اس کے بعد ہمیں اپنے بچوں کو یہ سمجھانا ہوگا  
ان ارمانوں اور خوابوں کے کتنے مضر اثرات ہیں ممکن  
ہا کہ ہمارے بچے ان سے دور ہیں اور چین سے اپنی عمر گزاریں  
ویسے تم نے غور کیا ہے؟  
ارمانوں اور خوابوں کی لغت میں ہم سب کی محنت سے کتنے قہیل عرصے میں کتنی کمی ہوئی ہے؟  
اب تو یوں لگتا ہے جیسے پولیو اور چدق سے بھی پہلے شاید  
ارمانوں اور خوابوں کی مہلک بیماری مٹ جائے گی  
خیر ابھی تو ہاتھ بڑھاؤ  
ارمانوں اور خوابوں کا یہ ڈھیر مٹاؤ  
بے مصرف اور بے قیمت انبار اٹھاؤ!

عرفان ستار

وکیل صاحب دوبارہ سوچوں میں گم ہو گئے۔  
ارشاد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔  
”آپ خاموش کیوں ہیں وکیل صاحب؟“  
”کاش میں خاموش کا خاموش ہی دنیا سے اٹھ  
جاتا لیکن انسوں مقدر میں یہ نہیں تھا۔“  
”آخر کیوں؟“ ارشاد کے رگ و پے میں  
سرریاں کی رینگنے لگیں۔  
”یہ خبر سناتے ہوئے مجھے رنج ہو رہا ہے۔“  
وکیل صاحب واقعی مغموم تھے۔  
”آپ صاف صاف بتائیے وکیل  
صاحب..... کئی لمبی رکھے بغیر..... میں ہر قسم کی خبر  
سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔“ ارشاد نے کہہ تو دیا تھا لیکن  
درحقیقت اس کی ہمت پست ہو رہی تھی۔  
”تم کہتے ہو تمہاری سزا چار دن کی رہ گئی ہے۔“  
”جی ہاں..... یہ درست ہے۔“ ارشاد نے  
جلدی سے کہا۔  
”یہ غلط ہے..... تمہاری سزا ساری عمر پوری نہ  
ہوگی۔“  
”کیا مطلب؟“  
”مطلب سمجھنے کے لیے پتھر کا دل چاہیے۔“  
اشتیاق رضوی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔  
”اپنے باپ کی لامحدود دولت کے اکلوتے  
وارث ہوتے ہوئے بھی تم اس میں سے ایک پیسے  
کے بھی حقدار نہیں رہے۔“ وکیل صاحب نے دھماکہ  
کر دیا۔ ارشاد اچھل پڑا۔  
”کیا بکواس کر رہے ہیں آپ؟“  
”یہ بکواس نہیں تمہارے مرحوم باپ کی وصیت  
ہے۔“  
”ایک وصیت کی خاطر تو میں نے جان بوجھ کر  
چودہ سال کی قید خرید لی۔ یہ دوسری وصیت کہاں سے  
آگئی۔“ ارشاد ہنسنے سے اکھڑ گیا۔



مگر کل رات کو جب  
میرا بیٹا، فیس بک کھولے ہوئے تھا  
اور بیٹی اپنے موبائل پر سرفرہونڈتی تھی  
دوستوں کے جن کو اس نے  
اپنے کان کے کبھی قصے سنانے تھے  
ایک ایک میں نے کچھ پوچھا  
نہ جانے کیا کہا تھا  
ذہن میں بالکل نہیں لیکن  
بس اتنا یاد ہے مجھ کو  
کبھی چھوٹے سے اک بیل میں  
بظاہر نرم لہجے میں  
کبھی اک بات  
پھر بن کے لگتی ہے  
مجھے اس بیل نے  
جو میرے اور ان کے بیچ حائل تھا  
بہت دھیرے سے سمجھایا  
کہ بچے آج جس دنیا میں رہتے ہیں  
یہ ہے اک "دوسری دنیا"  
تم اس دنیا سے باہر ہو

حمیرا راحت

## دوسری دنیا

ابھی کچھ دن ادھر کی بات ہے  
جب میرے بچوں نے  
میری آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھا تھا  
(جو دنیا میری دنیا تھی)  
میں اک بیل بھی زمانے اور ان کے درمیان  
پہچان تھی  
ان سارے رستوں کی  
جو بالکل اجنبی تھے ان کی آنکھوں کے لیے  
انگلی پکڑ کر میری بچے  
جب کبھی باہر نکلتے تو  
سوالوں سے بنی زنجیر  
قدموں میں مرے یوں ڈال دیتے کہ  
سفر کرنا مراد دشوار ہو جاتا  
مگر پھر بھی  
میں اپنی آنکھوں کو اک طرف رکھ کر  
تخل سے جواب ہر بات کا دیتی  
سمجھتی تھی کہ ان کو  
میرے تفصیلی جوابوں کی ضرورت ہے  
تجیبی تو دوسری دنیا کو جانیں گے

"رہائی مبارک ہو۔"

"شکریہ اب اپنی کہانی سناؤ۔" ارشاد پچھلے امار  
کر بیٹھ گیا۔

"میں نے بھی قتل کیا ہے تمہاری طرح۔۔۔۔۔  
اشتعال میں آ کر۔" ظفر کر گیا۔ اسے شاید کہانی  
سنانے کے سلیقے سے آگئی نہ تھی۔  
"کسے؟"

"کس کے آشنا کو۔۔۔۔۔"

"وہ کون تھی؟"

"میری آشنا۔۔۔۔۔ صرف آشنا ہوتی تو شاید مجھ  
سے یہ قتل سرزد نہ ہوتا لیکن وہ ہر جانی بھی تھی بے وفا  
تھی اور یہی اس قتل کا محرک تھا۔"  
"تو پھر اس عورت کو مراد بنی تھی۔"

"بہی غلطی ہوگئی۔۔۔۔۔ اس لمحے میں اندھا ہو چکا  
تھا۔ اس کے یار کا میں نے قیہ بنا دیا۔" ظفر کے  
جڑے بھیج گئے۔

"تمہیں اس عورت سے بہت محبت تھی؟"

ارشاد کے سوال پر ظفر نے اسے ایسے دیکھا  
جیسے بزرگ ننھے بچوں کے بے معنی سوالات پر دیکھتے  
ہیں۔

"جس سے شدید محبت ہو اسی کے لیے قتل جیسا  
سنگین جرم ہے بھڑک کیا جاسکتا ہے۔"  
"وہ بھی تمہیں چاہتی تھی۔" ارشاد کو دلچسپی  
ہوئی۔

"اس کا یہی کہنا تھا۔" ظفر نے مختصر سا جواب  
دیا۔ چند ثانیے دوؤں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ پھر  
ارشاد نے پہل کی۔

"نام کیا تھا اس ہر جانی کا؟"

"عشرت۔۔۔۔۔"

ارشاد بری طرح چونکا۔

"کہاں رہتی تھی؟"

بہت کچھ کہا۔ ارشاد کی ڈھارس بندھائی مگر ارشاد کے  
کان سن ہو چکے تھے۔ زبان مفلوج تھی اور آنکھیں  
پتھر لگی تھیں۔

اپنی مانوس کوٹھری میں اسے تمام رات نیند نہ  
آئی۔ یہ سانحہ روح فرسا تھا اس اور اس سے مفر بھی  
ممکن نہ تھا۔ دنیا میں اب رہ ہی کیا گیا تھا۔ جس  
دولت کی خاطر اس نے چودہ سال قید بھگتی وہی اس  
سے چھن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے سیلاب جاری  
ہو گیا۔ کچھ بھی تو باقی نہ بچا تھا۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ گھٹا ٹوپ  
اندھیرے میں ننھا سا ستارہ ٹٹمایا۔ ابھی بہت کچھ  
باقی تھا دنیا بھر نہیں ہوئی تھی زندہ رہنے کا ایک سہارا  
ایک مقصد بچ گیا تھا۔ اور یہ سہارا یہ مقصد تھا۔۔۔۔۔  
عشی۔۔۔۔۔

ارشاد کے آنسو ختم گئے۔ بدن میں پھیلتی ہوئی  
آگ سرد پڑ گئی اور۔۔۔۔۔ وہ ہر سکون گہری نیند کی  
آغوش میں گم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اب وہ وہی پرانا والا ارشاد تھا۔۔۔۔۔ پہلے جیسا  
چلبلا زندہ دل سارا دن اس نے ہنسی خوشی گزار دیا۔  
"ہاں تو پیارے ہماری بات چیت ادھوری رہ  
گئی تھی۔" ارشاد نے ظفر کے کندھے پر دباؤ ڈال کر  
گر جموش سے کہا۔

"کیا کرو گے سن کر۔" ظفر نے اس انداز میں  
نالٹا چاہا جس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب  
کچھ بتا دینے کا دلی طور پر خواہشمند ہے۔

"خوش ہوں گا۔"

"اس میں خوشی کا کون سا پہلو ہے۔"

"ہے۔۔۔۔۔ اور پھر کل صبح میری رہائی بھی ہو رہی  
ہے اس سے اچھا موقع پھر نہیں ملے گا۔ خدا جانے  
پھر ملاقات ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔" ظفر نے افسردگی  
سے اسے دیکھا۔

## یادِ سیم

☆..... ایک ایسی تحریر جو

آپ کو برسوں یاد رہے گی

☆..... دوشیزہ کی مصنفہ

ڈاکٹر سیمیں رخ کے قلم سے

☆..... ناقابل فراموش تحریر

☆..... ستمبر سے دوشیزہ کے

صفحات پر

تھی۔ اس قسم کی بے چینی کا اسے پہلے بھی ایک دفعہ  
تجربہ ہو چکا تھا۔ شوکت مرزا کو جہنم رسید کرنے سے  
چند ٹاپے پیشتر اس کی یہی کیفیت ہوئی تھی۔

وہ دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا ظفر کے  
قریب آیا۔

ظفر دنیا و مافیہا سے بے خبر لمبی تانے سوراہا  
تھا۔ ارشاد کے ہاتھوں کی مچھلی بڑھ گئی انگلیاں سخت  
ہو گئیں..... وہ جھکا..... اس نے اپنی انگلیوں کو غور  
سے دیکھا بار بار کھولا اور بند کیا۔ اس کی آہنی گرفت  
میں یقیناً ظفر کو آواز نکالنے کی بھی گنجائش نہ ہوگی۔

وہ دوڑا تو بیٹھ گیا..... دونوں ہاتھ آگے  
بڑھائے..... اس کے ہاتھ ظفر کی گردن کو چھو رہے  
تھے..... پھر..... ذہن کے کسی گوشے میں کونسا سا لڑکا  
عجیب سا جھماکہ تھا وہ جس کی چکا چوند میں ارشاد کو  
سب کچھ واضح نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ ظفر کی گردن  
دبوچے بغیر واپس آ گئے۔

وہ اپنی جگہ آ کر لیٹ گیا۔  
صبح اس کی رہائی ہونے والی تھی..... وہ حساب  
لگانے لگا۔ جیل سے رہا ہونے پر کچھ رقم بھی دی جاتی  
ہے۔

وہ خچینہ لگا رہا تھا۔ اتنی رقم تو ضرور مل جائے گی  
کہ لاہور تک ٹکٹ آجائے۔ اسٹیشن سے شادمان  
کالونی کا کرایہ نکل آئے..... اور..... اس کے  
ہونٹوں پر مسکراہٹ تاننے لگی۔ اب بھی اتنی رقم بچ  
جائے گی جس میں ایک عدد عمدہ قسم کی چھری خریدی  
جاسکے۔

حساب چکانے کا پروگرام تشکیل پا گیا تھا۔ اب  
کوئی الجھن باقی نہ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند  
ہوتی چلی گئیں۔ گہری اور میٹھی نیند کا جادو اس کے  
ذہن کے گرد مضبوطی سے بٹنا چلا جا رہا تھا۔

☆☆.....☆☆

”لاہور میں۔“  
”لاہور میں کس جگہ؟“ ارشاد کا دل اٹھ پھل  
ہونے لگا۔

”شادمان کالونی کے قلیٹ میں۔“ ارشاد کا کلیجہ  
اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے زمین کو انگلی سے  
کریدتے ہوئے پوچھا۔

”وہی عشرت تو نہیں جس کی گردن کے بائیں  
جانب موٹا سامہ ہے۔“  
”ہاں ہاں.....“ اب کے چونکنے کی باری ظفر  
کی تھی۔

”اور دائیں آنکھ کے نیچے سرخ رنگ کا تل  
ہے۔“

”ہاں..... مگر تمہیں کیسے معلوم؟“ ظفر نے بے  
قراری سے پوچھا۔ ارشاد تھوک نکل کر رہ گیا۔  
”میں بھی چند مہینے شادمان کے قلیٹوں میں رہ  
چکا ہوں۔ اس لڑکی سے آمتا سامنا ہوتا رہتا تھا۔“

”کمال ہے..... ویسے وہ لڑکی تھی کیسی؟“ ظفر  
نے اشتیاق سے سوال کیا۔

”تمہیں اب تک پتہ نہیں چلا۔“ ارشاد نے گھورا  
اور ظفر نے شیشا کر گردن دوسری سمت موڑ لی۔

☆☆.....☆☆

رات بقی جاری تھی۔ اس جیل میں یہ دوسری  
رات تھی جس نے ارشاد کی نیندیں چرائی تھیں۔ اس  
کے دماغ میں ہنڈیا سی پک رہی تھی۔ شدت سے  
احساس ہو رہا تھا کہ وہ بالکل تہی دست رہ گیا ہے۔  
صبح اسے آزادی مل رہی تھی لوگ آزادی پر خوش  
ہوتے ہیں اور اس کا دل رورہا تھا۔ سارے بدن  
میں اٹھن ہو رہی تھی۔ اعصاب سچ رہے تھے۔

اس نے اپنی کوٹری میں سوئے ہوئے ظفر پر  
نگاہ ڈالی اور نفرت میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہتھیلیوں میں  
مچھلی ہو رہی تھی عجیب سی بے چینی ہاتھوں پر سوار



منظر گڑھ سے ارسال کردہ کہانی

## منزل کی جستجو

ایسے لڑکے کی کہانی جس نے بچپن سے

جوانی تک بہت کچھ سہا تھا مگر ہمت نہ ہاری.....

محمد شہزاد

.....

میں امین سلیم ہوں، ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کا مالک۔ کروڑوں کا بینک بیلنس رکھنے والا، اپنے تین بچوں اور بیوی کے ساتھ خوش و خرم اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والا۔ میرے بارے میں شاید کسی نے نہ سوچا ہو کہ یہ ایک جھونپڑی میں پیدا ہوا ہے۔ میرے بارے میں سب کی یہی رائے ہے کہ یہ روپیہ پیسہ مجھے ورثے میں ملا ہے اور میں ایک امیر ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ اور حقیقت کیا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔

نہ میں نے کسی کے پوچھنے پر اسے کبھی کچھ بتایا۔ مگر آج زندگی کے بچپن سال گزار لینے کے بعد میں اپنے آفس میں اس سربراہی کرسی پر بیٹھ کر اپنی زندگی کی حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں امین سلیم عرف راجو میاں وقاص کا

رشتہ داروں کے گھر سے روٹی کھا کر اپنا پیٹ اٹا۔ اس سے پہلے کہ میں اس غم سے سنبھلتا اور اپنی آگے کی زندگی کے بارے میں کچھ سوچتا، گاؤں میں ہونے والی ایک چوری کا الزام میرے سر لگا دیا گیا۔

سب گاؤں والوں نے ایک پنچایت اکٹھا لی اور اس پنچایت کے سربراہ نے یہ حکم دیا کہ اگر انہوں نے چوری کی رقم واپس نہ کی تو اسے سزا دی جائے گی۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ کسی نے یہ ماننے کی کوشش نہیں کی کہ میں اس چوری کا

زمرہ دار ہوں یا نہیں۔ بس فوراً فیصلہ سنا دیا۔ میں نے بہت قسمیں کھائیں کہ میں نے یہ چوری نہیں کی لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔ چوری ہونے والی رقم آٹھ لاکھ روپے تھی۔ فیصلہ کرنے والے نے ساری رقم کی بھرپائی میرے ذمے لگا دی۔ اور ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر میں نے یہ رقم تین دن کے اندر ادا نہ کی تو وہ مجھے گاؤں سے باہر نکال دیں گے۔

میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا جو میں بیچتا۔ صرف ماں کی ایک گلے کی چین تھی، خدا جانے کہ وہ چاندی کی تھی یا نہیں۔ مگر وہ میری ماں کی



آخری نشانی تھی۔ میں اسے نہیں پہچانا جانتا تھا۔ اور اگر کچھ بھی دیتا تو میرے پاس ہرگز بھی اتنی رقم نہ ہو پاتی کہ میں چوری کی رقم ادا کرتا۔ میرے لیے جیسے راستے بند ہو چکے تھے۔ میں بہت پریشان تھا۔ چوری کے الزام کی وجہ سے سب رشتہ داروں نے مجھ سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ میں پوری دنیا میں گویا اکیلا رہ گیا تھا۔ پھر مجھے ایک راہ بھائی دی، گاؤں چھوڑ دینے کی۔ اس سے پہلے کہ پناہیت والا مجھے اس گاؤں سے بے قصور نکالتے۔ اس سے بہتر تھا کہ میں خود یہاں سے چلا جاؤں۔ میں نے اپنا مختصر سامان اور کتابیں باندھی اور رات کے اندھیرے میں گاؤں سے چپکے سے نکل پڑا۔ اور شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب میں شہر پہنچا تو صبح ہو چکی تھی۔ شہر پہنچنے کے بعد میں سارا دن بازار میں گھومتا رہا کہ شاید کوئی کام مل جائے مجھے جس کی اجرت سے میں کچھ کھا سکوں۔ مگر مجھے کسی نے کوئی کام نہیں دیا۔ سارا دن گھومنے کی وجہ سے میں بہت تھک چکا تھا۔ اور مجھے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔ میں سڑک کے کنارے چل رہا تھا جب مجھے وہاں سو روپے کا نوٹ نظر آیا، اس سے پہلے کہ کوئی اور اسے دیکھتا۔ میں نے لپک کر وہ نوٹ اٹھالیا اور جیب میں ڈال لیا۔ مجھے ٹھنڈے سینے آنے لگے۔ گوکہ وہ نوٹ ایسی ہی پڑا ہوا تھا مگر پھر بھی مجھے عجیب احساس ہو رہا تھا۔ میں نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکا اور رات کے کھانے کے لیے یہ ڈھابے پر آ گیا۔ رات کا کھانا کھا کر میں باہر وہیں سڑک کے کنارے اپنی کتابوں پر سر رکھ کر سو گیا۔

صبح سورج کی تیز روشنی سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں اٹھا تو میری کتابیں غائب تھیں۔ کوئی انہیں اٹھا کر چلا گیا تھا۔ مگر وہ کتابیں میری زندگی کا مقصد تھیں، میرا سہارا بننے والی تھیں۔ پریشانی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے یوں پریشان دیکھ کر ایک صاحب میرے پاس آئے اور مجھ سے وجہ پوچھنے لگے۔ میں نے ٹھیک سے جواب نہیں دیا۔ مجھے اپنوں نے دھوکہ دے دیا تھا پھر میں کسی غیر پر کیسے بھروسہ کرتا۔ مگر صاحب بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے تو میں نے انکو سب سچ بتا دیا جو مجھ پر گزر چکا تھا۔ ”تم پریشان نہ ہو بیٹا۔ میں تمہیں کتابیں لادوں گا، تمہاری تعلیم پوری کرواؤں گا۔ کیا میرے ساتھ چلو گے؟“

میں نے ان کی بات پر دو منٹ سوچا اور راضی ہو گیا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ ان کے گھر میں صرف چند لوگ ہی تھے۔ میں نہیں جانے کہ وہ کون تھے اور نہ میرا کسی سے تعارف کروایا۔ بس ایک عالی شان کمرہ مجھے دے دیا۔ وہ کمرہ ہمارے جھونپڑے سے تین گنا بڑا تھا۔ میرے لیے کسی محل جیسا تھا۔ ان صاحب نے اپنا نام کاظمی بتایا۔ مجھے پہننے کو اچھے کپڑے دیے، اور بہت لذیذ کھانا۔ میں نے ایک وقت میں اتنے سارے پکوان کھیں نہیں کھائے تھے۔ اگلے دن کاظمی صاحب مجھے ایک بہت اچھے اسکول میں داخل کروا کر آ گئے۔ میرے لیے سب خواب جیسا تھا، میں خود کو خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ کاظمی صاحب

مجھے مزید آسائشات میسر کر دی۔ لپ ٹاپ، گاڑی ڈرائیور۔ مجھے اپنا آپ ایک شہزادے کی طرح لگنے لگا۔ میں نے اکثر کاظمی صاحب سے مہمانیات کی وجہ پوچھی تو انہوں نے یہی کہا کہ انہیں خدمتِ خلق کرنے کا بہت شوق ہے۔ اور ہمارے گھر میں جو باقی لوگ رہتے ہیں، انہیں بھی انہوں نے سہارا دے کر اپنے گھر میں رکھا ہے۔ ان کی بیوی بچے ملک سے باہر رہتے ہیں مگر وہ باہر نہیں گئے کیونکہ انہیں اپنے ملک سے پیار ہے اور وہ یہاں رہ کر اپنے قوم کے لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کی ان باتوں نے بہت متاثر کیا تھا۔ مجھے انکو دیکھ کر ناشی ہوتی تھی کہ لوگوں میں ابھی بھی نیکی کرنے کا جذبہ باقی ہے۔

کاظمی صاحب کے گھر میں میرا ایک سال اتنی جلدی گزر گیا کہ پتہ ہی نہیں چلا۔ مجھے یوں دس ہو رہا تھا کہ میرے سارے خواب پورے ہو گئے تھے۔ کاظمی صاحب سے میری بہت اچھی بات ہو گئی تھی۔ ہم شام کے بعد ساتھ وقت گزارتے تھے۔

اس دن میں صبح اسکول نہیں گیا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کاظمی صاحب کی ملازمہ نے میرے لیے سوپ بنا کر لائی۔ میں نے جیسے ہی سوپ پی کر پیٹ میں جلن سی ہونے لگی، اہم ٹھنکنے لگا۔ میں نے ملازمہ کو آواز دینی چاہی مگر میرے حلق سے آواز ہی نہیں نکلی، اس لیے پاس بڑی ٹرے نیچے گری تو ملازمہ نے بات کر دیکھا اور تیزی سے میری طرف آئی۔ اسی وقت مجھے خون کی الٹی ہوئی اور اس کے بعد مجھے

کوئی ہوش نہ رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے کچھ صحیح سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف سفیدی سے چھائی تھی، پھر کچھ دیر بعد منظر واضح ہوا تو وہ ایک ہسپتال کا کمرہ تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر کاظمی صاحب کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ ایک سوئٹ بوٹڈ آدمی۔ ان دونوں کی میری طرف پیٹھ تھی۔ وہ سوئٹ بوٹڈ آدمی غصے میں کچھ بول رہا تھا۔ ”میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ تمہیں ہر طرف نظر رکھنی ہے پھر تم سے اتنی بڑی لاپرواہی کیسے ہو گئی؟“

”مجھے نہیں پتہ باس! میں نے ملازمہ سے بہت پوچھ گچھ کی ہے، ڈرایا دھکا دیا مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔“

”تم ملازمہ کے بجائے وہاں کے گارڈز سے پوچھو۔ ویسے ہمارا بچہ جال کا میاب رہا۔ میں جانتا تھا کہ دشمنوں کا منجر ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس لیے اس بچے کو میں نے دانے کے طور پر استعمال کیا۔ اتنی آسائشات میں پالا اور آدمی دنیا کے سامنے یہی ڈرامہ کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ کیونکہ میرے دشمن جو مجھ سے اپنی شرائط منوانے کے لیے میری کمزوری کی تلاش میں تھے، اور یہ بچہ جو میرا نام نہاد بیٹا ہے وہ اپنے منجر کے ذریعے اس پر ضرور وار کریں گے۔ اور میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ بس وہ منجر اب جلدی پکڑ میں آ جائے گا جو ہماری اسمگلنگ کی ساری رپورٹیں دشمنوں کو پہنچاتا ہے۔“

ہو گئے۔

”اور اس بچے کا کیا کرنا ہے؟“ کاظمی صاحب بولے۔

”کیا مطلب کیا کرنا ہے؟ ہمارا کام ہو گیا تو مار دینا اسے اب۔ ویسے تو جب اسکو نہ ہر دیا تھا تب ہی تمہیں نہیں بچانا چاہیے تھا۔ مرجانا ایسے ہی۔“

”میں اسے ویرانے میں پھینک دوں گا۔ مارنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اس کا زندہ ہونا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، اسے ہمارے ٹھکانے کے پتہ ہے، اور یہ تمہیں اور سارے لوگوں کو پہچانتا ہے، یہ ہمیں پکڑاوا بھی سکتا ہے۔“

”مگر اس ---“

”اگر مگر کچھ نہیں۔ میں تمہارا پاس ہوں اور میرا حکم ماننا تمہارا فرض ہے۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو تم جانتے ہو کہ اس بچے کے ساتھ تمہیں مروانا، میرے جیسے انڈر ولڈ ڈان کے لیے بالکل مشکل نہیں ہے۔“ وہ آدمی تیز لہجے میں بول کر چلا گیا اور کافی صاحب باہر ہی کھڑے رہے۔

میں آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا، میرا دل زور  
 زور سے دھڑک رہا تھا۔ میرے ماتھے پر  
 ڈھنڈے پینے آرہے تھے۔ میرے اوپر آج  
 بہت بُرے آتش فاش ہوئے تھے، وہ بھی اتنے  
 سارے۔ ایک ساتھ۔ میں دعا کر رہا تھا کہ کاظمی  
 صاحب اندر نہ آئیں، اگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا  
 تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ مجھے ہوش آ گیا ہے  
 اور پھر وہ وہی کریں گے جو کرنے کا انہیں حکم ملا

ہے۔ میری خوش قسمتی کہ کاظمی صاحب کمرے کے باہر سے ہی چلے گئے۔ میں نے آنکھیں کھول کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ سامنے کھڑکی سے شام کا اندھیرا دیا تھا۔ مجھے وہاں سے بھاگنا تھا، ہر صورت اراستہ سے بیٹھے ہی۔

میرے کمرے کے باہر کوئی گارڈز نہیں تھے۔ ان لوگوں کا یہی خیال ہوگا کہ میں ان کی حقیقت نہیں جانتا اس لیے میں ہوش میں آنے پر کبھی بھی بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں نے کمرے سے نکل کر باہر جھانکا۔ کلکسی صاحب بھی اب وہاں نہیں تھے۔ کاریڈور میں اکاؤنٹنٹ لوگ ہی تھے۔ میرے لیے ایک اچھا موقع تھا مگر ہسپتال کے کپڑوں میں ہونے کے باعث میں پکڑا جاسکتا تھا۔ مجھے دوسرے کپڑے چاہیے تھے۔ کسی بھی طرح سے۔ کاریڈور سے ایک وارن بوائے ٹرائی دکھاتا ہوا میرے کمرے کی طرف آرہا تھا، میں واپس بیڈ پر آکر لیٹ گیا اور اس وارن بوائے کے اندر آتے ہی میں کمر پر ہاتھ رکھ کر اپنے گناہ

”کیا ہوا؟“ وہ پریشان سہامیری طرف آیا۔  
 ”میری کمر میں کچھ چھ رہا ہے، دیکھو۔“  
 ”یہاں۔“ میں نے تکلیف بھری آواز میں اسے  
 مزید قریب بلانا چاہا۔

”کس طرف؟“ وہ میرے قریب جھکا  
میں نے اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کے  
میں جکڑا اور اس کی گردن کے پچھلے حصے پر پور  
طاقت سے اپنی کہنی سے وار کیا۔ وارڈ بوائے  
وارنٹس سپہ سکا اور فوراً بے ہوش ہو گیا۔ میں

وہ دروازہ بند کیا۔ اور اس کے کپڑے بدل  
نے پر ماسک لگائے ٹرائل دیکھتا  
ہو۔ لیڈور میں آ گیا۔ میری کوشش یہی تھی کہ  
پہلے کہ کوئی میرے کمرے میں جا کر اس  
دش وارڈ بوائے کو دیکھتا، مجھے اس ہسپتال  
میں جلد جلا لکنا تھا۔ کار لیڈور سے باہر نکلتے ہی  
ہی ہسپتال کے ریسپشن پر پہنچا میری رفتار  
تیزی آگئی۔ مگر اسی وقت مجھے سامنے سے  
ایک صاحب آتے نظر آئے۔ میری سانسیں  
بلاں، میرے منہ پر ماس پر تھا، ایسا مشکل تھا  
وہ ماسک کے باوجود بھی مجھے پہچان لیں مگر  
میرے بھی میرے دل میں ڈر سا تھا۔ وہ میرے  
سے گزرتے ہوئے دو منٹ ٹھٹکے اور ٹھہر  
کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں  
اسی سے ان کے پاس سے گزر گیا اور پیچھے سے  
ان کی بڑبڑانے کی آواز آئی۔

”اتنے چھوٹے بچے کو جاب پر رکھ لیا،  
ت ہے۔“

ان کی یہ بات سن کر مجھے کچھ کلی ہوئی، وہ  
 ہر لڑکے چلے گئے۔ اور میں نے ٹرائی ہسپتال  
 لائسنس پر چھوڑی اور باہر آ گیا۔ باہر آ کر  
 میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی قید سے نکل  
 آیا ہوں۔ میں ہسپتال کی حدود سے باہر آیا اور  
 وال کے کنارے چلنے لگا۔ میں یہاں سے نہیں  
 اور جانا چاہتا تھا۔ وہ دن میں نے پھر سڑکوں پر  
 گزرا، اتنی آسائشوں کے یہ مشکل میرے لیے  
 بہت ہماری ثابت ہو رہی تھی مگر میں پھر بھی  
 اطمینان تھا کہ میں اس چنگل سے نکل آیا ہوں۔

چند دن بعد میں نے ایک ہوٹل میں بیرے کا

کام لے لیا۔ تنخواہ کے پیسے بہت کم تھے مگر میرے لیے غنیمت تھے۔ میں نے ہوٹل کے مالک سے درخواست کر کے رات اسی ہوٹل میں گزارنے کی اجازت لے لی۔ کچھ مہینوں میں ہی میرے پاس پیسے جمع ہو گئے تو میں دوسرے شہر چلا گیا۔ کیونکہ مجھے ڈرتا کہ وہ لوگ ابھی بھی میری تلاش میں ہوں گے۔

دوسرے شہر جا کر مجھے ایک بہتر ہوسٹل میں  
جا بٹل گئی، میں نے اسکول میں داخلہ لے  
لیا اور پڑھائی شروع کر دی۔

دن مہینوں میں اور مہینے سال میں نرے  
 گئے، میں نے میٹرک کے بعد انٹر کا امتحان بھی  
 امتیازی نمبر سے پاس کر لیا۔ اور یونیورسٹی میں  
 الیکٹریکل انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔ یونیورسٹی  
 ختم ہونے سے پہلے میں نے سی ایس ایس کا  
 امتحان دیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

الیکٹرکل انجینئرنگ بننے کے بعد مجھے ایک اچھی جاب مل گئی مگر میں نے دوبارہ سی ایس ایس کا امتحان دیا اور کامیاب رہا۔

میری زندگی میں مشکلیں کم ہوئیں، پھر میں نے اپنے دوست کی بہن سے شادی کر لی اور اپنے بچوں کے ساتھ ایک خوش و خرم زندگی گزار رہا ہوں۔

میرے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی سب خواہش کرتے ہیں۔ مگر یہ سب حاصل کرنے کے لیے میں نے بہت لمبی جستجو کی ہے کیونکہ خواب ان کے ہی پورے ہوتے ہیں جو منزل کو پانے کی جستجو کرتے ہیں۔



صوابی سے ارسال کردہ عبرت ناک تحریر

## حسد کی آگ

حسد ایسی بلا ہے جو اگر چٹ جائے تو پھر موت ہی آپ کا علاج ہوتی ہے۔ حاسد زندگی بھر حسد کی آگ میں جلتا ہے اور موت کے بعد جہنم کی آگ اس کا مقدر بنتی ہے۔

کوثر اسلام

میرا اور احتشام کا تعلق خیر پختون خواہ کے ایک دور افتادہ گاؤں سے ہے۔ ہم دونوں کا بچپن سے کچھ ایسا ساتھ تھا جیسے گہوڑوں کے ساتھ گندم یا برنی کے ساتھ کھویا۔ ہمارا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہوئے اور لڑتے ہوئے بھی۔ میں دن کا زیادہ تر حصہ احتشام کے گھر ہی گزارتا تھا۔ اس کی وجہ ایک تو احتشام سے میری دوستی تھی دوسری احتشام کے ابو۔ احتشام کے ابو ماسٹر اکرام ہمارے گاؤں کے اسکول کے ہی ہیڈ ماسٹر تھے۔ لمبا قد، خوبصورت تراشیدہ داڑھی، موٹا چشمہ اور سفید کپڑوں کے ساتھ کالا واسکٹ پہنے۔ سر اور داڑھی کے بالوں میں سے جگہ جگہ سے سفیدی جھانک رہی تھی۔ انکی شخصیت بہت بارعب تھی، سب ان سے بہت مرعوب تھے اور میں بھی۔ سب انکی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ مجھے بھی

بالکل بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ مجھ میں احتشام میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ ہر شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ ماسٹر اکرام ہمیں محنت کی عظمت کے بارے میں بتایا کرتے تھے، اور ساتھ ساتھ اپنے گزروے ہوئے حالات کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ انہوں نے جب ہوش سمجھا تو فاقوں کو گھر پر راج کرتے اور غربت کی طرف ناچتے دیکھا۔ غربت نے انہیں وقت پہلے بڑا کر دیا تھا۔ وہ سخت محنت کرتے، ساتھ پڑھائی بھی جاری تھی۔ ان کے والد تندرخت مزاج انسان تھے۔ وہ تعلیم خلاف تھے۔ ماسٹر اکرام کی کتابیں نذر کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تو بڑھے گا تو ہم کیا کھائیں گے؟“

ماسٹر اکرام نے مکرہمت نہیں ہاری

حالی کے ساتھ ساتھ مزدوری کرنے لگے۔ انرا لگی محنت رنگ لائی اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے گاؤں میں اسکول میں ماسٹر مقرر ہو گئے۔ مناسب تنخواہ کی وجہ سے گھر کے حالات بہتر ہوئے۔ ہمارے گاؤں کی لڑکی رشیدہ، جن کو اب ہم رشیدہ چچی کہتے ہیں ان سے ماسٹر اکرام کی شادی ہو گئی۔ اللہ نے ان کے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا تھا۔ سب سے چھوٹے بیٹے احتشام اور مارہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ احتشام ابھی ۱۷ سال کا تھا اور مارہ ساڑھے تین سال کا تھا۔

میں تھی۔ ماسٹر اکرام کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ حج کرنے بیت اللہ کی سعادت حاصل کریں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی پینشن کی رقم سے انہوں نے اپنے اور اپنی بیوی کے لیے حج کا داخلہ کر لیا، قرعہ اندازی ہوئی اور ان کا نام نکل آیا۔ انہوں نے پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی اور گاؤں کے سب لوگ انہیں مبارک باد دیے آئے تھے۔ میں بھی انہیں مبارک باد دینے گیا، وہ بہت خوش تھے۔ اور خوش میں بھی تھا کیونکہ انہوں نے اپنی محنت اور ایمانداری کا اچھا صلہ پایا تھا۔



مگر انکی روانگی سے چند دن قبل جب میں اور احتشام ساتھ بیٹھے پڑھائی کر رہے تھے تو اس کے گھر سے فون آیا کہ مائرہ کی طبیعت خراب ہوگئی۔ میں بھی اس کے ساتھ گھر آگیا تو اس کی امی نے بتایا کہ مائرہ ان کی بیٹی عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی ہے۔ کبھی بلاوجہ ہنستی ہے تو کبھی روتی ہے۔ کہتی ہے کہ

”میرے ہاتھ پیروں میں جان نہیں، دماغ پر ایک بوجھ سا ہے۔“ ماسٹر صاحب اور احتشام اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور تسلی دے دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، بس چند دواؤں سے ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر دوائی کے استعمال کے باوجود بھی انکی بیٹی کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ اس کی حالت بگڑتی رہی، ماسٹر اکرام کی روانگی سے ایک دن قبل اس کی حالت بہت خراب ہوئی۔ وہ ساری رات ڈرتی رہی، وہ چیخ چیخ کر ایک ہی بات بولتی۔

”وہ مجھے مار رہے ہیں بابا، مجھے بچاؤ۔ بابا بچاؤ۔“

ماسٹر اکرام نے وہ رات پریشانی میں جاگ کر گزاری۔ اگلے دن گاؤں والوں نے انہیں رخصت کیا۔ جاتے وقت انہوں نے احتشام اور اس کے بھائیوں کو تاکید کی کہ مائرہ کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دو، اور اس کا خیال رکھو۔

”آپ بے فکر رہیں بابا، ہم سب مائرہ کا بہت خیال رکھیں گے۔“ ان لوگوں نے ماسٹر اکرام کی پریشانی کم کرنے کی کوشش کی۔ ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد احتشام اور

اس کے بھائیوں نے مائرہ کو کئی ڈاکٹروں دکھایا، اس کے کئی ٹیسٹ ہوئے۔ ڈاکٹروں ٹیسٹ کے مطابق اسے کوئی مسئلہ تھا۔ ڈاکٹروں نے چند سکون آور دوائیں دیں مگر مائرہ کا مسئلہ بدستور رہا۔ رفتہ رفتہ اس ہاتھ ٹیڑھے ہو گئے۔ اس کی زبان پر چھان پڑ گئے۔ وہ کہتی تھی کہ میرے پیٹ میں آگ جگ رہی ہے۔ احتشام نے بڑی بہن کو بلا لیا۔ بھابھی سے وہ نہیں سلجھ رہی تھی تو شاید بہن کے ساتھ ہونے پر ٹھیک ہو جائے۔ تین دن اور رات مائرہ مسلسل جاتی رہی۔ رات کو بڑی بہن اسے اپنے ساتھ سلاتی مگر وہ سوتی ہی نہیں تھی۔ ساری رات وہ ڈرتی رہتی، چیختی رہتی۔ اگلے دن اس نے کھانا پینا اور باتیں کرنا چھوڑ کر دیں۔ دواؤں میں گھورتی رہتی۔ سب چیخ کے ذریعے اس کے منہ میں پانی ڈالتے لیکن مائرہ اسے پینے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ چند دن اسی طرح گزر گئے اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔

احتشام اور اس کے گھر والوں کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ انکی بہنان کے سامنے موت کے منہ میں جاری تھی مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

احتشام بھی مجھے ساری بات بتانے کے بعد پریشان سا بیٹھا تھا جب آپا ہمارے پاس آئی۔ ”احتشام!“

”جی آپا۔“

”احتشام اگر مائرہ کی حالت اسی طرح رہی تو اس کا بچنا مشکل ہے۔ بیماری تو ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آری۔ ایسا کرو کہ تم اسے مولوی

ماسٹر صاحب کے پاس لے جاؤ۔ شاید کلام پاک کے نام سے اسے کچھ افادہ ہو جائے۔“ انہوں نے انیال لہجے میں کہا۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں آپا۔ میں ابھی مولوی صاحب کو بلا کر لاتا ہوں۔“

مولوی صاحب کے آنے سے پہلے ہی ماسٹر اکرام کا فون آیا۔ وہ بہت پریشان تھے۔ انہیں مائرہ کی فکر تھی اور پھر اس کے علاوہ ان کے پاسپورٹ کا بھی مسئلہ ہو گیا تھا۔ جب گاؤں والوں نے رخصت کرنے کے بعد وہ حاجی کیمپ پہنچے تو وہاں انہیں پتہ چلا کہ ان کے پاسپورٹ میں کچھ مسئلہ ہے، وہ نیا پاسپورٹ بنوائیں۔ جبکہ انکی بیوی باسکتی ہے۔ ان کے کاغذات ٹھیک ہیں۔

ماسٹر اکرام کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ انکی بیوی اکیلی چلی گئیں۔ جبکہ ماسٹر اکرام ارجنٹ پاسپورٹ بنوانے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ ایک ہفتے کی کوششوں کے بعد ان کا پاسپورٹ بن گیا۔ حاجی کیمپ میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد وہ اب حج کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اور یہ سب انہوں نے گھر والوں کو اب فون کر کے بتایا تھا کہ وہ لوگ پریشان نہ ہوں۔

احتشام مولوی صاحب کو بلا کر لے آیا۔ مائرہ چارپائی پر بے سندھ لیٹی تھی۔ اس کا گورا رنگ ہلکی سی طرح زرد ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ مولوی صاحب آنکھیں بند کر کے کچھ پرہتے رہے، اس دوران ان کے چہرے پر کئی رنگ آ جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا کہ اس پر

کالا جادو کی مہلک قسم ”موت کا جادو“ کیا گیا ہے۔ یہ بس آج رات تک کی مہمان ہے۔

سب گھر والوں کا رنگ فق ہو گیا۔ احتشام نے منت بھرے انداز سے کہا۔

”مولوی صاحب خدا کے لیے کچھ کریں۔ میری بہن کو بچائیں۔“

”بچانے والا اللہ ہے۔ اس کا جادو کا توڑ میرے پاس نہیں۔ مگر فکر نہ کریں میرے استاد محترم کو ہستان سے تشریف لائے ہیں۔ آپ کی خوش قسمتی ہے۔ وہ بہت بڑے عامل ہیں۔ میں انکو بلا کر لاتا ہوں۔“ مولوی صاحب یہ کہہ کر اٹھ گئے۔ کافی دیر کے بعد وہ جب واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک نورانی شخصیت تھی۔ نورانی چہرہ لمبی داڑھی، سفید کپڑے، سر پر گھڑی باندھے وہ کافی بارعب لگ رہے تھے۔

”السلام علیکم باباجی! ادھر تشریف لے آئیں۔“ احتشام کے بڑے بھائی نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

بابا مائرہ کو احتشام اور اس کی بڑی بہن کی موجودگی میں کمرے میں لے گئے۔ باقی سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ بابا نے اپنے ارد گرد ایک حصار کھینچی اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد مائرہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اس کی آنکھیں لال انگارے ہو رہی تھیں۔ اس کے سر کے بال کھڑے تھے۔ اس نے غرا کر کہا۔

”زندگی چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ۔“ یہ آواز یقیناً مائرہ کی نہیں تھی۔ بابا پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کیے اپنے عمل میں مصروف رہے۔ مائرہ نورانی بابا کی طرف لپکی۔ مگر اسے

## اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد.....

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

بہت جلد.....

زور کا جھٹکا لگا۔ اور وہ چارپائی پر گر گئی۔ وہ نورانی بابا کے ان دیکھے حصار سے ٹکرائی تھی۔ نورانی بابا نے آنکھیں کھول کر اسی پر پھونک ماری تو وہ ترپنے لگی۔ اس نے چیخ کر کہا۔

”بس کرو۔“

مگر نورانی بابا نے عمل جاری رکھا۔ مائزہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلانے لگی۔ کچھ دیر بعد جب نورانی بابا نے عمل ختم کر کے پھونک ماری تو مائزہ بے سدھ ہو کر بستر پر گر پڑی۔ احتشام اور آپا تیزی سے آگے آئے۔ اور مائزہ کو سنبھالا۔

”بیڑہ فکر کی کوئی بات نہیں، تمہارے ایک رشتہ دار نے یہ کالا جادو کیا تھا۔ کالے جادو کے زور پر کچھ شدید جن بھی آئے۔ مگر جادو اور جنات میں نے ختم کر دیے۔ ایک ہفتے میں اس کے اثرات مکمل ختم ہو جائیں گے۔ میں آپ کو کچھ تعویذ دے دیتا ہوں۔ آپ یہ بچی کو پہنا دیجئے گا۔“ یہ کہہ کر بابا نے کچھ تعویذ لکھ کر دیے اور کہا ساتھ میں چند دنوں تک گھر میں سرخ مریچوں کے ساتھ یہ چھ تعویذ جلائیں۔

ماسٹر اکرام کی واپسی تک مائزہ بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ انکی آمد کے دو دن بعد ماسی خالدہ ماسٹر اکرام سے ملنے آئیں۔ وہ ماسٹر اکرام کی خالدہ زادہ تھیں۔ انکی حالت بہت خراب تھی۔ ان کے بدن پر جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی پھنسیاں نکل آئیں تھیں۔ اس میں سے پیپ نکل رہی تھی اور ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی۔ وہ ماسٹر صاحب کے پیروں میں پڑ گئی۔ اور رورور کر معافی مانگنے لگی۔

”مجھے معاف کر دو ماسٹر میں حسد کی آگ میں

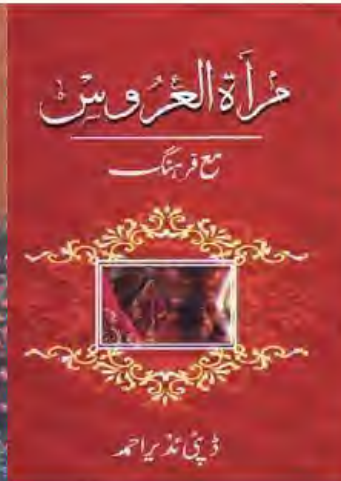
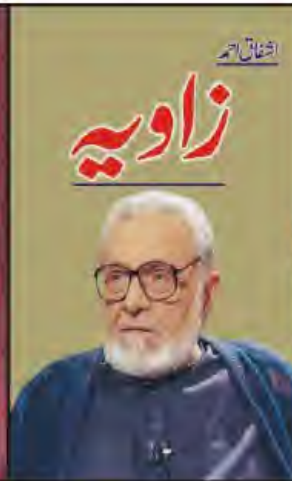
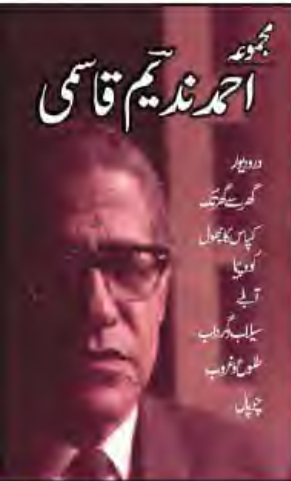
☆☆.....☆☆





# UrduGem.com

## URDU KA KHAZAANA



بورڈی شریف سے ارسال کردہ تحریر

## قلندری طریقت

ہمیں اپنے بزرگوں سے محبت کرنی چاہیے اور ان کا احترام کرنا چاہیے اور اس کا سب سے اچھا طریقہ ہے کہ خرافات کے بجائے ان کے سیدھے سادھے راستے کو اپنائیں

### شمسین جوینجو



وادی مہران کو سلام عقیدت پیش کرتے ہیں جسے باب السلام ہونے کا شرف حاصل ہے جس کے وجود نے اسلامی مراکز آج بھی بلند و بالا بنار کی طرح کھڑے گزرے ہوئے حسین لمحات کی یاد تازہ کرتے ہیں ایسے چند مقامات ہیں۔ سیون روہڑی، حیدر آباد، سکھر، بکھر، بھٹ شاہ، ہالا، ٹھاری، بلوی، شہداد کوٹ، ٹھٹھہ، لاڑکانہ اور پیر جو گوٹھ شامل ہیں۔

جن کے لطن اقدس میں اُن گنت محبوبان خدا صحابہ کرام، تابعین، اغواٹ، اقطاب، ابدال، علماء، رہائین، فقہاء، احناف، موحثین، مفسرین اور محققین آرام فرما ہیں۔

ایسی ہی ایک عظیم ہستی سیون شریف (ضلع دادو سندھ) میں آرام فرما ہیں۔ جنہیں دنیا شہباز ولایت، مخدوم اولیاء، سید الاصفیاء، امام الاقفا، حضرت حافظ سید محمد عثمان مروندی سیوانی سرکار المعروف لال شہباز قلندر قدس سرہ الاقدس کے نام سے جانتی ہے۔

سیدنا عثمان غنی ذوالنورین کے مزار پر لے ۱۱۱ اور سلام عرض کرنا چنانچہ والد صاحب نے وصیت ایسا ہی کیا۔

(لال شہباز قلندر صفحہ 54)

حضرت شہباز قلندر چھٹی صدی ہجری کے ۱۱۱ میں ترمیز (آذربائیجان، روس) کے قریب ہالا گاؤں مروند میں 573ھ/1177ء میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔

آپ صبح النعب سادات میں سے ہیں اور سیدنا امام محمد جعفر صادق کی اولاد سے

حضرت شہباز قلندر کو بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا از حد شوق تھا اور سات سال کی عمر میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ تھوڑے ہی عرصہ میں عربی اور فارسی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔

”لال اور شہباز کا مطلب“

”آپ کو لال شہباز کہا جاتا ہے اس کا مطلب ہے کہ لعل کے متعلق ایک حکایت سے روشنی پڑتی ہے۔ امام العارفین غوث العارفین تیرہویں صدی کے مجدد برحق حضرت محمد راشد پیر سائیں رونے دھنی قدس سرہ اپنے ملفوظات





مبارک میں فرماتے ہیں۔  
”مخدوم لعل شہباز کو کامل اکمل ولی اللہ کی تلاش تھی عرصہ دراز کی جستجو کے بعد آخر جویندہ ہائندہ است ایک عشق کے جلے ہوئے اور سراپا سوز و درد محض کی زیارت نصیب ہوئی اور ان کی صحبت اختیار کی جب نماز کا وقت ہوا تو شہباز قلندر نے بزرگ سے عرض کی بزرگوار نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے اٹھیے کہ نماز ادا کریں۔“ بزرگ نے فرمایا۔

”نماز کیا ہے؟“

شہباز قلندر نے کہا۔

”نماز عبادت..... پھر بزرگ کو وضو کرا کے جماعت میں لا کھڑا کیا اور شہباز قلندر خود امام بن گئے مخدوم شہباز قلندر نے جب نماز کی تکبیر اللہ اکبر کہی تو اللہ کا اسم پاک سن کر وہ بزرگ محبوب حقیقی کے عشق میں جل کر خاک ہو گئے۔

مخدوم رحمۃ اللہ علیہ جب نماز سے فارغ ہوئے تب کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بزرگ تو جل کر خاک ہو چکے ہیں۔

وہ لوگ جن کے ہاں اللہ تعالیٰ کا نام پاک لیا جائے تو وہ انوار و تجلیات کی ہیبت سے ڈر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جلال و عظمت سے پروانوں کی طرح اپنی ہستی کو جلا دیتے ہیں ان کی نگاہ غیر اللہ کی طرف نہیں اٹھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں دیکھتی۔

شہباز قلندر نے وہ خاک اقدس اپنے چہرہ انوار اور بدن پر مل لی۔

اس خاک پاک کا شہباز قلندر پر ایسا اثر ہوا کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا نام مبارک سنتے تھے تو یکدم آپ کے جسم کے ہر ایک بال مبارک کی جڑ سے خون نکلتا تھا۔

اس روز سے شہباز قلندر لال کہلائے کے لغوی معنی ہیں سرخ رنگ کا قیمتی پتھر۔  
طرح لعل پتھروں میں اعلیٰ شان والا ہے۔  
طرح شہباز اولیاء اللہ میں اعلیٰ شان والے ہیں۔  
شہباز جس طرح شہباز (بڑا باز) پرندہ پرواز کے سبب تمام پرندوں کا سردار کہلاتا ہے اسی طرح حضرت شہباز قلندر بلند پرواز کے سبب قلندروں کے سردار پیشوا اور شہباز ولایت ہیں جیسا کہ سرکار غوث اعظم حیدر پیران حیدر دہلوی نے قصہ غوثیہ میں فرماتے ہیں۔

”جس طرح باز اشعب (سیاہ سفید پرور والا باز) تمام پرندوں پر غالب ہے اسی طرح میں تمام مشائخ پر غالب ہوں۔“

ان دلائل سے واضح ہوا کہ لال کہلانا سر (لال) لباس کی وجہ سے نہیں تھا۔ جس طرح عام لوگوں نے اور غیرت مستند کتابوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ شہباز قلندر سرخ لباس پہنتے تھے بلکہ اس لال خون کی جانب نسبت ہے جو کہ محبت اللہ میں جسم کے ہال بال سے جاری ہوا تھا۔  
سندھ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی رقم طراز ہیں۔

آپ سیر و سیاحت کرتے ہوئے عارف کامل حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر رپانی (جو کہ سراج الامت امام اعظم سینا ابو حنیفہ کے اولاد سے تھے) کی خدمت میں پہنچے انہوں نے فرمایا۔

”ہند میں تین سو قلندر موجود ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ سندھ تشریف لے جائیں۔“ ان کے مشورہ کے مطابق آپ نے سندھ میں پہنچ کر سیونستان (سہون شریف) میں قیام فرمایا۔

(تحفہ الاکرام سندھی جلد 3 صفحہ 349 تذکرہ صوفیائے سندھ صفحہ 202)

اس سے یہ روایت رد ہوتی ہے اکثر جہلا میں اور ہے کہ دنیا میں فقط ڈھائی قلندر ہوتے ہیں۔

حضرت شہباز قلندر مخدوم سید محمد عثمان مردندی رحمۃ اللہ علیہ اخیر عمر مبارک میں سیہون تشریف لائے۔

حضرت شہباز قلندر بذریعہ کشتی دریائے ندھ پر بخسرتھے۔ جب کشتی کئی شاہ صدر کے قریب پہنچی تو امام الاولیاء شیخ المشائخ سند الاتیقا آفتاب ربانی حضرت سید صدر الدین شاہ لگیاری رحمۃ اللہ علیہ (آستانہ علیہ) کئی شاہ صدرا شیشین کے برابر میں ہے اور تحصیل سیہون شریف کی آرامت اور تصرف سے شہباز قلندر کی کشتی رک گئی۔

حضرت شہباز قلندر راز کو سمجھ گئے اور کشتی سے اتر کر سیدھے غار میں حضرت کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔

جہاں آپ پہاڑی کی غار میں چلہ گاہ میں مسرور عبادت تھے۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد حضرت نے فرمایا۔

”آپ سیہون میں قیام فرمائیں اور دین کی خدمت بجالائیں۔“

شہباز قلندر نے جواب میں دودھ سے بھرا ہوا پیالہ خدمت میں پیش کیا جب کہ مطلب یہ تھا کہ یہ علاقہ دودھ سے بھرے ہوئے پیالے کی مانند اولیاء اللہ سے بھرا ہوا ہے۔ اب میری کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

حضرت نے بھرے ہوئے دودھ کے پیالے پر گلاب کا پھول رکھ دیا اور ارشاد فرمایا۔

”یہ علاقہ (سیہونستان) اولیاء اللہ کرام سے اگرچہ بھرا ہوا ہے لیکن آپ اس پھول کی طرح

ممتاز ہوں گے۔  
شہباز قلندر راضی ہو گئے اور مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا اور فرمایا۔

روایت ہے کہ سیہون میں قیام سے قبل قلندر شہباز نے کئی میں شاہ صدر الدین سے ملاقات کی اور ان سے عرض کی کہ آپ اپنی اولاد میں ایک بیٹا میرے ساتھ کیجیے تاکہ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔

چنانچہ شاہ صدر الدین نے اپنا پوتا شاہ صلاح الدین لگیاری ان کی خدمت میں دے دیا۔ سید صلاح الدین کو ہی قلندر شہباز کے دربار کی سجادہ نشینی نصیب ہوگی۔

ایک دوسری روایت ہے کہ آپ اپنے تینوں احباب غوث بہاؤ الحق زکریا، سید جلال الدین بخاری اور بابا فرید الدین گج رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ شاہ صدر الدین کی زیارت کو گئی آئے تھے۔ (شہباز قلندر صفحہ 78)

شہباز قلندر کے عہد میں سیہون گویا سندھ میں علم و علماء الاسلام کا مرکز تھا اور آپ علماء کے اس کھکشاں میں مثل آفتاب تھے۔

مخدوم شہباز قلندر نے سیہون میں رہ کر مجڑے ہوئے لوگوں کو سیدھے راستے پر لگایا اور ان کے اخلاق کو سنوارا انسانوں کے دلوں میں نیکی اور سچائی کی لگن پیدا کی اور ایک روحانی ماحول پیدا کیا۔ وہ دو سال تک سیہون شریف میں رہ کر اسلام کا نور سندھ میں پھیلاتے رہے۔

ہزاروں انسانوں نے آپ سے ہدایت پائی اور بہت سے بھٹکے ہوئے لوگوں کا رشتہ اللہ عزوجل سے جڑ گیا۔

ان کے رشد و ہدایت کا سلسلہ سندھ تک محدود نہیں روں سے لے کر سندھ تک پھیلا ہوا



ہے۔

انہوں نے ساری زندگی تبلیغ کی پورے برصغیر کا روحانی دورہ کیا۔ مدرسہ بہار سیہ ملتان میں بیٹھ کر عرب و عجم کے طالبات علم ظاہر و باطن کو فیضیاب کیا۔

آپ کی تصانیف سے ایک دنیا ایک طویل عرصہ تک آسٹاب فیض کرتی رہی۔

اس کے علاوہ وصال کے بعد سے آج تک کروڑوں عوام و خواص مزار مقدس سے فیضیاب ہوتے ہیں اور تاحشر سیراب ہوتے رہیں گے اور ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق استفادہ کرتا رہے گا۔

حضرت شہباز دلایت شہباز قلندر مخدوم حافظ حاجی سید محمد عثمان سیوہانی قدس سرہ الاقدس اکثر ایک وزنی پتھر گردن میں لٹکا لیتے تھے۔ ایک تو وہ پتھر تبرک تھا اور دوسرا یہ کہ وزنی ہونے کے سبب گردن ہمیشہ جھکی رہتی تھی۔ اس سے انسان میں تکبر پیدا نہیں ہوگا۔ تواضع و انکساری انسان کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ جتنی تواضع زیادہ ہوگی اتنا مرتبہ بلند ہوگا۔ سر جھکانے کے سبب نظر کی حفاظت ہوتی ہے وہ خواہ مخواہ بھٹکنے سے محفوظ رہتی ہے اور توجہ و خیال ہمیشہ اللہ سبحان و تعالیٰ کی جانب رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مسلمانوں کو نظر کی حفاظت کے لیے اس طرح حکم فرمایا ہے۔

”ترجمہ: اے محبوب ﷺ مسلمان مردوں کو حکم دوا پیں لگا ہیں کچھ پٹی رکھیں۔“ (سورۃ النور)  
آپ نے شادی نہیں کی تھی۔ اس لیے شادی ترک کی کہ آپ ہمیشہ سفر میں رہتے تھے اگر حضرت لعل شہباز قلندر کی پیروی کرنے کا شوق ہے تو پرہیزگاری کریں، بیخ وقتہ نماز کی پابندی

معمول بنالیں، شب بیداری کی عادت ڈالیں ذکر شریف و درود شریف کا کثرت سے ورد کریں اپنے بچوں کو حافظ قرآن بنائیں حرام سے اجتناب اور شریعت مطہرہ پر عمل پیرا ہوں۔

حضرت شہباز قلندر سید محمد عثمان مروندی 21 شعبان المعظم 25ھ/1454ء کو رحلت ایزدی کی آغوش میں آرام فرما ہوئے۔

حضرت شہباز قلندر مخدوم محمد عثمان کا مقبرہ شریف سب سے پہلے سلطان فردوز تعلق کے زمانے میں والی سیون ملک اختیار الدین نے 1757ء کو تعمیر کروایا۔

اس کے بعد اکبر بادشاہ کے عہد اقتدار میں (ترخانی) خاندان کے آخری حکمران مرزا جانی بیک نے بنوایا۔ جانی بیک کی وفات کے بعد ان کے بیٹے غازی بیک نے 1009ء کو روضہ کی مرمت کروائی۔

شاہجہان کے زمانے میں نواب سید مجوہ عرف دیندار خان نے خانقاہ کی عمارت کو مکمل کروایا اور خانقاہ کے صحن کو کاشی کی اینٹوں سے مزین کیا اور متصل مسجد شریف تعمیر کروائی۔

حضرت شہباز قلندر کے مزار کا چوترا لاڈکانہ کے زمیندار رئیس حاجی محبوب خان دکن مرحوم نے بنوایا۔

روضہ پاک کے دروازے پر 1312ھ/1894ء کو اوستہ نور محمد فیصل گرنے چاندی چڑھائی۔

آج کل بازار میں شہباز قلندر کی جو تصویر دستیاب ہے۔ وہ تصویر جعلی ہے اور حضرت شہباز قلندر کی تعلیمات کے برعکس ہے۔ اس کا اصل سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

لیکن شہباز قلندر کی ایک قدیم نادر و نایاب

تصویر کا محقق و مورخ سید جسام الدین راشدی مرحوم نے سراغ لگایا اور کتاب مقالات الشعراء (مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ 1957ء) کے صفحہ 411 پر عکس دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ تصویر لاہور کے میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ تصویر بھی اصل نہیں ہے بلکہ کسی مصور کی پینٹنگ کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ بھی یقیناً ہے کہ یہ تصویر بازاری تصویروں سے کافی مختلف و قدیم ہے۔ مغل دور یا اس سے بھی پہلے کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم دور میں انسانوں کے دماغ میں شہباز قلندر کے متعلق کیا تصور تھا وہ تصور اس تصویر سے ابھرتا ہے اور یقیناً کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

یہ تصویر حضرت شہباز قلندر کی تعلیمات کی روشنی میں حقیقت کے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ آپ ایک سایہ دار درخت کے نیچے جاتے نماز پر تہہ کی صورت میں بیٹھے ہیں لباس عربی اسلامی ابا کرتا زیب تن ہے ہاتھ میں تسبیح ہے داڑھی مبارک سفید حد شرعی (مٹھی بھر) سے ایک دو انگلی زائد زلف مبارک کانوں کی لوتک، موچیں سنت مبارک کے مطابق کٹی ہوئی اور بھنوں کی طرح ہار ایک ہیں چہرہ مبارک چاند کی طرح روشن مالانہ و فقیرانہ شان سے تشریف فرما ہیں۔

آج کے ملک اپنے نفس کے غلام ہیں عزت کی تعلیمات پر قطعی عمل پیرا نہیں غیر شرعی اور ریسیں انہوں نے خود نکالی ہیں۔ جن کا حضرت شہباز قلندر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ انہیں چاہیے کہ مذکورہ تصویر کی روشنی میں اپنا جائزہ لیں۔

شہباز دلایت مخدوم اولیاء حضرت حاجی حافظ سید محمد عثمان مروندی سیوہانی قدس سرہ الاقدس کا عرس مبارک ہر سال آپ کی درگاہ

عالیہ پر بتاریخ 18، 19، 20 شعبان المعظم کو نہایت عقیدت و محبت سے منایا جاتا ہے۔ جس میں دور دراز علاقوں سے لوگ آکر شریک ہوتے ہیں اور آپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں عرس مبارک میں صرف سندھ ہی نہیں بلکہ پنجاب، بلوچستان، مکران، سرحد کے علاوہ ہندوستان، افغانستان اور ایران سے بھی لوگ بکثرت شریک ہوتے ہیں۔

اب تو حکومت کی طرف سے ادلی کا نفرنس اور ثقافتی شو (موسیقی) بھی ہونے لگے ہیں یہ دربار مقدس محکمہ اوقاف سندھ کے قبضے میں ہے جس کی بے انتظامی دیدنی ہے۔

عرس شریف کے مبارک و مقدس پروگرام کو اخلاق و کردار سے آزاد لوگوں کا میلہ ملاکھانا، ناچ گانا، کھیل تماشا خوانین کا بے پردہ ہونا، محفل موسیقی، دھمال اور دھمال پر عورتوں کا رقص، شور و ہنگامہ، مزار میں مہندی لے جانا قلندر کی شادی کرانا، ملتکوں کی عجیب و غریب حرکتیں، اصحاب کرام کی شان میں گستاخی اور بدرسموں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

ان تمام خرافات کا حضرت شہباز قلندر کے عقیدہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

حکومت اور مسلمانوں کو ان خرافات و بیہودہ حرکات کا نوٹس لینا چاہیے۔ شہباز قلندر کا نذرانہ جو کہ ہزاروں روپے پیمید اور لاکھوں روپے ماہانہ بنتا ہے حکومت لے جاتی ہے لیکن حضرت کی اصل تعلیمات مسلک و مشرف پر خرچ نہیں کرتی۔ اس نذرانے کی آمد سے حضرت کا اصل دارالعلوم (فقہ السلام) جاری کرنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

☆☆☆☆

ملتان سے ارسال کردہ دلخراش تحریر.....

## تماشا

وہ بھی سراپا سوال تھی کہ یہ میڈیا اس وقت کہاں تھا جب مجھے نو چار کھوٹا

جار ہاتھا..... عصمت دری کرنے والے تو جرگے کی نظر میں محترم ٹھہرے

فاطمہ عبدالالحق

میرے گھر کے سامنے میڈیا کا ہجوم ہے۔ ہر

چینل والے دوسرے چینل پر بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ میرے گھر کے سامنے ہجوم کیوں تھا؟ آخر ایک کون سی خبر تھی جو میڈیا کو ایک غریب کے در تک پہنچ لائی تھی۔ دراصل یہ سب یہاں میرا تماشا لگانے آئے تھے۔ یہ کس قسم کا تماشا تھا؟ اس کے لیے آپ کو میری کہانی سنا ہوگی آئیں میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں۔

میرا نام بختاور تھا لیکن مجھ سے زیادہ بد نصیب اس دنیا میں کوئی نہیں جنوری کی سرد شام کو میں ملتان کے ایک قبائلی علاقے میں پیدا ہوئی۔

خاندان کے بڑوں سے سنا ہے کہ میرا باپ مجھے دیکھنے نہیں آیا کیونکہ اسے بیٹے سے مطلب تھا جب بیٹا پیدا نہیں ہوا تو سب جائے بھاڑ میں اُن کی بھلا سے انہیں کیا؟ جس قدر جشن مجھ سے چار سال بڑے بھائی احسن کی کی بار منایا گیا تھا

ات نہ ہو سکی کہ ابا سے دوبارہ اس موضوع پر بات کر سکیں۔

البتہ ابا نے مجھ پر اتنا احسان ضرور کیا تھا کہ ایک استانی مجھے قرآن پاک کی تعلیم سکھانے امارے گھر آنے لگیں وہ بہت اچھی خاتون تھیں۔ انہوں نے مجھے قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھانا سکھایا۔

اس کے ساتھ انہوں نے مجھے اردو زبان کو پڑھنے اور لکھنے کی مشق بھی کروانا شروع کی آہستہ آہستہ میں پڑھنے کے ساتھ لکھنے کے قابل بھی ہو گئی۔

وہ مجھے نئی نئی اسلامی اور تاریخی موضوعات پر کتابیں لاکر دینے لگیں یوں میں ایک نئی دنیا سے

روشناس ہوئی پھر یوں ہونے لگا کہ میری راتیں علم کے سمندر میں غوطے لگاتیں اور میرے دن بالکل ویسے ہی ایک بھیڑ بکری کی طرح گزرتے تھے۔ دنیا کی ہر راحت اور تفریح ختم ہونے کے لیے ہی ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کبھی اس کی مدت لمبی ہوتی ہے اور کبھی چھوٹی میری تفریح کی عمر ذرا چھوٹی تھی۔

کبھی ایک دن میں کتاب چھپانا بھول گئی اور ابا نے اسی دن میری استانی کو ذیل کر کے نکال دیا یوں وہ واحد روشنی کی کرن جس کی بدولت میں باہر کی دنیا سے روشناس ہو رہی تھی۔

بجھادی گئی کیونکہ ابا کا خیال تھا کتابیں لڑکیوں کو باغی بنا دیتی ہیں یوں میری زندگی کا



اکلوتا روشن دان جس کے ذریعے سورج کی روشنی  
مجھ تک پہنچی تھی بند کر دیا گیا۔

میری آنکھیں جو ابھی نئے نئے خواب بننے کا  
نقصور کر رہی تھیں ان کی کرپیاں میری روح کو  
لبو لہان کر گئیں۔

میری سسکیاں میرے سینے میں ہی دم توڑ  
گئیں تب میرا بچہ چاہا تھا کہ میں جنگل کے کسی  
دیران حصے میں چلی جاؤں اور حلق پھاڑ پھاڑ کر  
روؤں لیکن میں ایک لڑکی تھی اور لڑکیاں بہت  
مضبوط ہوتی ہیں وہ بڑے سے بڑے درد چپ  
چاپ سہہ لیتی ہیں میں نے بھی سب کچھ سہہ لیا  
تھا۔ میرا بھائی احسن خان اچھے اسکول سے نکل کر  
اب شہر کے مشہور کانٹن میں پہنچ گیا تھا۔ اس کے  
پاس جس قدر تعلیم آئی تھی وہ اسی قدر جاہل اور  
وحشی بنا گیا۔ پہلے زمانے میں لوگ تعلیم اس لیے  
دلاتے تھے کہ ان کے بچے پڑھ لکھ کر معاشرے کو  
ایک اچھا انسان دیں لیکن مقام افسوس کہ آج کل  
لوگ اس لیے تعلیم حاصل کرتے ہیں تاکہ زمانہ  
جاہلیت کی اقدار کو دوبارہ زندہ کریں پہلے کے  
زمانے اور اب میں صرف اتنا فرق ہے کہ پہلے  
کے لوگ بیٹیوں کے جسم زندہ زمین میں دفنا دیتے  
تھے جبکہ آج کل زندہ روہیں دفنائی جاتی ہیں اور وہ  
بھی انہی بیٹیوں کے جسموں کو قبر بنا دیا جاتا ہے وہ  
زندہ لاش کی مانند زندگی بسر کرتی ہیں۔

زندگی تو پہلے ہی بہت درد دے چکی تھی مگر وہ  
دن میری زندگی پر حریک لک میرے چہرے پر مل  
گیا۔ وہ دن جب میرے بڑے ہوئے جوان  
بھائی نے محلے کی ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کی  
تھی۔ لڑکی والوں کو جب علم ہوا تو وہ میرے بھائی  
کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے لیکن میرے ابا نے  
کہا۔

”میرے بھائی کو قتل کیا جائے یا کوئی اور  
اس کا فیصلہ جرگہ سناے گا۔“

فیصلہ کرنے کے لیے چوک میں جرگہ بٹھایا  
اور ہمارے ہاں جو عورتیں دروازے کی درز سے  
بھی جھانکنے کا اختیار نہیں رکھتیں وہ بھی چوک میں  
جمع تھیں ایک طرف ہمارا خاندان تھا جبکہ دوسری  
طرف مظلومہ کا خاندان تھا درمیان میں جرگہ  
کے لوگ تھے اور آس پاس علاقے کے لوگوں کا  
ہجوم تھا۔ ہر شخص جرگے کا فیصلہ سننے کے لیے  
تاب تھا۔ لیکن جرگے نے جو فیصلہ کیا وہ کسی بھی  
غیرت مند باپ یا بھائی کے لیے شرم سے ڈوب  
مرنے کا مقام تھا مگر میرے باپ اور بھائی کو کوئی  
فرق نہیں پڑا تھا۔ میرا دل چاہا تھا کاش زمین دو کوٹ  
بھنے اور میں اس میں سا جاؤں کیونکہ جرگے کا فیصلہ  
تھا جس طرح میرے بھائی نے مظلومہ راحیلہ پر  
ظلم کیا بالکل اسی طرح راحیلہ کا بھائی لڑکے کی  
بہن یعنی میرے ساتھ زیادتی کرے گا۔

مجھے لگا تھا کہ یقیناً آج تو میں مری جاؤں گی  
لیکن میں بھی اپنے نام کے بالکل الٹ تھی ہاں  
لیکن میری ماں خوش قسمت تھی جو وہیں آخری  
سانس لے کر گر گئی مجھے اس لمحے دکھ کی بجائے اپنی  
ماں پر رشک آیا تھا۔ میری آنکھوں نے جب کسی  
کو بھی اس ظلم میں اپنا سامھی نہ پایا تو میں نے اپنی  
آنکھیں راحیلہ پر گاڑ دیں۔ مجھے گھسیٹ کر  
کمرے کی طرف لے جایا جا رہا تھا مگر میری  
آنکھیں راحیلہ پر جمی ہوئی تھیں جن میں یہ التجا  
چھپی ہوئی تھی کہ تم تو میرے جیسی ہی ایک عورت  
ہو تم پر جو ظلم ہوا وہی مجھ پر ڈھایا جا رہا ہے تم ہی  
میرے درد کو سمجھ لو۔

لیکن اس نے بھی منہ موڑ لیا۔ دانت کے  
بدلے دانت کان کے بدلے کان آنکھ کے

## مشورہ صبا کے ہاتھ

چلو اب بھول جائیں ہم پرانی رنجشیں ساری  
نئی اک ابتدا کر لیں

کبھی جو خواب دیکھا تھا

کہل کر ہم محبت کے حسیں نفے ہمیشہ گنگنا میں گئے  
درختوں سے گلے کر

ہوائیں راگ چھپیں گی تو ہم بھی جھوم جائیں گے  
پہاڑوں کی فلک سے باتیں کرتی چوٹیوں سے

بادلوں کے رحم پہ بارش پیٹھ کرادی میں اترے گی  
تو دونوں بھیک جائیں گے

سمندر کے کنارے ڈوبے سورج کا منظر

دیکھ کر ہم کھوسے جائیں گے

کبھی ساحل کی گیلی ریت پر بیٹیوں چلیں گے

اور قدم نہ ڈکھائیں گے

شب ماہتاب جب ہوگی تو

اس کی دودھی سی چاندنی میں بیٹھ کر

گھٹنوں بہت ہی ریتک باتیں کریں گے مسکرائیں گے

یہ باتیں سوچتے تھے ہم

تمہیں کیا یاد ہے جاناں تمہیں بھی یاد تو ہوں گی؟

وہ راتیں وہ ملاقاتیں

میرے کانوں میں جو رس گھول دیتی تھیں تری باتیں

تمہیں وہ عہد سارے یاد تو ہوں گے؟

گل

لے آنکھ اور قتل کے بدلے قتل ضرور لکھا ہے مگر  
بادی کے بدلے زیادتی کہیں نہیں لکھا ہوا۔

”کیا تم نے سورۃ سجدہ نہیں پڑھی؟ اللہ تعالیٰ  
کہتا ہے پرانی کو بھلائی سے دور کرو۔ پھر یہ ظلم  
ہاں؟“ کسی اور کے گناہ کی سزا ایک بے گناہ کو  
یوں؟ جرگے کا فیصلہ میری زندگی میں اندھیرا  
لے آیا۔ مجھے اگر زندہ درگور کر دیا جاتا تو بھی میں  
آپ تک نہ کرتی۔ مجھے اگر دیوار میں چنوا دیا جاتا  
تو وہ بھی مجھے قبول تھا۔ لیکن درندگی کا نشانہ مجھے  
یوں بنایا گیا؟ میں نے اس درندے کی کتنی باتیں  
کیں وہ مجھے چھوڑ دے؟ یا مجھ سے نکاح کے دو  
دل ہی بڑھوا لے اور مجھے ساری زندگی سزا دینا  
ہے۔ مجھے سب منظور تھا مگر میری وہاں کسی ایک  
بہن یعنی سنی۔

میں اپنی نظروں میں گر کر بھی نہ مری بلکہ ابھی  
تک زندہ ہوں۔ یہاں باہر میڈیا کا ہجوم ہے جو  
مجھے انصاف دلانے کی بات کرتا ہے۔ یہ میڈیا  
”اب کہاں سوچا ہوا تھا جب مجھے نوجوا کھوٹا گیا تھا  
اب ایک بے گناہ ہوتے ہوئے بھی مجھے بھاری  
سزا دی گئی تھی۔ جب ایک مرد کا بھگتان ایک  
عورت بھر رہی تھی اب کہاں کا انصاف؟ کیسا  
انصاف؟ کیا تمہارا یہ انصاف میری کھوئی ہوئی  
”صمت لوٹا سکتا ہے؟ یہ سب مجھے انصاف دلانے  
نہیں بلکہ میرا تماشہ بنانے آئے ہیں۔ ورنہ کوئی  
ان جرگے والوں کو کیوں نہیں پوچھتا؟ انہیں سزا  
کیوں نہیں دیتا؟ جن کے فیصلے میری جیسی لڑکیوں  
کو اجاڑ رہے ہیں؟ آخر کب تک یہ سلسلہ چلتا  
رہے گا؟ آخر کب تک یہ تماشے ہوتے رہیں گے  
تک تک بے گناہ عورتیں تم مردوں کے کیے کی  
سزا بھگتیں گی؟ آخر کب تک؟

☆☆.....☆☆



## ڈھا کہ بوائز

صرف وہ ہی تو ہیر نہیں ہوتا جو ہر دل میں بسا ہے کچھ ہیر و گمنام بھی

ہوتے ہیں مگر ان کی گمنامی سے بڑے بڑے نامور پیدا ہوتے ہیں.....

الماس فاطمہ ارمان

یہ کہانی میں آنکھوں دیکھی سنار ہی ہوں اس

کی تصدیق سمانی وی دنیا کی وی اور چیو چیل نے بھی کی ہے۔  
یہ کہانی ہی نہیں یہ حوصلہ اور امید ہے یہ جستجو ہے یہ اپنے ملک اپنے محلے سے محبت ہے اس پاس کے رہنے والوں سے پیار ہے یہ ہمارے محلے دنگیر بلاک 15 جاوید نہاری کے ساتھ والے پارک طارق محی الدین کی ہے جو کسی زمانے میں بہت خوبصورت ہوتا تھا۔

چھوٹے بڑے سارے دن کی تھکان اور گرمی سے بچنے کے لیے خاص طور پر جبکہ لوڈ شیڈنگ عروج پر ہوتی تو بچوں کو لے کر یہاں پر آ جاتے۔ کچھ فضول لوگوں نے اس پارک کو خراب کر دیا یعنی جھولے وغیرہ توڑ پھوڑ دیے جو خوبصورت پانی کا فوارہ بنایا ہوا تھا۔

اُس کو بھی خراب کرنے کے ساتھ توڑ دیا لوگوں نے یہ دیکھتے ہوئے وہاں پر کوڑا کرکٹ گھروں کا لمبہ پھینکنا شروع کر دیا تو لوگوں نے

محنت اور جدوجہد میں 70 لاکھ شامل تھے۔ انہوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا اس پارک میں جھکے ہوئے ڈھنوں کو فریش کرنے کے لیے ہمیں کوئی پروگرام ترتیب دینا چاہیے۔

انہوں نے اپنے بڑوں سے فیصلہ لیا جن میں قنبر بھائی اور دیگر جن کے نام مجھے نہیں پتہ ان سے مدد اور ان کی خوشی اور فیصلہ پوچھا وہ سب بہت خوش ہوئے۔

اس طرح 15 اپریل کو اس پارک کی سالگرہ کا اہتمام کیا گیا کیونکہ ان لڑکوں نے 15 اپریل سے ہی اس پارک کو آباد کرنے کا بیڑا اٹھایا انہوں نے پاس بنوائے جو کہ بہت سستے تھے یعنی 200 روپے میں آپ کے گھر کے 15 افراد اس پروگرام کو آگرا نچوائے کر سکتے تھے پروگرام بہت مزے کا تھا۔

جس میں بیجک شو بچوں کے لیے جھولے بڑوں کے لیے ٹال اور سب سے مزے والی بات کے آتش بازی کا میڈی فنکار میوزیکل پروگرام جس میں مایہ ناز فنکاروں نے گانے گائے بہت اچھی کامیڈی کی مائیکل جیکسن ڈانس لڑکوں کی ٹیم نے کیا۔

بہت زبردست وصال بھنگڑا ہوا آپ کو یقین نہیں آئے گا۔

بہت عمو والے انکلوں نے بھنگڑا ڈالا اور اپنی خوشی کا اظہار کیا ریجنرز اور پولیس نے بہت تعاون کیا۔

ہزاروں کا جھوم تھا مگر کوئی بد نظمی نہیں تھی اور میں ان بچوں کو سلام پیش کرتی ہوں ان بڑوں کو سلام پیش کرتی ہوں۔

جنہوں نے اس پارک کے بنانے کے علاوہ محلے کے لوگوں میں خوشیاں پہنچائی ہر چہرہ خوش

سے گلنار تھا ہر بچہ پھولے نہیں سار ہا تھا اس کے علاوہ اس پارک کو ڈھا کہ پارک بھی کہا جاتا ہے اس لیے جن لڑکوں نے کارکردگی میں حصہ لیا ان کو ڈھا کا بوائز کا خطاب دیا گیا۔

میرے ڈھا کا بوائز میرے چھوٹے چھوٹے بھائی ڈھا کا پارک کے نام کی شرت پہنچے اتنے پیارے لگ رہے تھے خدا ان کو نظر بد سے بچائے میری دعا ہے وہ اس پارک کو اور خوبصورت بنائیں۔

انہوں نے یہ معرکہ انجام دے کر پاکستان کی قوم کو سبق دیا ہے کہ ہمیں اپنے ملک کو خود خوبصورت بنانا ہے اپنی مدد خود کرنا ہے جتنی سے رہنا ہے اور میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ اس پارک کا کسی تنظیم یا پارٹی سے کوئی تعلق نہیں اور پروگرام صرف محلے اور ڈھا کا بوائز نے ترتیب دیا اتنی خوبصورت سجاوٹ خوبصورت اسٹیج خدا ہم سب پاکستانی بھائیوں کو اس طرح کام کرنے کی توفیق دے آمین۔

اگر ہم پاکستانی ہونے کا حق ادا کر سکتے ہیں تو ہمیں کچھ اپنے وطن کے لیے کرنا ہے دوسرے ملکوں کے لوگ اپنے وطن سے کس طرح پیار کرتے ہیں۔

اپنی سرزمین کو ماں کا درجہ دیتے ہیں تو ہم ان سے کم نہیں ہم تو ان ماں بہنوں اور بزرگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے اس ملک کے لیے بہت سی قربانیاں دیں جان و مال کے نذرانے دیے ہیں خدا ہمارے ملک کو آباد رکھے۔

سوچی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے پچھلے کچھ سال بہت ہی مشکل تھے خدا وہ دور اب نہ لائے ہمارے ملک کی رونقیں برقرار رکھے۔

☆☆☆☆☆☆

کالے جادو کی بھیا تک دنیا میں ایک خوار سیدہ عامل کی داستان

## عامل کامل

کالی دنیا، جادو، جنات، ٹوٹے ٹوکڑے، سیاہ دل لوگوں کی کالی دنیا، جہاں دو ٹیڑاؤں کو جادو کی بھینٹ چڑھانا، شیطان کو خوش کرنے کا سب سے برا ذریعہ تھا اس دنیا میں ایک دین اور ایمان والے نے کس طرح نکل لی، اور اس نکلنے کے نتیجے میں پیش آنے والے دلچسپ، عبرت ناک، سبق آموز واقعات.....

دین و ایمان کی کشمکش کی داستان

تیسری قسط

پیر شاہ محمد قادری

میں خود بھی حیران تھا کہ نصیب اہل زبان کی طرح اردو بول رہی تھی.....  
 ”ہاں..... اب میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر والد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے: ”میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ مقابلہ ذرا سخت ہوگا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس شیطان کو تم ضرور ختم کر ڈالو گے.....  
 پھر تم باقی معاملات کے سلسلے میں بھی بہت اچھے اور موثر اقدامات کر رہے ہو، میں اب ہر لحاظ سے مطمئن ہوں..... اور اب میری خواہش ہے کہ تم صحرائی وظیفہ بھی جلد از جلد مکمل کر لو.....“  
 ”جی..... میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اس مسئلے سے نکلنے کے بعد میں ادھر کا ہی رخ کروں گا.....“  
 ”اب یہ تو قسمت کی بات ہے کہ تم کب تک وہاں پہنچتے ہو۔“ والد صاحب کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔  
 ”میں سمجھ نہیں پایا جی.....!“  
 ”تم جس راستے پر چل رہے ہو اس میں تمہاری ضرورت کسی کو بھی پیش آنے کی ضرورت نہیں ہے اور تم خود بھی کسی کی ضرورت بن سکتے ہو اس لئے اگر کسی اور مسئلے میں الجھ کر تم جلد وہاں نہ جاسکو تو کوئی مسئلہ نہیں ہے..... اب میں چلتا ہوں.....!“  
 یہ کہہ کر والد صاحب چلے گئے، ان کے جاتے



ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ صبح نمودار ہو چکی ہے اور چاروں طرف اجالا پھیل گیا ہے۔

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ والد صاحب نے خواب ہی کی صورت میں مجھ سے ملاقات کی تھی اور مجھے شاباش دے کر گئے تھے۔

رات کو میرے سامنے آنے والی نصیحاں کی اصلیت نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے مقابل جو جن تھا وہ بے حد چال باز اور عیار تھا۔ اسی لئے مجھے اس کے خلاف محاذ قائم کرنے سے پہلے اچھی طرح ہر چیز کا جائزہ لینا ضروری تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے اور وہ چال باز اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھا لے۔

بہر حال ابھی وہ مرحلہ دور تھا، ابھی تو اس کا دار و مدار بڑے سردار پر تھا، اس کے جتنی فیصلے کے بعد ہی میں کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔

حالانکہ میں اس وعدے کے بغیر بھی اس کی بیوی کا علاج کر سکتا تھا، لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ میرے اس عمل سے ایسی صورت حال بھی سامنے آئے کہ جس کی کوئی افادیت ہو۔ اس کی بیوی جن کا شکار تھی اور وہ خود نہ جانے کتنے انسانوں کو شکار کر رہا تھا۔

اس لئے میری نظر میں یہ لوگ اس جن سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے جن کے خاتمے کیلئے سردار کے گورکھ دھندے کو بھی داؤ پر لگوا دیا تھا۔

میں بستر سے نکل آیا اور پھر اٹھ کر میں نے

خیمے کا پردہ ہٹایا۔ سردار کا ایک آدمی شاید میرے اٹھنے کے ہی انتظار میں باہر موجود تھا۔ وہ فوراً ہی میری طرف لپکا:

”بادشاہ سائیں! آپ اٹھ گئے۔“

”مجھ پر ہوا۔“

”ہاں! آپ اٹھ گئے۔“

”آئیں سائیں! تشریف لے آئیں۔“

”کہاں چلنا ہے بھی!“

”میں نے سر ہلا دیا۔ پھر میں اس کے ساتھ چل پڑا، درختوں کے درمیان سے نکلے ہوئے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک نہر اس طرح رواں تھی کہ اس کے دونوں اطراف میں درختوں اور جھاڑیوں کی قطاریں موجود تھیں۔

درمیان میں نہر کا پانی بہہ رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھتا رہا۔ جلد ہی ایک ایسی جگہ نظر آئی۔ جہاں نہر کے اس جانب والے حصے کو ایک گتے درخت کی شاخوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ آدمی وہیں رک گیا اور مجھ سے یولا۔

”اس نہر کو ہم لوگ بھی استعمال کرتے ہیں اور پرلی طرف کے گاؤں والے بھی اسی نہر پر آتے ہیں۔ اس لئے میں آپ کو آگے سے لے کر آیا ہوں۔“

یہ جگہ نہانے کے کیلئے مناسب ہے۔ آپ کپڑے اتار کر انہی شاخوں پر ٹانگ دیں اور خوب جی بھر کر نہائیں۔ پھر مجھے آواز دے دیجئے گا، میرا نام بیدل ہے۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”جن کی طرح! میں نے بے ساختہ پوچھا۔“

”نہیں جی۔۔۔۔۔ اس نے نفی میں سر ہلایا:

”آپ سردار کی کا علاج کرنے آئے ہو۔ آپ کے سامنے جن کی طرح حاضر ہو کر مجھے اپنی شامت بلانی ہے۔! میں ادھر ہی ہوں آپ کے پیچھے۔“

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ پھر میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اپنے کپڑے اتارے اور نہر میں کود پڑا۔

ٹھنڈے اور فرحت بخش پانی نے گویا میری روح کو بھی ٹھنڈک عطا کر دی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ باہر ہی نہ نکلوں، لیکن چونکہ کسی کے آجانے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔ اس لئے میں تھوڑی دیر بعد ہی باہر نکل آیا۔

کپڑے پہننے کے دوران نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن کوئی اٹھائی نہ دیا۔

پھر اس احساس کو اپنا وہم سمجھ کر میں نے نظر انداز کر دیا۔ اب ذرا ذرا سی باتوں پر تو اپنے منوں کو حاضر کرنا بھی اچھی بات نہیں تھی اور ایسے بھی یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے کپڑے بدلنے کے بعد بیدل کو آواز دی، وہ درخت کے عقب میں ہی بیٹھا ہوا تھا، اس لئے نورانی میری طرف لپکا۔

”جی سائیں! آپ تیار ہو گئے۔!“

”ہاں! چلو۔۔۔۔۔!“ میں نے سر ہلایا۔

پھر ہمارا وہاں ہی کا سفر شروع ہوا۔ ہم کنارے کنارے ہی چل رہے تھے۔ دفعتاً گھوڑے پر سوار ایک چمپل سی لڑکی نہر کے دوسری طرف سے گزری۔ وہ کافی غور سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کے جسم پر قبائلی لباس تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خاص طور پر میری طرف متوجہ تھی۔ پھر اس نے اپنے گھوڑے کو اڑنے لگائی اور ہم سے آگے نکلنے کے بعد نگاہوں سے اوچھل ہو گئی۔ میں نے بیدل کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔

”یہ کون تھی بیدل! اور یہ تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے۔۔۔۔۔؟“

”یہ گلابی اندھی تھی بادشاہ سائیں!۔۔۔۔۔!“ اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا: ”اسی کو دیکھ کر میرا یہ حال ہوا ہے۔“

”لیکن کیوں۔۔۔۔۔؟ وہ تو ایک لڑکی تھی بیدل!۔۔۔۔۔!“

”ہاں!۔۔۔۔۔ وہ لڑکی ہی نظر آ رہی تھی، لیکن یہ ایسی ہے کہ اگر درخت کی طرف انگلی اٹھا دے تو وہ جل کر راکھ ہو جائے، نہر کی طرف اشارہ کرے تو نہر سوکھ جائے۔۔۔۔۔“

”کیا کہہ رہے ہو یار!۔۔۔۔۔!“ میں ہنسا: ”کیا یہ کوئی جادو کرتی ہے؟“

”اس سے بھی بڑھ کر ہے بادشاہ سائیں!۔۔۔۔۔!“ اس سے ڈر رہیں لگتا۔ بلکہ اس کے دماغ کے فتور سے سب کو ڈر لگتا ہے، اگر یہ ابھی جا کر اپنے گاؤں والوں سے شکایت کر دے کہ یہ



دونوں آدمی مجھے چھیڑ رہے تھے تو ہمارا خمیوں تک پہنچنا ناممکن ہے۔“

”ارے.....!“

”ہاں بادشاہ سائیں.....!“ یہ سارے کا سارا گاؤں ہی وحشی درندوں کا گڑھ ہے اور اس کا ڈیرا..... اف..... اللہ کی پناہ.....

یہ ڈیرے کی چیٹی مٹی ہے..... گلاب نام ہے اس کا.....!“

”یہ تارم ڈاکو ہو کر ان لوگوں سے ڈر رہے ہو؟“

”بادشاہ سائیں.....! میری کیا اوقات ہے..... قبیلے کا کوئی بھی آدمی ان سے نہیں الجھتا“ حتیٰ کہ بڑے سردار بھی اس گاؤں والوں سے گریز ہی کرتے ہیں.....!“

”اوہ.....“ میرے منہ سے نکلا۔

تھوڑی دیر بعد ہماری واپسی ہو گئی تھی۔ مجھے سردار کے خیمے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ جو واقعی میرا منتظر تھا، پھر جلد ہی ناشتہ آ گیا جس میں پیری روٹی، پراٹھے، لسی اور دیسی مکھن شامل تھا..... چنانچہ میں نے سیر ہو کر اس مزیدار ناشتے کو نمٹایا۔ اس وقت سردار کچھ خاموش خاموش سا تھا، میں نے بھی اپنے طور پر اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا، ظاہر ہے کہ میری حیثیت اپنی جگہ، لیکن وہ بھی تو سردار تھا.....

مجھے درشت انداز میں جھک سکتا تھا، نہ جانے کس بات پر اس کا موڈ خراب تھا اس لئے چپ رہنا ہی بہتر تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اس علاقے میں ایک افراتفری سی مچ گئی۔ سردار کو اہم اعلان کرنا تھا۔ اسی بناء پر قبیلے کے تمام لوگ ایک مخصوص جگہ جمع ہو رہے تھے۔

پھر جب میں سردار کے ہمراہ وہاں پہنچا تو اس بڑے ہجوم میں چھوٹے سردار اور اس کے باقی ساتھیوں کو بھی وہاں موجود پایا، وہ بری طرح رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے اور انہیں ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اسی وقت سردار آگے بڑھا اور بلند آواز سے بولا:

”میرے قبیلے کے تمام باسیو.....! میں آج ایک اہم اعلان کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میں اب اس پیشے کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔ آج انجھی اور اسی وقت اپنے لئے کوئی اور سردار منتخب کر لو..... وہی سردار ان باغیوں کیلئے بھی فیصلہ سنائے گا۔ کیونکہ اب سزا یا معافی کا اختیار میرے ہاتھ میں نہیں ہے.....

جمع پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ ہر کوئی سردار کا منہ تک رہا تھا، خود چھوٹے سردار وغیرہ بھی حیران تھے کہ یہ اچانک ہی کون سی کاپالٹ گئی۔ پھر اس سکوت کو ایک بوڑھے آدمی نے توڑا تھا: ”لیکن سردار.....! اس فیصلے کی وجہ کیا ہے؟ آپ اچانک ہی ہمیں کیوں چھوڑنا چاہتے ہو.....؟“

”میرا پیشہ نصیبیاں کے علاج میں رکاوٹ بن رہا ہے۔“ سردار نے صاف کہا: ”اور وہ مجھے بے حد عزیز ہے..... میں لوٹ مار کر کے اور دوسروں کے گھر برباد کر کے اپنا گھر کیسے آباد کر سکتا ہوں.....! بس اسی لئے قبیلے کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔“

”لیکن سردار..... وہ تو ہمیں بھی عزیز ہیں۔“ کسی اور نے کہا۔

”اور ہمیں آپ ہی کی سربراہی پسند ہے“ ہمیں یہ گوارا نہیں ہوگا کہ کوئی اور ہم پر حکم

چلائے..... ہاں.....!“

ایک شور مچ گیا، سب ہی اس آواز کی تائید میں تھے، لیکن اس وقت سردار بھی ایک الگ ہی موڈ میں تھا، وہ ان لوگوں کی اس پر جوش کیفیت سے قطعی متاثر نہیں ہوا تھا، وہ پھر بولا۔

”میں اب اس پیشے سے الگ ہو رہا ہوں..... اور اب کوئی مجھے سردار نہیں بولے.....“ ”اگر آپ نے یہ پیشہ چھوڑ دیا، تو ہم بھی آج سے اس پیشے کو خیر باد کہتے ہیں۔“ ایک پر جوش آواز گونجی۔

”لیکن ہمارے سردار آپ ہی ہونگے۔“ ”لیکن پھر میں کسی بات کی سرداری کروں گا.....؟“ سردار کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”ہم لوگ کبھی باڑی کریں گے.....!“ کہا گیا۔

”یہ سینکڑوں مربع میل زمین بخر حالت میں پڑی ہے۔ ہم اسے زرخیز بنائیں گے اور اس میں اناج اگائیں گے.....“ منٹکی کا نہیں گے اور اس وقت بھی آپ ہی ہمارے سردار ہونگے.....“ ”سردار.....! زمیندار.....! زندہ باد.....!“

شور سا گونج اٹھا۔ سردار کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آ گئے۔ اس نے اپنی جیب سے ایک بڑا سا کپڑا نکالا اور چہرہ صاف کرنے لگا۔ پھر وہاں رکا نہیں تھا..... اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

”ان قیدیوں کا کیا کریں سردار.....!“ کسی نے چیخ کر پوچھا تھا۔

”آزاد کر دو.....“ جواب ملا: ”پھر یہ جہاں جائیں ان کی مرضی، اب تو ہمارے راستے ہی بدل گئے ہیں۔“

سردار نے رک کر جواب دیا۔

قیدیوں کو کھول دیا گیا۔ چھوٹے سردار کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر سردار کے آگے ہاتھ جھوڑ دیئے: ”ہمیں معاف کر دو سردار.....! اور اپنے ساتھ ہی رکھو.....! وقتی طور پر میرے دل میں سرداری کے منصب کا لالچ آ گیا تھا۔

لیکن آپ کے اس فیصلے کے بعد میں بھی اپنی خدمات ان کھیتوں کیلئے پیش کرتا ہوں، جو جلد ہی اس بخر زمین پر لہرائیں گے..... میں نے بھی آج سے آپ کے نقش قدم کو اپنا لیا ہے..... ہم اب یہاں اپنا ایک نیا گاؤں آباد کریں گے، جس میں ہم آنے جانے والی مسافریوں کے مسافروں کی مہمان نوازی کریں گے..... ان کیلئے اپنی خدمتیں وقف کر دیں گے.....“

چھوٹے سردار کی باتوں نے ایک بار پھر مجمع کو شور مچانے پر مجبور کر دیا۔ بڑے سردار نے مسکرا کر اسے گلے لگایا اور اس کی کمرچسپی۔

اس وقت میرے دل کا حال عجیب تھا، جو خوشی اور طمانیت مجھے حاصل ہو رہی تھی، اس کے بارے میں اندازہ کرنا بھی بے حد مشکل کام تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا..... اور اب مجھے اس کہانی کے بنیادی کردار کا مسئلہ حل کرنا تھا۔ میرا مطلب نصیبیاں سے تھا، اگر وہ درمیان میں نہ ہوتی تو شاید آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

اس میں بھی قدرت کی مصلحت پوشیدہ تھی۔ آج نصیبیاں کی بیماری نے کتنے لوگوں کو روحانی صحت سے نوازا تھا..... سب کی کاپیا ہی پلٹ گئی تھی۔

اب مجھے پوری تندرستی اور توجہ سے نصیبیاں کا

علاج کرنا تھا۔ چنانچہ میں سردار کو اس کے نیچے تک رخصت کرنے کے بعد اپنی ”جائے پناہ“ میں آ گیا۔ سامنے ہی میرا منگوا ہوا سامان بھی موجود تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے اپنے گرد حفاظتی وظیفہ کا حصار کھینچا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ابھی مجھے صرف تیاری کرنا تھی، پڑھائی کیلئے ابھی کافی وقت بڑا تھا۔ یوں کہنا چاہئے کہ پہلے مرحلے میں تیاری تھی اور دوسرے مرحلے میں پڑھائی اور اس وقت میں ابتدائی مرحلے سے گزر رہا تھا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ سردار کی آواز میرے کانوں سے نکل گئی:

”بادشاہ سائیں! کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔“

”جی سردار! آ جائیں! میں نے ہانک لگائی۔“

وہ مسکراتا ہوا اندر آیا اور میرے سامنے ہی آلتی پالتی مارکر بیٹھ گیا:

”آپ مجھے بادشاہ مت بولا کریں سردار! میں نے اسے مخاطب کیا: ”میرا نام“

”سلمان ہے۔“

”اچھا تو آپ بھی مجھے سردار مت کہا کرو۔“ وہ اس وقت بڑے مزے کے موڈ میں تھا: ”میرا نام بیکل ہے۔“

”بھئی آپ تو سردار ہونا۔!“ میں نے صفائی پیش کی: ”یہ تو آپ کا منصب ہے۔“

”تو پھر آپ بھی تو بادشاہ ہو۔!“ وہ بھلا کب چوکنے والا تھا: ”یہاں بھی آپ نے اپنے جاہ و جلال سے سب کی کاپی لٹ دی۔“

”یہ سب اوپر والے کا کام ہے۔“ میں نے

جواب دیا: ”میں تو بس ایک مہرہ ہوں۔“

”سلمان سائیں! آپ کا یہ احسان ساری زندگی یاد رہے گا۔ میں نے جب سے عہدہ کیا ہے میرا دل بے حد سکون میں ہے۔“

”نیکی کے راستے کا یہی دنیاوی فائدہ ہے۔“ میں نے کہا: ”اس میں سب سے پہلے دل اور دماغ کو ہی فرحت ملتی ہے۔ اور جب بندہ پوری طرح اس راستے پر چل نکلتا ہے تو اس کیلئے مزید راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔“

”ہاں! سائیں! یہ تو ٹھیک ہے، میرا پورا قبیلہ ہی خوشیاں منارہا ہے۔ سب ہی میرے اس فیصلے سے خوش ہیں۔“

”بہت اچھی بات ہے سردار! اور ہاں! آج شام کو سورج ڈھلتے ہی آپ اپنی بیگم کو کسی کھلی جگہ میں پہنچا دینا۔ مجھے وہاں پر اپنے سامان کا بھی استعمال کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے بادشاہ سائیں! جو آپ حکم کریں گے وہی ہوگا۔!“

”آپ نے پھر بادشاہ کہا۔!“ میں نے اسے گھورا، وہ گڑبڑا گیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ معاف کرنا سلمان سائیں! کیا کروں اب تو زبان پر ہی چڑھ گیا ہے۔ خیر کوشش کروں گا کہ آپ کو نام سے ہی مخاطب کروں۔“

پھر وہ چلا گیا تھا، اس سے دوسری ملاقات دوپہر کے کھانے پر ہوئی تھی، لیکن اس وقت کوئی قابل ذکر بات نہ ہو سکی۔ شام کے وقت میں پوری طرح تیار تھا۔ نصیباً کو ایک کھلی جگہ پر پہنچا دیا گیا تھا اور قبیلے کے لوگوں نے ہمارے گرد ایک دائرے کی شکل بنالی تھی۔ میں نے ان لوگوں کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

ایک بڑی سی دری بچھائی گئی تھی، جس پر سے سامنے نصیباً آلتی پالتی مارکر بیٹھی ہوئی تھی اس کو دیکھتے ہی رات والا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا تھا۔

جسے پھر فوراً ہی میں نے اپنے ذہن سے جھٹکا تھا، وہ نصیباً تھی ہی کب۔۔۔۔۔! جو میرا ذہن مجھے انسان کی کوشش کر رہا تھا اور میرے خیالات اکندہ ہو رہے تھے، خود اس کی آنکھوں میں بھی

لئے واجبی سی شاسائی تھی۔۔۔۔۔ بہر حال میں نے گزشتہ رات کے واقعے کو اپنے ذہن سے اٹالنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کیلئے میں نے نوک اپنے کام میں مشغول کر لیا۔ میں نے ایک

لونے میں آگ بھی لگوا دی تھی۔ پھر جب آگ مروج پر آئی تو میں نے اپنے تیار کئے ہوئے

امان میں سے ایک کپڑے کی پوٹلی نکالی اور اسے پیرے کی طرح نصیباً کے جسم پر گھما کر آگ میں جھونک دیا۔

جیسے ہی پوٹلی نے آگ پکڑی، نصیباً کے بدن میں رعشہ طاری ہونے لگا۔ اس وقت میں

نوک اپنے وجود کو بھی کافی بھاری محسوس کر رہا تھا، پھر میں نے دوسری پوٹلی نکالی اور اپنا عمل دہرایا۔

امان نصیباً کے خدو خال بدلنے لگے۔ اور اس کا رنگ بھی سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ پھر دیکھنے والوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ کیونکہ اب

نصیباً کی جگہ کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی ہیئت انتہائی بھیاں تک تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی، گول اور انتہائی سرخ تھیں جبکہ ناک پھول کے بے حد

دلی اور بھدی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ہی تیسری اور آخری پڑیا نکالی۔

لیکن اسے گھمانا بے حد مشکل ثابت ہوا، کیونکہ اب اس وجود کا ایک جگہ ٹکنا مشکل ہو رہا تھا اور اس

کے کھلے ہوئے منہ سے بے حد کربہ آوازیں نکل رہی تھیں۔ تیسری پڑیا کے جلتے ہی اس کے

چہرے پر بے پناہ تکلیف کے آثار نمودار ہو گئے، پھر وہ زمین پر دہرا ہوا کر اپنا سر پٹکنے لگا، اس کے

حلق سے برآمد ہونے والی آوازوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور پھر جلد ہی یہ آوازیں معدوم ہو

گئیں اور اس کا جسم بھی بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے اٹھ کر اسے سیدھا کیا تو نصیباً اپنی اصلی

شکل میں سامنے موجود تھی اور بے ہوش تھی۔ اس کے سینے کا زیروہم چغلی کر رہا تھا کہ وہ بہت

گہری سانسیں لے رہی ہے۔ میرا پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ یوں جیسے میں نے

کوئی پہاڑ توڑا ہوا اور درحقیقت دیکھا جائے تو مجھے اس سے کم محنت نہیں لگی تھی۔ اس کالی مانتا کے

پجاری کو سامنے لا کر جلاتا کوئی آسان کام نہیں تھا اور اس کا نتیجہ مجھے اپنی اندرونی کیفیت سے ہی

محسوس ہو رہا تھا۔ جو مادرائی مخلوقات بات چیت کرتی ہیں، ان سے غمنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

لیکن یہ پجاری ان میں سے نہیں تھا۔ لہذا اسے جلا کر بھسم کرنا ہی اس کا حل تھا، ورنہ دوسری صورت

میں وہ خود میرے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم

میں جان ہی نہ ہو۔ بہر حال میں نے سردار سے کہا:

”لیجئے سردار! میں نے بھی اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ آپ کی بیوی اب اس آسیب سے آزاد

ہو چکی ہے، انہیں آپ خیمے میں پہنچا دیجئے، اب یہ صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گی۔ اور اب

میں بھی آرام کروں گا۔ ہاں!۔۔۔۔۔!“

عوام کے اس دائرے میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ میری آواز نے ہی شاید اس سکوت کو

توڑا تھا۔ پھر میں سردار کے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے خیے کی طرف چل دیا۔ میری ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ پھر میں چند قدم چلنے کے بعد خود بھی لہر لہر کر رہا ہوں ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی، میرے سامنے سردار ایک کرسی پر بیٹھا ہوا دکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھا تو میری آنکھ سے اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

”اوہ..... شکر ہے..... بادشاہ سائیں کو ہوش آ گیا۔“

میں مسکرا دیا، پھر میں نے کہا: ”پتی بیگم کے پاس بیٹھنے کے بجائے تم میرے پاس بیٹھے ہو۔“

”ہاں بادشاہ سائیں.....!“ اس نے سر ہلایا: ”وہ بھی سو رہی ہے۔ اتنے سالوں بعد میں نے اسے پہلی مرتبہ رات میں سوتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”اوہ..... اچھا.....!“

”ہاں سائیں..... تمہاری تو جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ تمہارے برکتی قدم جب سے یہاں آئے ہیں، ہم لوگوں کی قسمت ہی بدل گئی ہے۔ کیا بات ہے تمہاری..... اوہ.....!“

”بس یہ سب دعاؤں کا نتیجہ ہے سردار.....“ ”دعائیں تو میری بھی بہت ہیں تمہارے لئے..... اور جس طرح تم نے کل اس بلا مقابلہ کیا ہے، وہ منظر تو میں کبھی زندگی میں نہیں بھلا سکوں گا..... واقعی تم ایک باکمال اور طاقتور انسان ہو۔“

”اب میری اتنی تعریفیں مت کرو سردار میں مسکرایا: ”ایسا نہ ہو کہ میں تمہارے سر پر ہی جاؤں۔“

”میرا دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ تمہیں سر پر بٹھالوں..... بس نہیں چل رہا میرا۔“

”ایسا بس چلنا بھی نہیں کہ میں بے بس جاؤں۔ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں۔ تم ذرا اپنی ٹیکہ خبر لو۔“

”اچھا بادشاہ سائیں.....!“

”پھر وہی.....“ میں نے آنکھیں نکالیں اس نے مسکراتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا اور باہر نکل گیا۔ میرا کام اب یہاں ختم ہو چکا تھا چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ آج ہی اپنے سفر پر روا ہو جاؤں اور سلسلہ وہیں سے جوڑوں کہ جہاں سے تانے بانے ٹوٹے تھے۔ آخر مجھے اپنا وظیفہ مکمل کرنا تھا۔

میں نے دوسرا لباس نکالا اور پھر تہائی نہر کی طرف چل پڑا۔ بیدل نے مجھے راستہ تو دکھائی دیا تھا۔ چنانچہ میں نے اکیلے ہی وہاں جانے کی ٹھانی تھی۔ پھر اسی نہر کے کنارے چلتا ہوا میں اسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں گزشتہ دن بھی نہایا تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ مجھے اس پانی میں نہا۔ کانشہ سا ہو گیا تھا اور نصیباں کے کہیں کے بعد ویسے بھی میری کیفیت اتنی بوجھل ہو گئی تھی کہ راستہ گزرنے کے باوجود بھی میرے اندر کسمند کی موجودگی تھی۔ اس لئے نہر کا پانی میرے لئے اس وقت اور بھی موزوں تھا۔ یہاں آج بھی سناٹا تھا۔ میں نے عادتاً چاروں طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اپنا لباس اتارا اور نہر میں اتر گیا..... اف! کتنا سکون! میرا آیتھا مجھے اسے بیان کرنا میرے لئے بے حد مشکل ہے۔

چند منٹ تک میں اسی کیفیت میں رہا۔ پانی اب بھی پھر مجھے وہی احساس ہوا جو کل بھی مجھے بیان کر رہا تھا۔ کوئی مجھے دیکھ رہا تھا؟ ہاں..... یہ اتنا اٹل تھی کہ آج بھی مجھے دیکھا جا رہا تھا۔

پرنڈوں کی تردنا تازہ ہچکاہٹ سے فضا میں مسمی موسیقی کا روہم آ رہا تھا۔ عین اسی وقت آبی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی: ”ٹھائیں.....!“

کسی پرنڈے کی چیخ گونجی اور پھر وہ آواز مددوم ہو گئی۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنا کسی درخت سے کوئی دھمکے کودا تھا۔ چونکہ اتنا تھا اس لئے یہ آواز بھی گونجی ویسے مجھے یقین تھا کہ یہاں کوئی شکاری موجود ہے جس نے کسی پرنڈے کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا ہے۔ بہر حال میں اپنے ”کام“ میں مصروف رہا۔

عین اسی وقت درختوں کے پتوں میں پانی خلاء نمودار ہوا اور ایک حسین لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ یہ وہی تھی جو گزشتہ روز گھوڑے پر سوار تھی۔ ہمارے قریب سے گزری تھی اور اس کے بارے میں مجھے بیدل نے ایک عجیب سی کہانی بتائی تھی۔

”اے سنو.....! مجھے تیز اٹھا کر لا دو..... اوہ.....“ اس طرف پڑا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

میں بری طرح سمٹ گیا۔ ظاہر ہے کہ میں اس وقت کپڑوں سے بے نیاز تھا اور نہر کا شفاف پانی میرا وجود چھپانے کیلئے ناکافی تھا۔

”سنائیں تم نے.....!“ اب کی بار وہ حقاً بولی: ”جلدی سے باہر نکلو.....!“

”مس صاحبہ.....!“ میں نے بھی انداز نیکیا کر لیا: ”کیا آپ کی نظریں کمزور ہیں؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ وہ شعلہ بار ہو گئی: ”اور تم نے یہ مجھے کیا بولا.....؟“

”مس صاحبہ.....!“ میں نے دہرایا۔ ”یہ کیا نام ہوا.....! کیا تم مجھے جانتے نہیں ہو.....؟“

”پاکل نہیں.....“

”ہوں..... کیا تم اس علاقے کے نہیں ہو.....؟ مجھ سے تو بچہ بچہ واقف ہے۔“

”یقیناً ہوگا“ لیکن میں اس سعادت سے محروم ہوں۔ کیونکہ میں پردیسی ہوں۔“

”ہاں..... مجھے اندازہ ہے.....“ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر چونکی: ”کیا تم بہرے ہو! ہاں ہر نکلو اور میرا تیز اٹھاؤ۔“

”میرا نام سلمان ہے۔ کیا میں آپ کو دوبار مس صاحبہ کہوں!“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے زور سے گردن ہلائی: ”میں شہزادی گلنار ہوں.....“

”اچھا تو شہزادی.....!“ میں آرام سے بات کر رہا تھا: ”میری حالت آپ اس وقت دیکھ رہی ہیں۔ میں ابھی کیسے نکل سکتا ہوں..... آپ پردہ کریں گی تو میں باہر آ کر کپڑے پہنوں گا.....!“

”اوہ.....“ ایک بیک اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی اور فوراً ہی درختوں کے پتے برابر ہو گئے۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور باہر نکل آیا۔ عجیب قسم کی لڑکی تھی وہ..... اس کا مطلب یہ تھا کہ بیدل نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا، لیکن پاگل پن، لنگی پن اور وحشی پن میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ لڑکی پاگل یا لنگی تو ہو سکتی تھی، لیکن ہرگز نہیں تھی۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور اپنے



پرانے کپڑے کا پونٹا اٹھالیا۔ عین اسی وقت لڑکی کی آواز آئی:

”تیار ہو گئے.....!“

”جی شہزادی.....“ میں نے نعرہ لگایا۔ پتوں میں پھر خلا نمودار ہو گیا:

”ٹھیک ہے..... ادھر آ جاؤ.....“

میں جب اس کی بتائی ہوئی سمت سے آگے بڑھا:

”نہر میں کود کر اب ادھر آ جاؤ.....!“ دوسرا حکم جاری ہوا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

”کیا.....؟ تم رکے کیوں.....!“

”میرے کپڑے گیلے ہو جائیں گے.....“ تو میں اس وقت جو کہہ رہی تھی غلط تھا؟ وہ

انس کر بولی اور میری کھوپڑی ناچ اٹھی۔ یہ تو کافی تیز رفتار لڑکی تھی۔

بہر حال میں نے اپنے کپڑوں کو سمیٹا اور نہر میں سے ہوتا ہوا آہستہ آہستہ چل کر دوسری طرف

اتر آیا۔ اب وہ لڑکی میرے سامنے موجود تھی۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی اور قریب ہی ایک

درخت کے تنے سے اس کا گھوڑا بھی بندھا ہوا تھا۔ وہ مجھے کافی غور سے دیکھ رہی تھی، اس کی

آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔

”جی..... اب بتائیں..... کہاں ہے وہ تیتز.....؟“ میں نے پوچھا۔

”جیل کے پیٹ میں.....!“

”ہاں..... تم جب اس طرف آ رہے تھے تو جیل نے جھپٹا مارا اور اسے اٹھا لے گئی۔“

”اوہ..... آپ دوسرا شکار کر لیں.....!“

”نہیں..... مجھے وہی کھانا تھا۔“ اس نے منہ پھلایا۔

”تو پھر آپ جیل سے رابطہ کریں۔“

”جواب دیا: ”میں جا رہا ہوں۔“

”اے سنو.....!“ وہ آگے بڑھی: ”کہاں رہے ہو؟“

”جہاں سے آیا تھا۔“

”میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں.....“

”نے کل ہی تمہیں دیکھا ہے..... اور تم مجھے بہت اچھے لگے ہو..... ادھر آؤ مجھ سے باتیں کرو.....“

اس نے بڑی لگاؤ سے کہا تھا۔

”معاف کرنا شہزادی.....!“ میرا لہجہ خشک تھا: ”میرے پاس فالو وقت نہیں ہوتا..... بہت سے کام کرنے ہیں مجھے.....!“

گنار کا چہرہ واقعی گنار ہو گیا، اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نمودار ہوئے، اس نے اپنی رائفل واپس پھینکی اور پاؤں پختی ہوئی اسے

گھوڑے کی طرف لپکی۔ میں نے اس پر قطعی تو

نہیں دی اور نہر کے راستے واپس اپنے علاقے میں آ گیا۔ اپنے علاقے سے مراد سردار

علاقہ.....!

اس کا گھوڑا میرے سامنے سے ہی بگٹ بگٹ

تھا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں اس سے بے نیاز ہو کر اپنے راستے پر قدم اٹھا رہا تھا، ابھی

تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ مجھے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے

وہ تعداد میں کئی ہوں اور پھر جیسے ہی میں درختوں کے درمیان سے نکلنے لگا، ایک کڑک دار آواز

میرے کانوں سے ٹکرائی:

”رک جاؤ.....!“

میں واقعی ٹھٹک کر رک گیا۔ دائیں جانب سے پانچ گھڑ سوار برآمد ہوئے، ان میں سے آگے

گنار ہی تھی، باقی چاروں جوان مرد تھے۔ ان کی

لذت و قناعت کافی اچھی تھی۔ البتہ ان کے ہونٹوں

لے اور موجود سوئی موٹی مونچھیں الگ سے ہی

ملی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے خوں خوار

انٹروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ مزید میرے قریب آ گئے:

”تم کون ہو.....! اور تم نے ہماری بہن کو کیوں چھیڑا.....!“

”میں نے چھیڑا ہے.....!“ میں چونکا: ”یہ تم

ایا کہہ رہے ہو.....!“

”ہماری بہن نے ہمیں بتایا ہے۔“ وہی

۱۱۔

”میں نے کوئی چھیڑ چھا نہیں کی.....“

”تو کیا ہماری بہن جھوٹ بول رہی ہے!“

”ہاں.....“

”تو اس مت کرو.....“ وہ پھر کر دھاڑا:

”جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟“

مجھے بھی تاؤ آ گیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ان

بہن کے بھائیوں کو مڑا چکھا دوں۔ لیکن میں ضبط

رک گیا۔ جب مجھے دنیا میں نکل کر مظلوموں کی مدد

کرنا تھی۔ تو یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ طرح طرح

لے لوگوں سے میرا واسطہ پڑنا لازمی تھا اور ان کی

بق اور ناحق باتوں کو برداشت کرنا تھا۔ چنانچہ

نہنکوں بعد میں نے کہا:

”میں کیا جانوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور

اس سے کہہ رہا ہوں۔ میں تو یہاں اچھی ہوں،

پر دیکھی ہوں.....“

”اوہ..... تم پر دیکھی ہو.....؟“ وہ لوگ

نکلے اور پھر انہوں نے عجیب سے انداز میں

گنار کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس وقت

گنار نے اپنی ایک بے ساختہ مسکراہٹ کا گلہ کھوٹا

۱۲۔ میں کچھ کچھ نہیں سکا تھا۔

”ہاں.....“

”یہاں کس لئے آئے ہو.....!“

”میں مسافر ہوں۔ حادثاتی طور پر یہاں

پہنچا ہوں۔“ میں نے گول مول جواب دیا: ”چند

روز کیلئے مجھے ان خیمے والوں نے اپنے پاس ٹھہرایا

ہے..... میں شاید کل روانہ ہو جاؤں گا۔“

”کیا!! تم ان چوروں کے یہاں ٹھہرے

ہو!“ ایک نے چونک کر کہا۔

”ہاں.....!“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی چور ڈکیت

ہو.....!“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں نے کہا نا کہ

میں مسافر ہوں.....“

”اچھا.....“ ایک نے سر ہلایا: ”بس یہیں پر

تمہاری قسمت یاد رہی کر گئی۔ ورنہ اب تک تمہاری

لاش کو چیل اور کوئے نوچ رہے ہوتے.....!“

”میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے؟“

میرے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہماری بہن کو بری نظر سے دیکھنا بہت بڑا

جرم ہے..... ہم لوگ اب تک نہ جانے کتنے

لوگوں کو اسی پکڑ میں موت کے گھاٹ اتار چکے

ہیں.....“

”اوہ.....“ میرے منہ سے نکلا۔ تو بیدل

سے جی ہی کہا تھا۔

”اب چونکہ تم پر دیکھی ہو اس لئے ہم

تمہیں قید میں ڈالیں گے.....“ وہی بولا تھا: ”چلو

ہمارے ساتھ.....!“

”کہاں.....!“

”ہمارے گوتھ..... چلو..... بیٹھ جاؤ.....“

میں نے چند لمحے سوچا، پھر میں نے اپنے

موتلوں سے مشورہ لیا۔ جواب حیرت انگیز تھا۔

مجھے ان کے ساتھ بیٹھ جانے کا اشارہ ملا تھا۔  
 ”کیا سوچ رہے ہو؟“ ایک نے ہنس کر پوچھا۔  
 ”کیا بھاگنے کا ارادہ ہے؟“  
 ”یہی سمجھ لو..... کیونکہ میرے پاس گھوڑا ہے اور نہ رائفل.....!“  
 ”حاضر جواب بھی ہو.....“ اس نے آنکھیں نکالیں۔  
 ”چلو..... جلدی آؤ.....!“  
 میں جھٹ سے گنار کے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اس آدمی نے فوراً ہی مجھے ٹوکا:  
 ”اے..... ادھر آؤ.....!“ وہ مجھے بری طرح گھور رہا تھا۔

”اوہ..... اچھا.....!“ میں جیسے چونکا، گنار نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔  
 پھر میں اس کے بھائی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچیں اور ان کے رخ تھما دیے۔ جلد ہی وہ مناسب رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ آگے جا کر یہ نہر کافی چھوٹی ہو گئی تھی، وہیں سے اسے گراس کرنے کے بعد گھوڑے واپس ہوئے اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

یہاں بھی گھنے درختوں کا سلسلہ موجود تھا۔ ایک جنگل نما علاقے سے گزرنے کے بعد آبادی کے آثار دکھائی دیئے۔ جہاں کافی تعداد میں مکانات بنے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک چھوٹا سا شہر آباد ہے کچھ مکانات کچے تھے اور کچھ لال اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ یہاں لوگوں کی بھی کافی آمد و رفت تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان لوگوں پر نظر پڑتے ہی لوگ مرغوب انداز میں سلام کر رہے تھے اور بعض ان سے خوف زدہ بھی تھے۔

ایک بڑے سے مکان کے سامنے وہ لوگ

رک گئے اور انہوں نے مجھے بھی اترنے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک بھائی گنار سے مخاطب ہوا:  
 ”جاؤ تم..... گھر میں جاؤ.....!“  
 ”میں واپس جا رہی ہوں.....“ وہ ہنسنے لگی۔  
 ”تیز شکار کرے لاؤں گی.....!“  
 ”کل چلی جانا.....“ اس کا انداز نرم تھا۔  
 ”آج گھر میں رکھے ہوئے تیز سے گزارا کر لوں.....“  
 ”نہیں.....“ اس نے منہ بنایا: ”وہ ہمارا ہے.....!“

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور وہاں سے چلی گئی۔ یہ لڑکی میری سمجھ سے باہر تھی۔ یوں اس کے بھائی بھی کچھ کم نہیں تھے۔ بہر حال اب ان لوگوں سے پالا پڑ ہی گیا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ان کے کئی خادم بھی تھے، جو فوراً ہی آئے لپکے تھے اور انہوں نے گھوڑوں کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے لی تھیں۔ ان کا رخ شاید اسی طرف تھا۔

یہ لوگ مجھے اندر لے آئے، فوراً ہی دو اسلحہ بردار آگے بڑھے:

”اے بند کر دو..... پردہ ہی ہے، کھا پینے کا خیال رکھنا.....!“

”تا بعداد ہیں جی.....! انہوں نے سر کو خم کر دیا اور پھر کسی قدر کرخ انداز میں میری طرف دیکھ کر بولے: ”چلو.....“

فی الحال میرے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ میں ان کے ہمراہ چل پڑا۔ یہ مکان حویلی کی طرح پر بنا ہوا تھا۔ دالان سے گزرنے کے بعد ہم ایک بڑے سے برآمدے میں داخل ہوئے۔ جہاں ایک قطار میں ترتیب سے کمرے بنے ہوئے تھے۔

کمرے کے دروازے کے ساتھ ایک

دالان والی کھڑکی موجود تھی اور کمرے میں پلنگ بھی تھا۔ ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

”ایک کمرے کا دروازہ کھولا گیا اور پھر مجھے داخل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ ایک پہرے والے نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا:

”اب تم یہاں آرام کرو..... بھوک لگے تو آواز دے دینا.....!“

”کچھ اور لگے تو.....!“ میں نے جھٹ سے کہا۔

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا:

”اس کونے میں جو دروازہ ہے، وہ کچھ اور آگے.....!“

”ٹھیک ہے..... اور مجھے اب بھوک بھی لگ رہی ہے.....“ میں نے سر ملایا۔

”تھوڑا صبر تو کرو.....“ وہ بولا: ”ابھی تو آنا ہو.....“

”ابھی آیا ہوں تو کیا ہوا“ میں رات سے بھوکا تھا۔

”ٹھیک ہے..... ہم انتظام کرتے ہیں.....“ اس نے کہا اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔

میں نے دائیں طرف موجود دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندر واقعی ہاتھ روم موجود تھا اور کافی

ساتھ تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ چھت میں باقاعدہ پنکھا بھی موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس چھوٹے گاؤں میں

میرے پاس اب فی الحال کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ آنے کا اشارہ کیوں ملا تھا، میں

انہوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان اس طرف بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میں اس وقت ان انجان اور عجیب قسم کے لوگوں کی قید میں تھا..... کہاں وہ سردار کا قبیلہ اور کہاں یہ لوگ.....!

لیکن مجھے اس وقت بھی مصلحت پسندی سے کام لینا تھا اور خود کو حالات کے دھار سے پر چھوڑنا تھا۔ پھر دیکھنا تھا کہ قسمت کیا گل کھلائی ہے۔ مجھے اس وقت سردار چل وغیرہ کا بھی خیال آیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ لیکن اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے تلاش کرنے کیلئے کس قسم کے ذرائع استعمال کریں گے..... کیا انہیں معلوم ہو پائے گا کہ مجھے گنار کے بھائی اپنے ساتھ لے آئے ہیں؟ کیونکہ بیدل کی زبانی مجھے ان لوگوں کے متعلق تھوڑا بہت معلوم ہو چکا تھا، یقیناً سردار چل کو بھی گنار وغیرہ کے بارے میں مکمل آگاہی ہوگی اور انہیں اس بات کا بھی علم ہوگا کہ میں جس جگہ سے غائب ہوا تھا، وہاں گنار کا آنا جانا بھی رہتا ہے۔

خیالات کی رو بہتی چلی گئی۔ اسی دور ان مجھے گنار کا خیال بھی آیا، وہ نہ جانے کس قسم کی لڑکی تھی.....! اس کا کردار کچھ واضح نہیں ہو سکا تھا۔ اگر بظاہر دیکھا جائے تو وہ بے حد شوخ و شنگ قسم کی لڑکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ گزشتہ روز بھی مجھے چھپ کر دیکھتی رہی تھی۔ لیکن کیوں.....؟ کیا یہ ایک اخلاقی جرم نہیں تھا؟ اور وہ بھی لڑکی ذات ہو کر اس حرکت کی مرتکب ہو رہی تھی..... ایک گاؤں گوتھ جیسی جگہ پر اس قدر بے باک قسم کی لڑکی کی موجودگی کچھ عجیب سا تاثر قائم کر رہی تھی..... یقیناً اس میں بھی کوئی مجید تھا..... ابھی اس بات پر غور کرنا فضول ہی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وقت کے دھارے پر پہنچنے کے بعد ہی گنار کے

بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل ہو جائیں..... لیکن فی الحال تو میں اندھیرے میں تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھیں کہ وہی دونوں پہریدار نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں ایک خوان تھا جو کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ دروازے کی چل درز میں کافی کشادہ خلاء موجود تھا۔ اس نے اسی خلاء سے وہ خوان اندر کھسکا دیا۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس آگئے:

”لو..... اٹھا لو.....!“ وہی بولا تھا: ”ہم تمہارے لئے کھانا لے آئے ہیں۔“

”اچھا.....“ میں نے سر ہلایا: ”اب ایک بات تو بتاؤ.....“

”کیا.....!“ اس نے پوچھا۔ وہ مجھے ٹٹولنے والی بات سے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے کس جرم میں یہ سزا ملی ہے؟“

”ہمیں نہیں معلوم..... یہ بات زمیندار لوگ جانیں۔“

”اچھا..... یہ تو بتاؤ کہ مجھے یہاں کب تک رہنا ہوگا؟“

”گیارہ تاریخ تک.....“ دوسرا بول اٹھا۔

پہلے والے نے اسے تیز نظروں سے گھور کر دیکھا۔

بولنے والا بغلیں جھاٹنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ جملہ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ہو۔

”کیا مطلب.....!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جنہوں نے تمہیں قید کیا ہے، وہی بتا سکیں گے۔“ پہلے نے جواب دیا: ”ہمیں کچھ نہیں معلوم.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور پھر دونوں وہاں سے چلے گئے۔

اب میں سوچ میں ڈوب گیا، دوسرے

پہریدار کے منہ سے نکلنے والا جملہ ضرور کو رہکتا تھا، ورنہ اس کا ساتھی اسے چپ نہ کروا دیتا۔ یہ بات اس کے منہ سے بے خیالی میں نکل گئی اور پھر اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔

اس سے غلطی ہوتی ہے۔ لیکن یہ گیارہ تاریخ تک چکر تھا..... کیا اس تاریخ کو کوئی خاص واقعہ ہونے والا تھا.....! ہو سکتا تھا کہ گیارہ تاریخ کوئی خاص دن ہو کہ جس کی خوشی میں بڑی کئی کام ہوتے ہیں..... ان میں قیدیوں کی رہائی بھی شامل ہوتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں کوئی واقعہ یا تہوار ہر گز گیارہ تاریخ کو نہیں تھا..... تو پھر.....! کافی دیر اس بارے میں سوچنے کے بعد میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور کپڑے سے ڈھکے ہوئے خوان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر میں نے کپڑا ہٹایا تو خوان میں عمدہ قسم کا کھانا موجود تھا، اس کے ساتھ میں پھل بھی قاشوں کی صورت میں موجود تھے، جنہیں بڑی صفائی سے کاٹا گیا تھا۔ ایک قیدی انسان کی اتنی تواضع.....! میں حیرت زدہ ہو گیا۔ تو پھر..... یہ لوگ مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہوں گے؟

ایک دم ہی مجھے ہنسی آگئی۔ ہو سکتا ہے کہ مہمانوں کو یہ لوگ بھگا دیتے ہوں..... نکلنے ایسے ہی ہیں یہ لوگ..... بہر حال میں نے کھانا کھایا اور اس دوران مجھے سردار کی بہت ستائی۔ کیونکہ وہ ہر کھانے کیلئے میرا شدت سے انتظار کرتا تھا..... وہ بے چارہ نہ جانے کیا سوچ رہا ہوگا..... اور میرے سلسلے میں اس نے کارروائی کی ہوگی.....؟

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں پریشان گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے نیند بھی آگئی اور میں خواب غفلت میں غلٹاں ہو گیا لیکن غفلت

..... اس دوران میں نے جو خواب دیکھا.....! وہ جاگنے کے بعد بھی مجھے اچھی طرح یاد رہا۔ مجھ پر لگ رہا تھا جیسے وہ خواب نہ ہو بلکہ حقیقت

اس خواب میں جو منظر دکھائی دے رہا تھا، وہ بہت عجیب سا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اگر کوئی انسان وہ خواب دیکھ لیتا تو جاگنے کے بعد اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کیلئے بہت زور دیتا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دونوں طرف ایک ایک فرد اس طرح موجود ہے

انہوں نے میرے ہاتھوں اور پیروں میں پھین ڈال رکھی ہیں۔ میں ان کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں..... لیکن کہاں؟

بات خود مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ میرے سامنے کالی رات سے بھی زیادہ گہرا اندھیرا ہے۔

میں اس وقت یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ میں قدم کہاں رکھ رہا ہوں۔ بس میں آگے بڑھ رہا ہوں

ان اندھیرے میں کھوتا چلا جا رہا ہوں..... پھر

ایک دم میرے سامنے ایک بھیا نک وجود نمودار ہوتا ہے، یہ کوئی بلا ہے جس کا پورا وجود ہی

میرے سامنے ہے..... لیکن اس کے باوجود وہ

میرے سامنے غم نہیں ہو رہا بلکہ میں صاف طور پر دیکھ رہا ہوں اس کے ہاتھوں کا گوشت بھی

میرے جڑا ہوا ہے اور وہ پردوں کی طرح پھڑپھڑا رہا ہے۔ اس کی گول اور گہری سرخ آنکھوں

میرے سامنے کی روشنی بھری ہوئی ہے۔ میں لمحہ بہ لمحہ اس کے نزدیک ہو رہا تھا اور پھر اچانک ہی اس

کا منہ کھولا اور مجھ پر جھپٹا مارا۔ عین اسی وقت

.....! آنکھ کھل گئی۔

میں نے جلدی سے اٹھ کر چاروں طرف

لہا لہا پھر نیند کی غشی ختم ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ

میں اس وقت ایک عجیب و غریب قسم کے خواب سے دوچار تھا..... کافی دیر تک میرا ذہن اس خواب سے پراگندہ رہا..... نہ جانے کیوں مجھے اس قسم کا خواب دکھائی دیا تھا.....! ہو سکتا ہے کہ

کھانے سے میں بدقسمی کا شکار ہو گیا ہوں۔ کیونکہ اکثر معدے کی خرابی کے باعث بھی اس نوعیت کے خوابوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ میں

اٹھا اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔ جب میں ہاتھ منہ وغیرہ دھو کر باہر نکلا تو کھڑکی کی سلاخوں میں دو

جانے پہچانے چہرے دکھائی دیے، یہ کنارے کے بھائی تھے:

”کھانا کھا لیا تم نے.....!“

”ہاں.....“

”اور کچھ چاہئے.....!“ پوچھا گیا۔

”ہاں.....“ میں نے جلدی سے سر ہلایا۔

”کیا..... بولو.....!“

”رہائی.....!“ میں نے جواب دیا اور ان کے منہ بن گئے۔ پھر ان میں سے ایک بولا تھا:

”اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہو گے مل جائے گا..... کیونکہ ہم تمہیں تنگ نہیں کرنا چاہتے..... اگر تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہو تو فوراً بتاؤ۔“

”اس مہربانی کی وجہ.....!“ میں نے پوچھا:

”میں قیدی بھی ہوں اور میرا خیال بھی رکھا جائے گا؟“

”تم بہت زیادہ بولتے ہو۔“ وہ جھلا گیا:

”بات یہ ہے کہ ہم لوگ بہت مہمان نواز ہیں اس لئے سب سے ہمارا سلوک یکساں ہوتا ہے۔“

چاہے وہ دوست ہو یا دشمن.....“

”بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر.....“ میں نے جواب دیا: ”میں زندگی بھر آپ لوگوں کی اس مہمان نوازی کو یاد رکھوں گا۔“





## SCHOOL OF COGNITION & LANGUAGE DEVELOPMENT (EARLY CHILDHOOD INCLUSIVE EDUCATION SCHOOL)

• Montessori • Kindergarten • Remedial education • Daycare  
• Speech therapy • Inclusive education • Play group class



Theme Based Classroom  
Speech Therapy Room  
Special Education  
Teacher Child Ratio 1:10  
Day care facilities available  
(for children Above 1 year)  
Vibrant & Colorful learning environment  
Well equipped non-toxic toys  
Remedial education (afternoon)  
Individualized education plan

Plot No-22, CP & Barar Co-Operative  
Housing Society, Off Amir Khusro Road,  
Near Tahir Medical Center, Karachi.

03202632430, 03343117002

sclcd@yahoo.com sclcd@yahoo.com

”زندگی بھر.....!“ اس نے دہرایا۔ پھر  
جب سے انداز میں مسکرا کر بولا: ”ٹھیک ہے۔  
یاد رکھنا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“  
میں اس کے انداز کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔  
لیکن میں اس سلسلے میں ناکام رہا۔  
”اچھا..... اب ہم جا رہے ہیں.....“ پہلے  
نے کہا: ”ہم بس تمہاری خیریت معلوم کرنے  
آئے تھے۔“  
”ایک بات پوچھوں.....!“ میں نے کچھ  
سوچ کر کہا۔  
”ہاں..... پوچھو.....!“  
”کیا میرے علاوہ بھی یہاں کوئی اور قیدی  
موجود ہے؟“  
”اس بات کا تم سے کیا تعلق.....؟“ وہ بھنا  
کر بولا: ”تم صرف اپنے آپ سے مطلب رکھو  
اور اپنی فکر کرو.....“  
”میں اس لئے پوچھ رہا تھا کہ اگر کوئی اور بھی  
یہاں موجود ہے تو اسے بھی میرے ساتھ ہی کر دو  
اچھا ہے..... ہم دونوں کا وقت آسانی سے گزر  
جائے گا..... کیا خیال ہے؟“  
”بہت برا خیال ہے۔“ جواب ملا اور پھر وہ  
دونوں رخصت ہو گئے۔  
رات کو ملنے والا کھانا بھی بے حد شاندار تھا  
میں اب ابھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ آخر اس خاطر  
مدارت کی کیا حقیقت تھی.....! میں اس وقت ان  
دونوں بھائیوں کے سامنے گیارہ تاریخ کا تذکرہ  
کرتے کرتے رک گیا تھا..... نہ جانے پھر کیا  
معاملہ ہوتا۔ اس لئے فی الحال میں نے خاموش  
رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ پھر میں نے سوچا تھا کہ  
ان پہریداروں کو ہی کسی وقت کریدوں گا۔ ہو سکتا  
ہے کہ کوئی اہم بات سامنے آجائے۔

کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی مجھ  
کا غلبہ ہونے لگا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اتنی تین  
تھی۔ بہر حال میں نے ایک بار پھر ہنگ  
اور لمبی تان کر سو گیا۔ لیٹنے سے قبل دروازہ  
کنڈی اندر سے لگانا نہیں بھولا تھا۔  
رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جس  
بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کوئی چیز میری ناک سے  
تھی اور شاید اسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی  
میں نے آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا:  
”ارے حق.....!“ ایک دلی دہائی  
میرے کانوں سے نکلائی: ”ادھر دیکھو.....  
ہوں گنار.....!“  
اب میں نے چونک کر کھڑکی کی طرف  
واقعی وہاں گنار موجود تھی:  
”دروازہ کھولو جلدی سے.....“ اس نے  
سرگوشی کی۔  
میں اٹھا اور دروازے کی کنڈی کھول دی  
جھٹ سے اندر آ گئی۔ اس نے کنڈی  
چڑھا دی تھی۔ اب مجھے یاد آیا کہ اس نے  
حق کہا تھا، میں اسے گھورنے لگا..... لیکن بولا  
نہیں۔ وہ بے چاری مجھ سے واقف کہاں تھی  
اسے کیا معلوم تھا کہ میں کون ہوں، میری  
کیا ہے..... بہر حال میں ضبط کر گیا۔  
”تم نے اندر سے کنڈی کیوں  
تھی.....!“ وہ جیسے لیکن تیز لہجے میں پھر کر  
”تو کیا میں ایسے ہی سو جاتا.....!“  
تک گیا: ”رات میں نہ جانے کون آکر میرا  
کر ڈالنا میں سوتا ہی رہ جاتا.....!“  
اب وہ آرام سے ہنگ پر بیٹھ چکی تھی  
نے میری بات سنی اور مسکرا کر بولی:  
”مگر تمہیں اس طرح مارنا مقصود ہے۔“

استے جتن کرنے کی کیا ضرورت تھی..... کب کا کاٹ کے ڈال دیتے.....

”میں تمہارے اس جملے کا کیا مطلب لوں.....؟“ میں نے اسے گھورا: ”کیا مجھے کسی اور طرح مارنا مقصود ہے؟

یہ سن کر وہ گڑبڑا گئی، لیکن پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی:

”تم مذاق اچھا کر لیتے ہو..... یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو.....؟“

”پہلے تم میری بات کا جواب دو..... پھر بات آگے بڑھانا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا: ”یہ وقتی قید ہے، پھر تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔“

”اچھا..... پھر گیارہ تاریخ کا کیا چکر ہے!“

میں نے اچانک ہی پوچھا۔

”یہ سنتے ہی وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی، پھر وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی:

”تم کو..... تم کو کس نے بتایا..... تمہیں کیسے معلوم ہوا.....؟“

”تمہارے پہریدار آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سن لیں.....“

”کیا..... کیا سنا..... تم نے.....!“

”میں زیادہ نہیں صرف گیارہ تاریخ والی بات ہی پڑی تھی۔“ میں نے بتایا۔

”اوہ!“ اس کے منہ سے اطمینان بھری سانس نکل گئی: ”بات یہ ہے کہ گیارہ تاریخ کو ہمارا سالانہ جشن ہے، اس میں تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔“

”کس چیز کا جشن؟“

”ہوتا ہے بس..... یہ ہماری قدیم روایت ہے..... صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے یہ جشن..... ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے سے.....!“

”اس جشن کو نوعیت کیا ہوتی ہے؟“

”ارے..... تم تو بحث ہی کرنے لگے..... وہ جھنجھلا کر بولی: ”کیا میں اس لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

”تو پھر کس لئے آئی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں سے بے پناہ محبت جھانکنے لگی۔ پھر وہ بڑی اداس ہوئی:

”میں نے پرسوں بھی تمہیں نہر کے کنارے دیکھا تھا۔ بس..... میں جب سے ہی تمہیں چاہنے لگی ہوں..... مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“

میں نے ایک بے ساختہ قسم کے قہقہے کو پیدا میں ہی روکا اور بولا:

”محبت.....! کیا مطلب.....؟“

”اگر محبت ہوئی تو تم جھوٹ نہ بولتیں..... میں نے تیز نظروں سے گلہاری کی جانب دیکھا۔

”جھوٹ..... کیسا جھوٹ.....؟“ وہ چونکا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

”تم گیارہ تاریخ کی حقیقت اب بھی سے چھپا رہی ہو۔ مجھے سچ بتاؤ۔“

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ خاموش رہی تھی۔ میں اس کا غور سے جائزہ لیتے ہوئے بولا:

”اگر اس وقت میرے پاس آئینہ ہوتا تو میں تمہیں تمہاری ہی شکل دکھاتا، تاکہ تم اپنے جھوٹ کا خود ہی سامنا کر لیتیں۔“

”تم نے فضول باتیں کر کے میرا مود خراب

دیا ہے۔“ اس کے تیور بگڑ گئے: ”میں کتنے مان لے کر تمہارے پاس آئی تھی۔“

”یہاں میری جان مصیبت میں پھنسی ہے۔“

”میں نے رو دینے کا انداز اختیار کیا: ”اور تمہیں اپنے ارمانوں کی، یعنی ہری ہری سوچہ رہی..... ان..... کیا ہوگا میرا.....؟“

اب میں نے واقعی باقاعدہ رونا شروع کر دیا، مادہ بولھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی:

”ارے..... ارے..... یہ کیا کر رہے ہو؟ تم تو روتوں کی طرح رو رہے ہو..... چپ ہو جا.....“

”ارے میں تو مارا گیا۔“ میں نے دہائی دی:

”بے قصور مجھے پھنسا یا گیا“ میں نے تو تم کو چھیڑا سی نہیں تھا۔“

”ہاں..... ہاں..... مجھے معلوم ہے۔“ وہ ہدی سے بولی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی:

”نی الحال تم آرام کرو، میں کل آؤں گی تمہارے پاس..... ہاں.....“

”یہ کہہ کر اس نے جلدی سے کنڈی کھولی اور اٹھ گئی، وہ دوسری طرف سے دروازے کو بند نا بھولی نہیں تھی، پھر اس نے سلاخوں کی طرف الوداعی ہاتھی لہرایا اور روفو چکر ہو گئی۔

میں بے اختیار مسکراتے لگا۔ رو یا تو پہلے بھی آئی تھا..... بس اس لڑکی سے نجات حاصل کرنے کا مجھے یہی حل نظر آ رہا تھا۔

اب اگر وہ دوسرے دن میرے پاس آئی، تو اس سے بہت کچھ اگلوئے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ میرے آج کے رویے نے اس کے سے یہ بات تو اگلو دی تھی کہ مجھے خواہ خواہ ہر بات کر یہاں لایا گیا تھا اور اس بات سے گلہاری میں طرح واقف تھی۔

بہر حال اب میں اس لڑکی کو اپنا مہرہ بنا کر کوئی لائحہ عمل تیار کر سکتا تھا۔ یہ بات تو واضح تھی کہ وہ پیار محبت کا صرف ڈھونگ رچا رہی تھی..... میرے نظریے کے مطابق وہ جس ناپ کی لڑکی تھی۔ اس کے سامنے یہ سب فضول اور بیکواس تھا..... وہ صرف اپنے وقتی مقاصد کیلئے مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھی.....

گیارہ تاریخ کے بارے میں سن کر جس طرح وہ چونکی تھی اور اس کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری قید سے اس تاریخ کا کوئی نہ کوئی واسطہ ضرور ہے..... اس نے جو بات بتائی تھی وہ میرے حلق سے نہیں اتر سکتی تھی۔

میں نے جب سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ جسمانی طاقتوں کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی کافی حد تک تیز کام کرنے لگا تھا..... ورنہ ان ذہنی داؤ بچوں سے میرا پہلے کب واسطہ پڑا تھا..... جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، میری تمام صلاحیتوں میں مزید بہتری اور مضبوطی آتی جا رہی تھی..... اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ کیونکہ ہر جگہ صرف جسمانی قوتیں استعمال نہیں ہوتیں۔ کہیں پر ذہنی جنگ بھی لڑنی پڑتی ہے..... کسی کامیابی کیلئے ان دونوں قوتوں کا مشترکہ ہونا لازمی ہے..... اور پھر میں تو اپنے اسلاف کے سائے میں تھا، وہ سایہ جو بے حد مضبوط اور ناقابل شکست تھا.....

دوسرا دن بھی معمول کے مطابق گزرا، تین وقت مجھے آج پھر بہترین اور لذیذ کھانا دیا گیا، اس کے علاوہ بھی مجھ سے میری فرمائش پوچھی گئی۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ آزادی کا سوال کرنا تو فضول ہی تھا..... اور اس کے علاوہ



میں جس جگہ  
سچی کہانیاں  
کے چرچے نہیں  
آپ دو شیزہ کے خریدارین کو ملک کو  
نرماد لہ بھجیے

اندرون ملک = 1000 روپے

### ہر ملک ہر شہر ادارے کے نام اور پتے کی کتاب

|           |                 |          |                 |
|-----------|-----------------|----------|-----------------|
| کویت      | 65 امریکی ڈالرز | ایران    | 65 امریکی ڈالرز |
| سعودی عرب | 65 امریکی ڈالرز | سری لنکا | 65 امریکی ڈالرز |
| یو اے ای  | 65 امریکی ڈالرز | جاپان    | 65 امریکی ڈالرز |
| مصر       | 65 امریکی ڈالرز | لیبیا    | 65 امریکی ڈالرز |
| یونان     | 65 امریکی ڈالرز | ڈنمارک   | 65 امریکی ڈالرز |
| فرانس     | 65 امریکی ڈالرز | جرمنی    | 65 امریکی ڈالرز |
| برطانیہ   | 65 امریکی ڈالرز | ہالینڈ   | 65 امریکی ڈالرز |
| ناروے     | 65 امریکی ڈالرز | پولینڈ   | 65 امریکی ڈالرز |
| امریکہ    | 75 امریکی ڈالرز | کینیڈا   | 75 امریکی ڈالرز |
| افریقہ    | 75 امریکی ڈالرز | آسٹریلیا | 75 امریکی ڈالرز |

اگر آپ پاکستانی کرنسی میں پاکستان کے کسی بینک کے ذریعے ادائیگی کرنا چاہیں تو  
75 امریکی ڈالر کے حساب سے مندرجہ بالا شرح کے مطابق بینک ڈرافٹ ارسال  
فرمائیں۔ مطلوبہ رقم کا ڈرافٹ Sach-Ghee Kahaniyan Monthly کے نام بھیجیں۔  
آپ کو ایک سال تک آپ کا پسندیدہ رسالہ ہوائی ڈاک سے بذریعہ رجسٹرڈ ملتا رہے گا۔

آئی ای ڈی کے 88-C II فرسٹ فلور۔ خیابان جلی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی  
021-35893121 • 35893122 • P.O. Box # 3129 P.E.C.H.S. Karachi 76400

کوئی اور چیز مانگنا بھی بے سود تھا..... وہ دن میں  
نے نہایت خاموشی سے گزارا۔ کسی سے بھی چھیڑ  
چھاڑ نہیں کی۔  
اس رات کو میں جاگ رہا تھا۔ جب کھڑکی پر  
آہٹ ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ  
گلنار ہی تھی اور آج خلاف توقع مسکراتی ہوئی اندر  
داخل ہوئی تھی۔  
”کیا بات ہے..... آج جاگ رہے ہو؟“  
”ہاں..... نیند نہیں آرہی تھی۔“  
”کیوں.....!“ اس نے میری آنکھوں میں  
جھانکا: ”کیا میری یاد آرہی تھی؟“  
”پتا نہیں.....“ میں نے کندھے اچکائے:  
”دو دن گزر گئے، اب تو میری ذہنی کیفیت بھی  
ٹھیک نہیں ہے۔“  
”دل توڑ دیتے ہو تم ایسی بات کر کے.....“  
وہ بڑے پیار سے بولی تھی، پھر اس نے جلدی سے  
کہا: ”یہ پلنگ دروازے کی طرف لے آؤ.....  
کھڑکی سے آؤ ہو جائے گی، پھر ہم اطمینان سے  
بیٹھ کر باتیں کر لیں گے.....!“  
میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا، تھوڑی دیر  
بعد ہی ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔  
”یہ دل توڑنے کی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت  
ہے۔“ میں نے کہا: ”اگر تم کسی پرندے کو پکڑ کر  
چنجرے میں ڈال دو گی تو وہ بھی کم صدم ہو جائے گا“  
میں تو پھر انسان ہوں.....“  
”ہاں..... تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو.....!“  
”اب دیکھو نا.....! مجھے طبعی یاد نہیں ہے کہ  
آج دن کیا ہے، تاریخ کون سی ہے.....!“  
”آج جمعرات ہے..... اور نو تاریخ  
ہے.....“ وہ درواری میں بدل گئی۔ پھر وہ غور سے  
میری طرف دیکھنے لگی..... لیکن میں اس وقت

انجان سا بن گیا۔ پھر میں نے کہا:  
”کیا تم رات میں سوتی نہیں ہو؟“  
”کہاں نیند آتی ہے۔“ وہ ایک ادا سے  
مسکراتی: ”بس رات ہوتی ہے اور بے چینی شروع  
ہو جاتی ہے.....“  
”ہوں..... اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا  
ہاضمہ خراب ہے.....“  
”مذاق اڑا رہے ہو میرا؟“  
”نہیں مس صاحبہ.....!“ میں نے نفی میں  
بلا یا: ”میں جس حال میں ہوں، اس میں وہ تو مجھے  
سب کچھ سوچ سکتا ہوں..... یہاں پر کسی  
خیال کا تصور بھی نہیں آ سکتا۔“  
”میں نے سوچا تھا کہ تمہارے پاس اب نہیں  
آؤں گی۔“ اس نے کہا: ”لیکن پتا نہیں کیا کیا  
ہے تمہارے اندر..... میں خود بخود ہی یہاں  
چلی آئی ہوں۔“  
”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک رحم  
شہزادی ہیں اور مظلوموں کی مدد کرنا آپ  
عادت میں شمار ہے..... آپ اگر بیئر اور تھن  
دشمن ہیں تو کیا ہوا.....!“  
”پھر تم نے میرا مذاق اڑایا.....!“ اس  
مجھے گھورا۔  
”میں نے کہا نا کہ ان دو دنوں میں  
ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی۔ میرے تمام  
اور احساسات کا دیوالیہ نکل چکا ہے..... میں  
حالت میں آپ سے کیا بات کروں.....  
آپ بھی مجھے کسی قسم کا حوصلہ نہیں دے رہیں  
ہی مجھے یہ بتا رہی ہیں کہ میں یہاں سے کب  
پاؤں گا.....“  
(اس دلچپ داستان کے بتایا  
آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)



جوڈر گیا وہ مر گیا

منابل بھی ڈر گئی تھی کوئی تھا جو اسے ڈر رہا تھا..... مگر درحقیقت

کوئی اُسے راہ راست پر لانا چاہتا تھا

نفسه سعيد

اپنی یونیورسٹی کا کام ختم کرتی جو بھی تھا وہ بچھلے دو ماہ میں ہی علشہ کے ساتھ رہ کر پور ہو گئی تھی کیونکہ علشہ کا تعلق پنجاب کے کسی چھوٹے سے شہر سے تھا۔

لہذا اُس کی عادتیں بھی ویسی ہی تھیں رات جلدی سونا صبح سویرے اٹھنا وہ کوئی ممووی نہیں دیکھتی تھی اور نہ ہی بلا ضرورت کسی کے ساتھ لاہور شہر گھومنے جاتی یہی وجہ تھی جو منال کی دوستی اُس سے طبع زیادہ ہوش کی دوسری لڑکیوں سے تھی جو اُس کی طرح زندگی جی کر اور انجوائے کرتے ہوئے جینا جانتی تھیں۔

علیہ نے شروع شروع میں بہت کوشش کی کہ  
مقابلہ کو بھی اپنے ساتھ نماز کا عادی بنائے مگر وہ  
بات ہے کہ پرانی عادتیں بدلنے میں زندگی گزر جا  
ہے لہذا چند ہی دنوں میں علیہ کو اندازہ ہو گیا  
مقابلہ کے سلسلے میں کی جانے والی اس کی یہ کوشش  
بے کار ہے اس لیے وہ خاموشی سے سائیڈ پر ہو  
شاید وہ سمجھ چکی تھی کہ ہر انسان اپنی زندگی ا  
محول کے مطابق جیتا ہے۔

کمرے میں پھیلی زیر و پاوار کے بلب کی ہلکی سی روشنی نے مناہل کی نیند خراب کر دی کیونکہ وہ بچپن سے ہی اپنے کمرے میں مکمل اندھیرا کر کے سونے کی عادی تھی لیکن جب لاہور کے ایک انٹرنیشنل تعلیمی ادارے میں حصول علم کے شوق نے اُسے ہوش کے اس کمرے میں لا لایا تو اسے اندازہ ہوا اپنی بچپن کی عادتیں ختم کرنا کتنا مشکل عمل ہے نیز جو آرام و سکون کی زندگی آپ کو اپنے گھر میں حاصل ہوتی ہے اُسے تیاگ کر جینا کتنی شاید نفس جہاد ہے۔

کیونکہ پچھلے دو ماہ سے وہ جو کچھ یہاں براشت کر رہی تھی عام زندگی میں منابل جیسی لڑکی سے اُس کی امید رکھنا قطعی ناممکن تھا ابھی صبح سویرے نیند خراب ہو جانے پر بنا کچھ کہہ اُس نے خاموشی سے اپنی چار منہ تک اوڑھ لی اور اُس کی روم میٹ علیحدہ صبح سویرے اٹھ کر نماز کے بعد تلاوت قرآن کی عادی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ رات بھی جلد سو جایا کرتی جبکہ منابل جو کہ شروع سے ہی دیر تک جاگنے کی عادی تھی یہاں بھی تنہا بیٹھی کبھی کوئی مووی دیکھ لیتی یا

اور اسی نئے ماحول کو اپنانے میں ابھی منابل کو کچھ وقت لگے گا۔

☆.....☆.....☆

سیمسٹر کے بعد ہونے والی ایک ہفتہ کی چھٹیوں نے ہاسل کو بھی تقریباً خالی کر دیا وہ لڑکیاں جو لاہور کے قریبی شہروں سے تعلق رکھتی تھیں اپنے گھروں کو سدھار دیں گی جبکہ منابل کے والدین ان دونوں لندن اُس کے بڑے بھائی کے پاس گئے ہوئے لہذا مجبوراً اُسے یہ ہفتہ ہوسٹل میں ہی گزارنا تھا کیونکہ اُس کا لاہور میں کوئی ایسا قریبی عزیز بھی نہ تھا جہاں جا کر وہ اپنا ایک ہفتہ گزار سکتی جبکہ اکثر لڑکیاں لاہور اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلی گئی تھیں۔

منابل کی طرح کچھ ایسی لڑکیاں جن کا تعلق دوسرے ممالک سے تھا وہ بھی ہوٹل میں ہی موجود تھیں اور وہ بھی منابل کی طرح شروع سے ہی تنہائی

کی عادی تھیں کیونکہ گھر میں وہ اور ماما ہوتیں اور دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف اس لیے ہوسٹل کے خالی ہونے سے اُسے کوئی خاص فرق نہ پڑا البتہ خوشی ہوئی کہ کچھ دن علیشہ کے بغیر وہ کمرے میں آزادی سے گزار سکے گی اسی لیے رات اُس نے کچھ ڈرامائی فلمیں اپنی بوائے میں ڈالیں تاکہ کمرے میں موجود لیوی پر کچھ سکنے اور نہ علیشہ کی وجہ سے وہ لیوی بھی اُٹھ بچے بند کر کے موزیو اپنے لیے ٹاپ پر دیکھتی جس کا اُسے ذرا مزہ نہیں آتا۔

اسی خوشی میں اس نے جلدی جلدی کافی بنا کر اپنے سائیڈ ٹیبل پر کمرھی اور ایک ڈراؤنی قلم لگا کر بیڈ پر اچھیسی اس نے بستر پر بیٹھنے سے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ اچھی طرح لاک کر لیا تاکہ کسی دوسرے کمرے میں موجود لڑکی اسے یہاں آ کر کمرہ بلاوجہ ڈسٹرب نہ کرے وہ ہمیشہ ایسی فلمیں بڑی یکسوئی سے



دیکھنے کی عادی تھی۔ اسی لیے ٹی وی کی آواز تھوڑی تیز کر کے اُس نے اپنا تکیہ سیدھا کیا اور بیڈ کے پیچھے لگا دیا پھر اطمینان سے ٹیک لگاے ہوئے سووی کے مزے کے ساتھ ساتھ وہ کافی بھی انجوائے کرنے لگی۔ جب اچانک اُسے محسوس ہوا کمرے کا لاک کسی نے آہستہ سے گھمایا ہے منابل چونک اٹھی کیونکہ ٹی وی کی تیز آواز میں بھی اُسے لاک گھومنے کی واضح آواز سنائی دی تھی۔

اُس نے پلٹ کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا تو حیران رہ گئی۔ دروازہ تھوڑا سا نیم دا تھا جیسے کسی نے کھول کر اندر جھانکا ہو۔  
”میں نے تو دروازہ لاک کیا تھا پھر یہ کیسے کھل گیا۔“

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تاکہ دیکھے دروازہ کیسے کھلا ہے اب ٹی وی کی آواز بند کر کے وہ جیسے ہی دروازے کی جانب بڑھی تو حیرت کا شدید جھکا لگا یہ دیکھ کر کہ دروازہ نہ صرف بند ہے بلکہ لاک بھی لگا ہوا ہے۔ دو تین دفعہ اُس نے دروازے کی ناب کو گھما کر دیکھا دروازہ لاک ہی تھا ایک سکون بھر اسانس لیتے ہوئے وہ دل ہی دل میں ہنس دی۔

”واہ منابل بی بی اب یہ وقت بھی آنا تھا کہ ڈراؤنی فلمیں دیکھ کر غم ڈرنے لگو حد ہوگئی۔“ خود کو سرزنش کرتے جیسے ہی وہ واپس بیڈ کی جانب پلٹی ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ پورا کھل گیا بالکل ایسے جیسے کسی نے اُسے دھکا دیا ہو ساتھ ہی تیز ہوا کا جھونکا اس طرح کمرے میں داخل ہوا کہ ایک سیکنڈ میں منابل کے سارے وجود پر کچھ سی طاری ہوگئی زندگی میں پہلی دفعہ وہ اتنی خوف زدہ ہوئی کہ اُس کے قدم جیسے زمین میں جکڑ گئے وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتی تھی اور نہ ہی مارے خوف کے اُس کے حلق

سے کوئی آواز نکلی وہ اسی حالت میں ساکت کھڑی تھی۔

جب اُس کے کمرے میں جب داخل ہوئی وہ بھی منابل کی طرح ہوسٹل میں ہی تھی کیونکہ اس کی فیملی سعودیہ عرب میں رہتی تھی۔ منابل کو اس طرح اپنی جگہ تک صدمہ کھرا دیکھ کر وہ حیرت سے بولی۔

”کیا ہوا منابل سب ٹھیک تو ہے نا اور یہ کمرے کا دروازہ ایسے کیوں کھولا ہے تم تو دروازہ اور لائٹ بند کر کے سونے کی عادی ہو پھر..... سب خیریت تو ہے۔“ منابل کی خاموشی کو محسوس کر کے جب نے اُس کا کدھا ہلاتے ہوئے سوال کیا اور منابل جیسے چوک اٹھی اور خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

”پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے میں ابھی ابھی کوئی اور بھی تھا۔“  
”ہم ہے تمہارا اور یہ ڈراؤنی فلمیں دیکھنا بند کرو ایسا نہ ہو رات اکیلے کمرے میں تمہیں کچھ ہو جائے۔“  
جب نے آگے بڑھ کر اُس کے کمرے کا ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔

”میرا وہم نہیں تھا جب.....“ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اُس نے جب کی جانب دیکھا اور پھر سے بولی۔  
”تمہیں پتہ ہے میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اچھی طرح لاک کیا تھا لیکن یہ دیکھو.....“  
ایک بار پھر پلٹ کر اُس نے دروازے کی جانب دیکھا اور بولی۔

”نہ صرف لاک کھلا ہے بلکہ کسی نے پورا دروازہ بھی کھول دیا۔“ ساتھ ہی اُس نے پوری بات جب کو بتادی۔ جسے سن کر کچھ دیر تو وہ خاموش رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔  
”شاید ناب گھماتے ہوئے تم نے خود لاک

کھول دیا ہو ویسے بھی باہر بارش ہو رہی ہے جس کے ساتھ کچھ دیر قبل تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ شاید اُسی سبب تمہارے کمرے کا دروازہ کھل گیا ہو بہر حال اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو میرے کمرے میں آ جاؤ کیونکہ میں تو یہاں کبھی نہیں ڈری۔“

جب نہ صرف اُس سے سینئر تھی بلکہ پچھلے دو سالوں سے اس ہوسٹل میں قیام پذیر تھی۔  
”نہیں اُس اوکے یار ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو شاید فلم کی وجہ سے میں ڈر گئی تھی۔“

اپنا کمرہ چھوڑ کر جب کے ساتھ جانا اُسے اچھا نہیں لگا اس لیے فوراً انکار میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔

”چلو میں جا رہی ہوں تم اپنا دروازہ اچھی طرح لاک کرلو۔“ منابل کو ہدایات دیتی جب واپس اپنے کمرے کی جانب چلی گئی ٹی وی اور کمرے کا دروازہ دونوں بند کر کے منابل اپنے بستر پر آ گئی پھر شاید وہ انہی طرح سوئی بھی نہ تھی کہ کمرے میں پھیلنے والی کسی آواز سے اچانک ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔

پہلے چاہل تو منابل کو سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے پھر جیسے ہی وہ مکمل طور پر اپنے حواسوں میں واپس آئی تو یہ دیکھ کر گنگ ہوگئی کہ اُس کے کمرے میں موجود ٹی وی چل رہا ہے جس کی اسکرین پر سامنے ہی رات والی فلم موجود تھی وہ ایک دم خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھی دل چاہا بھاگ کر جب کے کمرے میں چلی جائے مگر ہمت نہ ہوئی کہ تنہا کمرے سے نکل کر کارڈور کے آخری سرے پر موجود جب کے کمرے تک جائے یہ ہی سوچ کر اُس نے اپنے کپکپاتے قدموں کے ساتھ آگے بھگ کر سب سے پہلے کمرے کی لائٹ آن کی اور پھر ریوٹ کی مدد سے ٹی وی بند کیا اور یہ منابل کی زندگی میں آنے والا پہلا دن تھا جس جب اُس نے اپنے

بستر پر بیٹھ کر لرزتے ہوئے مسلسل دعا کی کہ جلدی سے اذان ہو جائے تاکہ فجر کی نماز کی ادائیگی کے لیے ہوسٹل میں کچھ چھل پھل ہو تو وہ بھی اُس کمرے سے نکل کر جب کے کمرے تک جا سکے۔

☆.....☆.....☆

انسان کی تخلیق میرے مالک نے کچھ اسی طرح کی ہے کہ وہ بہت جلد بھول جاتا ہے اور شاید یہ ہی اُس کے حق میں بہتر ہے ورنہ زندگی کی تلخیوں کے ساتھ جینا کس قدر مشکل ہوتا یہ وہ ہی لوگ جان سکتے ہیں جو ان تلخیوں سے گزرتے ہیں بھول جانے کی اس خصوصی صفت کے ساتھ منابل نے اگلا پورا دن بہت سکون سے گزارا وہ جب کے ساتھ شاپنگ کے لیے قریبی مارکیٹ گئی پھر دونوں فوڈ اسٹریٹ گئیں جہاں پہنچ کر کتنی دیر تک وہ تاریخ کے جھروکوں میں گم وہاں کی عالیہ رنگینیوں سے لطف اندوز ہو کر جب رات گیارہ بجے واپس آئیں تو پورا ہوسٹل تاریک اندھیرے میں ڈوبا ایک بھوت بنگلہ دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ وہاں کے زیادہ تر کمرے لڑکیوں کی غیر حاضری کی بدولت خالی تھے۔

اس لیے اُن میں اندھیرا اچھا ہوا تھا۔ اکا دکا آباد کردوں کی روشنائی بھی گل جھیں شاید وہاں کے لیکن یا تو سوچکے تھے یا پھر ان ہی کی طرح کہیں باہر نکلے ہوئے تھے۔

گیٹ پر موجود مردہ سے زرد بلب کی روشنی میں چوکیدار نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا دونوں اندر داخل ہو گئیں چونکہ ان کے کمرے سیکنڈ فلور پر تھے اس لیے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہی سامنے والے پہلے کمرے کے دروازے پر جب تک گئی کیونکہ یہ اُس کا کمرہ تھا جس نے دروازے کے لاک میں چابی گھماتے ہوئے منابل کو مخاطب کیا۔

”میرا خیال ہے آج تم یہاں ہی سو جاؤ میرے کمرے میں۔“

”نہیں یار مجھے جگہ کی تبدیلی کے باعث نیند نہیں آتی۔“ منال نے جواب دیا اور تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی جبکہ پیچھے کھڑی جب اسے اُس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ اپنے کمرے کے دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل نہیں ہوئی۔ جب نے اُسے ہدایت کی تھی کہ جب اپنے کمرے میں داخل ہو تو آیت الکرسی کا ورد تین سے چار بار ضرور کر لے مگر یہ بھی اُس کی روٹین لائف کا حصہ نہ تھا اس لیے حسب عادت وہ بھول گئی اور اندر داخل ہو کر اُس نے اپنے کمرے کا لاک بند کیا پڑے پیچ کیے اور چونکہ وہ صبح سے تھکی ماندی واپس آئی تھی لہذا لائٹ آف کر کے فوراً ہی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

اور بہت جلد نیند کی وادیوں میں اتر گئی اور وہ گہری نیند کے زیر اثر ہی تھی جب اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی منال نے ہشکل اپنی مونڈھی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھا تو اسے احساس ہوا رات کے اس سے اُس کی آنکھ کھلنے کی وجہ کمرے میں جلنے والے زیر و پاور کے بلب کی مخصوص روشنی تھی جو ہمیشہ ہی اُس کی نیند ڈسٹرب کرنے کا باعث بنتی اُسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ یہ بلب رات اُس نے جلایا تھا کیونکہ وہ تو ہمیشہ سے مکمل اندیرے میں سونے کی عادی تھی پھر یہ بلب کیسے جلا؟

یہ سوال ذہن میں آتے ہی اُس کی گہری نیند ایک سیکنڈ میں ہی اڑن چھو ہو گئی اُس نے لیٹے لیٹے ہی کروٹ بدل کر پورے کمرے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا ہاتھ روم کا دروازہ اور لائٹ بھی آن ہے جس سے یہ اندازہ لگا نامشکل نہ تھا کہ ہاتھ روم میں کوئی ہے جبکہ کمرے کی چابی اُس کے علاوہ صرف علیشہ کے ساتھ تھی تو کیا علیشہ واپس آ گئی ہے یہ خیال دماغ

میں آتے ہی وہ قدرے مطمئن ہو گئی اور بھول گئی کہ علیشہ کے واپس آنے میں ابھی پورے دو دن باقی تھے وہ ان ہی سوچوں میں گہری تھی جب ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی منال نے گہری نیند میں ڈوبے اپنے حواس برقرار رکھتے ہوئے دیکھا نماز کے مخصوص دوپٹے میں بلبس وہ یقیناً علیشہ ہی تھی اور اس احساس کے ساتھ ہی علیشہ واپس آ گئی ہے ایک اطمینان سا اُس کے دل میں اتر گیا تو آنکھوں تک چادر اوڑھ کر وہ دوبارہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆.....☆.....☆  
صبح اتوار تھا اور وہ جانے کتنی دیر تک سوئی جب جب نے آ کر اُسے جگایا کیونکہ وہ منال کے ساتھ ناشتہ کرنے کہیں باہر جانا چاہ رہی تھی۔  
”اٹھ جاؤ یار کتنا سوتا ہے بارہ بجتے والے ہیں۔“ اُس کی آواز سن کر منال نے اپنی منڈھی ہوئی آنکھیں کھولیں۔

”اور یہ تم نے رات دروازہ لاک نہیں کیا تھا؟“ منال کو جانتا دیکھ کر جب نے فوراً سوال کیا۔  
”دروازہ کھلا.....“ منال چونکی پھر جیسے اچانک اُسے کچھ یاد آ گیا تو اپنے بال سینتے ہوئے بولی۔  
”میں نے تو لاک کیا تھا لیکن رات چونکہ علیشہ واپس آئی ہے تو شاید اُس نے کھلا چھوڑ دیا ہو۔“  
”علیشہ.....“ منال کی بات سن کر جب نے پورے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور دوبارہ لیا۔  
”علیشہ نے تو سنڈے کو واپس آنا ہے تم شاید بھول گئی ہو۔“

”ہاں لیکن وہ رات یہاں تھی میں نے اُسے خود دیکھا تھا نماز پڑھتے ہوئے اور زیر و پاور کا بلب بھی اُس نے آن کیا تھا۔“ جب نے دیکھا کمرے میں نیلے بلب کی مدھم روشنی ابھی بھی پھیلی ہوئی تھی۔  
”مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی وہم ہوا ہے کیونکہ علیشہ

واپس نہیں آئی اور اب تم اٹھ کر جلدی سے ریڈی ہو جاؤ تو آج امارکلی ناشتہ کرنے چلتے ہیں۔“ اپنی بات ختم کر کے جب دروازے کی سمت بڑھی تھی کہ اُسے منال نے آواز دے کر روک لیا۔  
”مجھے وہم نہیں ہوا رات اس کمرے میں میں نے اُسے خود دیکھا تھا وہ دیکھو سامنے کرسی پر جائے نماز بھی رکھی ہے جبکہ میں صبح اٹھ کر نماز نہیں پڑھتی۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے وہ ہل دی دل میں شرمندہ بھی ہو گئی جب نے پلٹ کر اُسے دیکھا منال کے چہرے پر چھائی اُبھمن اور پریشانی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ سچ کہہ رہی ہے اور پھر اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور بولی۔

”ایسا کر دو تم میرے کمرے میں آؤ ہم دونوں مل کر وارڈن کے پاس جاتے ہیں تاکہ انہیں بتایا جائے کہ رات کوئی تمہیں تنگ کر رہا ہے اور یقیناً اس کمرے کی ایک تیسری چابی بھی ہوگی جو اس ہاسٹل کی وارڈن یعنی انٹی صفیہ کے پاس ہونی چاہیے۔“  
”اوہ.....“ منال کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔  
”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مجھے جان بوجھ کر تنگ کر رہا ہے۔“  
جب کی بات سمجھتے ہوئے وہ جلدی سے بولی۔

”ہاں.....“ جب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے منال کی جانب دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے اس ہاسٹل میں موجود کوئی لڑکی یا ملازمہ تمہیں ستا رہی ہے جس کا مقصد محض تمہیں خوفزدہ کر کے انجوائے کرنا ہے۔“  
”تو پھر ٹھیک ہے اگر ایسا ہے تو ہمیں انٹی صفیہ سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آج رات تم میرے کمرے میں سو جاؤ تو ہم دونوں مل کر اُس کو پکڑتے ہیں جو یہ فضول کر رہی ہے۔“  
”میرا خیال ہے کہ میں اپنے کمرے میں ہی

رہوں تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ تم محتاط ہو گئی ہو البتہ جب تم اپنے کمرے میں کوئی غیر ضروری بات محسوس کرو تو موبائل سے مجھے مس کال دے دینا میں فوراً پہنچ جاؤں گی اور پھرجل کر ہم دونوں اُس چیزیل کو انٹی صفیہ کے پاس لے جائیں گے۔“ جب ہشتے ہوئے بولی اور یہ فیصلہ ہی شاید اُن دونوں کی ایک بہت بڑی غلطی تھا جس کا احساس اُس رات اُن دونوں کو بہت شدت سے ہوا۔

☆.....☆.....☆  
آج رات منال بہت مطمئن تھی سب سے پہلے اُس نے اچھی طرح دروازہ لاک کیا اور پھر ٹی وی پر اپنی پسندیدہ ڈرامائی فلم لگائی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اُسے احساس ہوا کہ آج صوبی اسے پہلے جیسا مزہ نہیں دے رہی شاید ایک ہی فلم کو بار بار دیکھنے سے اُس میں دلچسپی کا عنصر یکسر غائب ہو گیا تھا یہ ہی سوچتے ہوئے منال نے اپنے قریب رکھے ریڈیو کی مدد سے ٹی وی آف کر دیا اور لائٹ بند کر کے سونے لیٹ گئی اور چونکہ اس سے وہ پچھلے کئی دنوں کی ٹینشن سے آزاد ہو چکی تھی۔ اس لیے جلد ہی بے فکر ہو کر نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔ جب اچانک کسی نے اُس کے پاؤں کے انگوٹھے کو پکڑ کر زور سے ہلایا۔

یکدم ہی منال کی آنکھ کھل گئی اس نے دیکھا کمرے میں پھیلی تاریکی میں کوئی بھی نہ تھا کہ وہ بالکل خالی پڑا تھا چونکہ ابھی بھی وہ نیند ہی کے زیر اثر تھا لہذا چاہا کہ آنکھیں بند کر کے دوبارہ سو جائے جب اچانک اُس کے حواس بحال ہو گئے اُسے محسوس ہوا کمرے میں کسی کے سانس لینے کی آواز آرہی ہے ایک تو کمرے میں پھیلی گہری تاریکی اور اس پر سانس لینے کی زوردار آواز منال بری طرح گھبرا گئی اور جلدی سے اٹھ بیٹھی۔



”کون ہے یہاں.....“ حلق کے بل چلاتے ہوئے وہ بھول گئی کہ اُسے جبہ کو کس کال دینا ہے اس بل تو اُسے اپنی سانس بھی سینے میں کھتی محسوس ہو رہی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بیڈ سے نیچے نہ اتر پار ہی تھی اور یہ ہی وہ وقت تھا جب اُس نے اندھیرے میں اُسے اپنے سامنے کھڑے دیکھا سین اُس کے سامنے بیڈ کے پائنتی کی جانب اپنے بال کھولے کھڑی اجنبی لڑکی یقیناً علقبہ نہ تھی۔ سفید پیکڑوں میں بالکل خاموش کھڑی وہ اُسے گھور رہی تھی منابل نے چاہا بیڈ سے چھلانگ لگا کر دروازے کی سمت بھاگ جائے مگر اُس کا وجود جیسے کسی نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا یہ ہی وجہ تھی جو اُس کے جسم نے ہلنے چلنے سے قطعی انکار کر دیا منابل کو اپنی موت اپنے بالکل سامنے کھڑی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

مگر افسوس اُس کے پاس بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی اُسے افسوس ہوا جبکہ اہدایت کے باوجود اُس نے رات آیت الکرسی کیوں نہ پڑھی تھی جبکہ اب تو وہ مارے خوف کلمہ بھی بھول چکی تھی تو آیت الکرسی کیسے یاد آتی اُسی بل اچانک اس کے تکیے کے نیچے رکھا فون بج اٹھا جو یقیناً بج کر رہی تھی فون کے بجتے ہی جیسے منابل ہوش میں آگئی اور تیزی سے پلٹ کر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر فون نکالا اور یہ ہی وہ وقت تھا جب سامنے کھڑی لڑکی اندھیرے میں کہیں ایسے غائب ہوئی جیسے وہاں تھی ہی نہیں جبکہ دوسری طرف منابل کے فون رسیو کرنے سے پہلے ہی لائن ڈسکنکٹ ہو چکی تھی اُس نے جلدی جلدی جبہ کا نمبر ملایا جو بڑی جارہا تھا شاید وہ پھر منابل کو فون کر رہی تھی مگر اب کمرے میں ٹک کر جبہ سے فون پر بات کرنا بے کار تھا یہ ہی سوچتے ہوئے وہ تیزی سے اپنے بیڈ سے نیچے اتر کر دروازے کی سمت دوڑی

جب کسی سے ٹکرا کر منہ کے بل زمین پر آن پڑی اور اندھیرے میں اُس کا موبائل بھی اُس کے ہاتھ سے گر کر جانے کہاں گم ہو گیا۔ اُس نے بمشکل گردن اٹھا کر دیکھا سامنے کوئی بھی نہ تھا جبکہ ایک سینڈ پبلے وہ کسی تخت وجود سے ٹکرا کر زمین پر آن پڑی تھی۔ اُسی دم اُس کے کمرے میں موجود زیرو پاور کا بلب جل اٹھا۔ ساتھ ہی ٹی وی کی اسکرین بھی آن ہو گئی جس پر چلنے والی مووی کی آواز خود بخود اتنی تیز ہو گئی کہ منابل کو اپنے کان کے پردے بھٹتے محسوس ہوئے اُس کا دل چاہا وہ دھڑائیں مار مار کر روئے خوف سے اُس کا پورا وجود لرز رہا تھا اُسے کوئی ایسی دعا یاد نہ تھی جو وہ اس لمحے پڑھ سکتی جب یکدم ہی تاریکی میں گم ہونے والی وہ لڑکی اچانک اُس کے سامنے ایک بار پھر سے کچھ اس طرح نمودار ہوئی کہ باوجود کوشش کے منابل اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔

البتہ کمرے میں پھیلی خنکی میں قدرے اضافہ ہو گیا اور کچھ روشنی نے بھی اُسے ہمت دی اور اپنے وجود کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے اُس نے اٹھنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس لڑکی کا چہرہ دیکھ سکے جو بالوں میں چھپا ہوا تھا اور یہ ہی منابل کی بہت بڑی غلطی تھی کہ جیسے ہی اُس نے بالوں کے اندر چھپا چہرہ دیکھنا چاہا تو اسے احساس ہوا کہ اُس لڑکی کے پاس کوئی چہرہ نہ تھا بلکہ سر پر صرف بال ہی بال تھے جو اس قدر خوفناک لگ رہے تھے کہ بے ساختہ ہی منابل کے حلق سے تیز چیخ برآمد ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی زمین پر دوبارہ گر کے بے ہوش ہوتے ہوئے قریبی مسجد سے ابھرنے والی اذان فجر کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”حی الفلاح..... آؤ بھلائی کی جانب“ اور پھر اُسے کچھ یاد نہ رہا اُسے لگا وہ شاید مرنے ہی ہے کیونکہ اُس کا وجود آہستہ آہستہ بالکل بے جان ہو گیا

تھا۔

☆.....☆.....☆  
اس کے ساکت پڑے وجود میں ہلکی جی جنش محسوس کرتے ہی ملائکہ کے تن مردہ میں گویا جان پڑ گئی آج جانے کتنے دنوں بعد انہیں احساس ہوا کہ منابل زندہ ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی مارے خوشی ایک ہلکی سی چیخ اُن کے حلق سے برآمد ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر منابل کے سر ہانے آن کھڑی ہوئیں۔

”پانی.....“ منابل نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔  
اور پھر نرس کی مدد سے ملائکہ نے قطرہ قطرہ پانی اُس کے حلق میں اتارا وہ جاپانی اکلوتی بیٹی کی زندگی سے تقریباً ماپوس ہو چکی تھی آج ایک بار پھر سے اللہ کی عطا کی قاتل ہو گئی بے شک وہ جسے چاہے زندگی دے اور جس سے چاہے اپنی دی ہوئی یہ امانت واپس لے لے وہ قادر ہے اور یہ احساس پچھلے پندرہ دنوں میں ملائکہ کو کئی بار ہوا اور یہ شاید اُس کی چالیس سالہ زندگی کے واحد پندرہ دن تھے جن میں اُس نے خدا کو بے شمار دفعہ پکارا اور یاد کیا۔

کئی سالوں بعد نماز بھی پڑھی اور رو کر اپنے رب کے حضور بیٹی کی زندگی کے لیے دعا بھی کی جو شاید بارگاہ الہی میں قبول ہو گئی تھی ورنہ ڈاکٹر نے تو اُسے یہ کہہ کر بالکل ماپوس کر دیا تھا کہ کسی انجانے خوف نے منابل کے دماغ کو مفلوج کر دیا ہے اور شاید اب وہ کبھی کو ما کی کیفیت سے باہر نہ نکلے گی۔

اس حالت میں زندہ اُسے کئی سال بھی لگ سکتے ہیں اور کچھ ماہ بھی اور یہ واحد اللہ کی ذات تھی جس نے محض چند دنوں میں منابل کو واپس زندگی کی طرف لوٹا دیا اور آج جب جبہ اور علقبہ کے ساتھ صفیہ آنٹی اُس سے ملنے آئیں تو منابل کو پتہ چلا اس دن اُس

کی چیخ کی آواز سن کر جب جبہ بھاگی ہوئی اُس کے روم میں آئی تھی تو وہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی جبکہ اُس کے کمرے کا دروازہ چوپھٹ کھلا ہوا تھا ٹی وی چل رہا تھا اور کمرے میں پھیلی خنکی باہر کے ماحول سے بالکل مختلف تھی ایسے میں تیز آواز سے آیت الکرسی پڑھی جب نیچے دوڑی اور پھر آنٹی صفیہ کی مدد سے اُسے ہاسٹل پہنچایا گیا جہاں وہ پورے پندرہ دن بعد ہوش میں آئی اور یہ پندرہ دن اُس کی ممانے جیسے کسی سولی پر لٹک کر گزارے لیکن ہوش میں آنے کے بعد اُسے اپنی مامقارے بدل ہوئی محسوس ہوئیں اور پہلے دن ہی اپنے سر ہانے موجود ماں کی تلاوت قرآن پاک سن کر اُسے بہت سکون محسوس ہوا تھا اور آج صفیہ آنٹی کی زبانی وہ یہ سن کر حیران رہ گئی کہ ہوسٹل کے جس کمرے میں وہ رہائش پذیر تھی وہاں کچھ سال قبل رہنے والی ایک لڑکی نے خودکشی کی تھی۔ جس کی وجوہات تو آج تک کسی کو معلوم نہ ہو سکیں البتہ وہاں مقیم لڑکیاں اکثر ڈر جایا کرتیں جبکہ پچھلے دو سالوں سے علقبہ اُس کمرے میں رہائش پذیر تھی اور اس دوران وہ کبھی نہ ڈری اور نہ ہی خوف زدہ ہوئی جبکہ اُس کے کمرے سے جاتے ہی منابل اُس خوف کے شکنجے میں اس بری طرح بھنسی کہ ہاسٹل آن پچنی اور پھر واپس جاتے جاتے صفیہ آنٹی کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ اور وہ بولیں۔

”ارے ہاں اُس لڑکی کا نام بھی منابل ہی تھا جس نے اُس کمرے میں خودکشی کی تھی۔“

جو بھی تھا اس حادثے نے منابل کی فیملی کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا اور جب بالکل صحت یاب منابل واپس ہوسٹل پہنچی تو فجر کے وقت چلنے والے زیر و پاور کے بلب نے اُسے ڈسٹرب نہ کیا کیونکہ وہ بھی اب نماز بخشنا نہ کی پابند ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

## ناقابل شناخت

ہر بچے کی کلائی میں ایک بریسلٹ تھا اب اسے فقط اس بچے کو تلاش کرنا تھا جس کے بریسلٹ پر بن نورڈ لکھا ہو۔ کچھ ایسا ہی سوچتا وہ قدرے مضطرب اس نے قریب ترین پالنے میں چھوٹے سے ننھے اور گداز ہاتھ کو اٹھا کر، بریسلٹ پر لکھے اعداد اور حروف کو.....

### نجیب عمر

ایلیٹ بنڈر نے اپنے ہاتھ میں تھا مے مضبوط دستے اور طوطے کی چوچ نما نوکیلے خنجر کے تیز دھار کو دوسرے ہاتھ سے چاٹتے خود کو سپلائی روم کے تاریک گوشے میں سالیا۔

باہر مین کوریڈور میں، اسپتال میں ابھرنے والی آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔ پکارنے والے لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں، اسٹریچر کے پہیوں کی آوازیں۔ میڈیکل اسٹوڈنٹ اور نرسوں کے دبے دبے قہقہے اور سپلائی روم کے دروازے کے قریب کسی کے قدموں کی چاپ۔

جلدی جلدی میں زیب تن کیے، اسپتال کے کارندوں کے عام لباس میں، بنڈر اس وقت بڑے اسپتال کے ایک سرجن کے روپ میں، میڈیلا سبز آپریشن کیپ اس کے سر پر اور اس سے بچ کر تا ہوا اپر اور لوئر جس نے اس کے کپڑوں کو مکمل طریقے سے چھپا لیا تھا۔ سرجن کے منہ اور ناک کو چھپانے والے ماسک نے اس کے سخت

جان چہرے کے نقوش کو پردے میں کر لیا تھا۔ ”شفٹ کی تبدیلی کا وقت“ اس نے سوچا۔ اس دوران بڑی چھیدگی ہوتی ہے۔ ہماری جانب کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ اس دوران میں ٹھکانے تک پہنچ کر شفٹ کے تبدیل ہونے کا انتظار کر لوں گا۔ پھر اس کے بعد۔“

چاقو کی دھار پر اس نے اپنا انگوٹھا رکھ کر اندازہ کر لیا کہ یہ اپنے جوہن پر ہے۔ انگوٹھے کو کھسکاتے ہوئے نشیب میں اس کی جاہ کن نوک تک پہنچا۔ اندھیرے میں اسے خوفناک پرندوں کے بچوں کے نوکیلے ناخن کی یاد تازہ ہوئی۔ وہ مسکرایا اور کرشل گھڑی پر نگاہ ڈال کر دوبارہ مسکرایا۔ اب منزل دور نہیں۔

دبلا، پتلا، گھنجا، ٹھوڑی میں شکاف کے ساتھ ایلیٹ بنڈر مقابل کے لیے کسی طرح خطرناک نہیں ہو سکتا تھا۔ حقیقت میں وہ سب کچھ برداشت کرنے والا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اسے خود ادراک تھا کہ وہ ایک بڑول بینک کلرک جیسا ہے

اور حقیقتاً وہ ایک ہارڈ ویئر کلرک تھا۔

اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے اس کا ذہن ماضی میں..... منسلک ہونے والے واقعات کی جانب چل پڑا جنہوں نے اسے آج یہاں اس ماحول میں ایک وقتی کرب کی حالت میں پہنچا دیا تھا۔ جس کی ابتدا بنفورڈ ہارڈویز سے ہوئی تھی۔

جہاں اس نے تقریباً بیس برس خدمات انجام دی تھیں۔ بیس سال سے یہ اسٹور لیو جے بنفورڈ کی ملکیت تھا۔ ایک ہمدرد بوڑھا، شریف آدمی جو ایک دیانت دار ملازم اور اس کی وفاداری کو سمجھتا اور اس کی قدر کرتا تھا۔ ایلیٹ اپنے بوڑھے مالک کے سامنے اس کے ابتدائی دنوں سے کام کیا تھا اور مالک کو روزانہ کی بنیاد پر اطمینان بخش کارکردگی کی

رپورٹ پیش کیا کرتا تھا۔ دن خوش اسلوبی سے گزرتے گئے۔ دس سال بعد ایلیٹ کو بنفورڈ ہارڈویز کا ٹیچر بنادیا گیا۔ اچھی تنخواہ۔ مالک اپنے بنگلو پر ہر ماہ باقاعدگی سے ادا کیا کرتا۔ سینئر بنفورڈ اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ حتیٰ کہ مالک نے اسے قرض بھی دیا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے سے مکان کی ادائیگی کر سکے۔ ایلیٹ بنڈر ایک قانع اور خوش خرم رہنے والا شخص تھا۔

یہ سب کچھ یوں ہی چلتا رہا کہ مالک کے بیٹے لیو جے بنفورڈ جو نیئر نے اسکول کے بعد اور ہفتے والے دن اسٹور آنا شروع کیا تا کہ اسے کاروبار کی سوجھ بوجھ ہو سکے۔ ابھی وہ نوخیز تھا لیکن اپنی شخصیت میں سختی کا پہلو نمایاں رکھتا تھا۔ اس کی



آنکھوں میں حاسدانہ چمک صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ وہ ایک گدھ کی مانند تھا جو مردے پر بیٹھنے کے لیے اس کی آخری سانسوں کے پورے ہونے کا منتظر ہوتا ہے اور بار بار پلٹنے کے لیے تیار۔ ایلیٹ اچھی طرح سے جان چکا تھا کہ وہ مالک کے بیٹے پر ہرگز بھروسہ نہیں کر سکتا۔

وقت گزرتا رہا۔ لیو جوئیر گرمیوں میں کانج سے گھر کے بجائے سیدھے ہارڈ ویئر اسٹور آنے لگا۔ وہ اسٹور کے تمام ملازمین کے لیے پریشانی اور اشتعال میں اضافے کا سبب بننے لگا۔ خصوصاً ایلیٹ بنڈر کے لیے خواہ اس کا رویہ مالک کے بیٹے کے ساتھ کیسا ہی مصالحانہ اور خوش کن ہو۔ اس کی فطرت کی کچی میں اصلاح کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا اور جوئیر کا رویہ اس کے ساتھ تضحیک آمیز ہوتا اس کے مشوروں کو خاطر میں نہیں لاتا اور دردمزہ کے کاموں میں اس کی ہر درخواست کو رد کرتا۔

لیکن ایلیٹ ایک صابر شخص تھا اور اسے امید تھی کہ ابھی اس کی کتنی سخت مزاجی کا سبب ہے اور اپنی اہمیت جتانے کا شوگر بھی ہے لیکن مزید سوچ بوجھ کی صلاحیت جلد اسے ایک معتدل اور مصالحت پسند شخص میں بدل دے گی۔ اسی بنا پر اس نے اسٹور کے مالک اور اس کے والد سے بات کرنا مناسب نہیں جانا اور ان مسائل کا ذکر کرنا جو اس کے بیٹے کی وجہ سے اسے برداشت کرنا پڑتا ہے وہ فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ وہ والد یعنی مالک سے کچھ بولے یا نہیں لیکن وہ خاموش ہی رہا اور حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ نتیجتاً ایلیٹ اور لیو جوئیر کے درمیان نفرت بڑھتی گئی اور دوسرے ملازموں پر بھی آشکار ہوتی گئی لیکن بد قسمتی سے ہنفرڈ سینئر ان بگڑتے حالات

سے بے خبر رہے جو اپنا زیادہ تر وقت گرین ہاؤس میں گزارتے اور کاروبار میں کم سے کم۔

حقیقت میں صرف ایک امید نے ایلیٹ کو ہوشمند بنائے رکھا کہ مالک کئی مرتبہ اظہار کر چکا تھا کہ وہ قریبی ناؤن میں اپنے اسٹور کی ایک برانچ کھولنے کا خواہش مند ہے اور ایلیٹ کو اپنا شریک کاروبار بنانا چاہتا ہے۔ ظاہر تھا کہ یہ شراکت بیٹے کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ بوڈھے نے اسے بتایا کہ اس کا وکیل تمام کاغذات تیار کر رہا ہے تاکہ قانونی تقاضے پورے کر کے اسے باقاعدہ پارٹنر بنایا جائے اور یہ کام وکیل کے ہاں اس سے واپسی کے فوراً بعد کر لیا جائے گا۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے لیو جوئیر نے کانج سے گریجویشن کیا۔ اس کی شادی ہوئی اور وہ اپنی حاملہ بیوی کے ساتھ دیکھا جانے لگا جو ہنفرڈ کی آئندہ نسل کو اپنے رحم میں سنبھالے ہوئی تھی۔ ایلیٹ کو امید ہو چلی تھی کہ اس نئی ذمہ داری اور شراکت کے عمل کے بعد لیو جوئیر کے ساتھ اس کے تعلقات میں موجود تناؤ کا خاتمہ ہو جائے گا۔

لیکن ایک خوش آئند خیال سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اسی ہفتے کے اختتام پر جب ایلیٹ نے اپنی بیوی کو بڑے ہنفرڈ کے شراکت داری کے منصوبے کے متعلق بتایا اسے بڑے ہنفرڈ کی پیگم کی جانب سے ایک کال موصول ہوئی۔ وہ قطعی ہسٹریائی انداز میں اسے بتا رہی تھی کہ ایک گھنٹہ قبل کار کے حادثے میں ان کے شو ہمارے گئے ہیں۔

ایلیٹ سکتے کی کیفیت میں تھا۔ یہ حادثہ اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے اس کے والد کی جان گئی ہو۔ اس نقصان کے دکھ کے احساس نے اس کے پورے

وجود کو جکڑ لیا تھا۔ وہ صرف اس قدر سوچنے کے قابل تھا کہ اب وہ اس مہربان اور مشفق بوڈھے کو دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا اس بے وقت اور اس کے تقدیر سے روٹنے والی اس موت کے کیا عواقب ہوں گے۔ اس کے متعلق وہ سوچ نہیں پارہا تھا۔

ایلیٹ نے تدفین تک اسٹور کو بند رکھا۔ اس دوران وہ مالک کے بیٹے سے رابطے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے تدفین کے دوران لیو جوئیر کو دیکھا جو اسے بری طرح نظر انداز کرتا رہا۔

لیکن جس دن کاروبار کا آغاز ہوا وہ نو جوان ایلیٹ سے بات کرنے کا حریص نظر آیا۔ ایلیٹ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی جب اس نے جوئیر کو اپنے ڈیسک کی پشت پر بیٹھے اس فیصلے کی صبح کو دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایلیٹ کو بھی خوش گمانی نہیں تھی اور اس کے خدو خال سے بھی کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن لیو جوئیر نے اسے مزید حیرت میں ڈال دیا۔ جسے اس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

”صبح بخیر، مجھے تمہارا انتظار تھا۔“ بیٹے نے کہا۔

”کیا واقعی؟“

”جی ہاں تمہارے لیے میرے پاس کچھ بری خبریں ہیں“ نو جوان بیٹا تضحیک آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ وہ اس خوشی کو چھپا نہیں سکا جو اس لمحے اس پر طاری تھی۔

”کس قسم کی بری خبریں؟“ ایلیٹ نے استفسار کیا۔

”مکمل بدترین۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے گلابی دن پورے ہو گئے۔ تم اپنی ساری زندگی یہاں سے فوری سمیٹ لو۔ سب کچھ ختم۔ میں تمہارا چہرہ اس اطراف میں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا۔“



نازیہ بتول رضا کی شاعری کی کتاب  
”میری تکمیل تم سے ہے“ شائع ہو گئی ہے۔

قیمت = 200/-



”کیا؟“ اس کی آواز میں بے یقینی، دکھ اور تمام درد سمٹ آیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہونے والا ہے۔“

”آپ مجھے درخواست کر رہے ہیں۔ آپ مجھے یہاں سے نکال رہے ہیں۔“

”ارے ہاں، واقعی۔“

لیو جونیر اس موقع پر مسکرایا۔

غالباً یہ وہ مسکراہٹ تھی، وہ اظہار یہ تھا جو اس بیٹے نے پیش کیا۔ یاد وہ برسوں کی ناراضگی اور نفرت اور حقارت تھی جو اب پر بلبلوں کی صورت ظاہر ہوئے۔ ایلین یقین سے اس بارے میں نہیں جانتا تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ اب وہ اپنا انتقام اس تعلقہ نا تحقیق سے ضرور لے گا جو اس کے سامنے بیٹھا، لبوں پر طنز یہ مسکراہٹ سجائے دانتوں کی نمائش کر رہا ہے۔ اس لمحے اس شخص سے اسے جتنی نفرت تھی۔ اتنی اس نے ساری زندگی میں کسی سے نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے لیے اب ایک بڑی آزمائش کی ابتدا تھی۔

ایلین نے ہنفرڈ کے حوالے سے جہاں کہیں بھی ملازمت کی درخواست دی اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک ہمدرد آجرنے اسے رضا کارانہ طور پر بتایا کہ اسے لیو جونیر کی جانب سے اس کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچانی گئی ہیں جس سے ظاہر تھا کہ لیو جونیر نہ صرف اسے نوکری سے درخواست کر کے، بے عزت کر کے مطمئن نہیں ہوا بلکہ اسے مکمل تباہ کرنے کا عزم کیے ہوئے تھا۔

ایلین ایک لکڑی کے کندے کاٹنے کے کارخانے میں ماضی کے مقابلے میں نصف مشاہرے پر کام کرنے لگا۔ وہ ہمدرد بے شمار بلوں اور ادائیگیوں کے نوٹس کے تحت دبتا چلا گیا اس پر معاشی دباؤ بڑھتا گیا۔ سب سے پہلے اسے

اپنے بیٹے کو پرائیویٹ اسکول سے نکالنا پڑا۔ دوسرے مرحلے میں اسے اپنے مکان کے عوض قرض لینا پڑا۔ گاڑی بک گئی۔ فون منقطع ہو گیا۔ اس کی بیوی بری طرح بیمار ہو گئی۔ بالآخر اس کی ناکامی پر چراغ پارہنے لگی کہ وہ گھر کے اخراجات مناسب طریقے سے پورا کرنے کا اہل نہیں رہا۔ معاشی ٹھکڑے اس پر شدید تر ہوتا گیا۔ اسے لگا کہ وہ حواس کھو دے گا اگر اس نے دل کی ہنراس نکالنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔

وہ تو جہنم رسید ہو رہا تھا کیوں نہ کسی اور کو بھی اپنے ساتھ لیتا جائے۔

اسے انتقام لینا ہو گا لیو جونیر کو اپنی نا انصافی کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ اور اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا جیسا کسی نے آج تک نہیں بھگتنا ہو گا۔ اس طرح ایلین ایک تشدد گرداب میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ یہ اس کے روحانی اضطراب اور ذہنی تناؤ کی بنا پر تھا اور اسے یہ بھی احساس ہو چکا تھا کہ اب وہ اس گرداب سے کبھی باہر نہیں آ سکے گا۔

ٹکڑے جوڑ جوڑ کر تصویر مکمل کرنے والے کھیل میں آخری ٹکڑا جو اس کے ہاتھ میں رہ گیا تھا وہ عملی قدم تھا جسے اٹھا کر وہ پاگل پن کی اس تصویر کو مکمل کر سکتا تھا۔ یہ بات اس کے ذہن میں خود آ گئی جب اس کی بیوی نے بتایا کہ ایک روز قبل لیو جونیر کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔

خاموش قوت ارادی سے ایلین اپنے تہہ خانے میں گیا اور ایک خاص آلے کا انتخاب کیا۔ طوطے کی چونچ کی طرح نوکدار مضبوط دستانے والا خنجر جو ہنفرڈ ہارڈ ویئر ہی کا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا یہ خالص لوہے کا ہے، اپنا کام نہایت صفائی سے کرے گا۔

وہ گاڑی لے کر شہر کے مصافحات میں موجود

اسپتال تک پہنچ گیا۔

لفٹ کے ذریعے میٹرنی وارڈ تک آیا۔ ہال کی جانب پلٹے ہوئے قدموں سے، جیسے ایک باپ نومولود کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین۔ ایک لمحے کو رک کر اس نے اندازہ لگا لیا۔ وہ کسی کی توجہ کا مرکز نہیں تھا۔ وہ چلتا ہوا سپلائی روم کے دروازے تک آیا۔ چپکے سے اندر داخل ہو گیا۔ جلدی جلدی اس نے الماری سے لینن اور گون کا انتخاب کیا۔ وہ چیزی سے اپنا حلیہ بدل چکا تھا۔

”اب وقت آ گیا ہے۔“

اس چھوٹے سے ڈارک روم کے باہر چہل پہل میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایلین تیزی سے اٹھا۔ خنجر کو سرجن کے کون کے اندر چھپا کر۔ اس نے دروازہ کھولا اور خاموشی سے، چلتے پھرتے سفید لباس میں ملبوس نرسوں اور دوسرے کارندوں میں کوریڈر میں شامل ہو گیا۔

ہاں یہ مناسب ترین وقت ہے۔

وہ ہال سے گزرتا گیا۔ اس کے اطراف زچاؤں کے کمرے تھے اور آگے ششے کی کھڑکیوں سے مزین نرسری تھی۔ اس کا دل اس کے سینے میں جبکہ ہمیر کی طرح آواز نکال رہا تھا۔ لیکن یہ کسی خوف کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی فتح کے قریب پہنچنے کی سرشاری کی بنا پر۔ مجھے کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ یہ خیال، آگہی کا تئیں اسے پر اعتماد بنا کر کامیابی کی منزل کی جانب لے جا رہا تھا۔

اپنے مقصد کو پانے کے لیے، لمبے ڈگ بھرتا، اعتماد کے ساتھ اس نے نرسری کے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ ڈیوٹی پر موجود ایک نرس ایک چھوٹے سے ڈیسک کی پشت پر بیٹھی، فیشن میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی۔

”ایک منٹ ڈاکٹر، کیا میں آپ کی مدد کر سکتی

ہوں۔“

اس نے اطمینان سے مڑتے ہوئے نرس کے جڑے پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر نیچے ڈھیر ہو گئی۔ اس پر سے گزرتے وہ روشن روشن گرم کمرے میں تھا جہاں دو قطاروں میں چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے پالنے ترتیب وار رکھے تھے جس میں کم از کم بیس نومولود بچے تھے۔ ایلین جانتا تھا کہ اسے سب کچھ بہت جلد کرنا ہے۔

ہر بچے کی کلائی میں ایک بریسٹ تھا اب اسے فقط اس بچے کو تلاش کرنا تھا جس کے بریسٹ پر بن فورڈ لکھا ہو۔ کچھ ایسا ہی سوچتا وہ قدرے مضطرب اس نے قریب ترین پالنے میں چھوٹے سے ننھے اور گداز ہاتھ کو اٹھا کر، بریسٹ پر لکھے اعداد اور حروف کو کھنکھنے کی کوشش کی۔

”یا میرے خدا یا۔ یہ کسی قسم کا کوڈ ہے۔ نام تو لکھا نہیں۔“

اسے دروازے کے باہر کوئی تیز قدموں سے چلتا محسوس ہوا۔ وقت زیادہ نہیں تھا۔ مجھے جلد کچھ نہ کچھ کر لینا ہے۔ اس نے کانیں اٹھائیں اور اپنا عکس نرسری کے شیشوں پر دیکھا اور شیشوں کے پرے اسٹاف کے کئی لوگوں کا سایہ متحرک نظر آیا جو اسے خوف سے دیکھ جا رہے تھے چونکہ وہ خنجر لیے ہوئے تھا۔ متزلزل ہونے کی ضرورت نہیں۔ سوچو، جلدی سوچو کیا کرنا ہے؟“

ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس نے سامنے پالوں پر نظر ڈالی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ یقینی کامیابی کا ایک ہی طریقہ ہے۔

اس نے سوچا۔ وہ جیسے ہی پالنے پر چکا اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

☆☆☆☆☆

کراچی سے ارسال کردہ انتہائی عجیب اور مزاحیہ تحریر

## ڈاکے سے سیاست تک

مجموعہ مختلف مقامات پر اتر جائیگے، میں ایک لمبا چکر کاٹ کر لوٹی ہوئی رقم کے ساتھ اپنے فلیٹ کی

طرف آؤں گا اور ساری رقم چھپا کر رکھ دوں گا۔ دو تین ماہ بعد سب جمع ہو گئے اور.....

مجموعہ مختلف مقامات پر اتر جائیگے، میں ایک لمبا چکر کاٹ کر لوٹی ہوئی رقم کے ساتھ اپنے فلیٹ کی

### کرن شیر

مجموعہ مختلف مقامات پر اتر جائیگے، میں ایک لمبا چکر کاٹ کر لوٹی ہوئی رقم کے ساتھ اپنے فلیٹ کی

مجھے اس وقت کالے خان پر غصہ آرہا تھا، بہت شدید غصہ، کم بخت نے نہ جانے کس قسم کا ناکارہ لوگ میرے پاس لا کر میرے پاس جمع کر دیے تھے۔ ان میں سے ایک فضل دین تھا، جس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کی بیٹائی بھی کمزور معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہی ہو گیا تھا جب میں نے مصافحہ کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ اپنا ہاتھ دوسری طرف کر کے زور زور سے ہلا ہلا کر ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی“ بولتا جا رہا تھا۔

میں کالے خان کا ہاتھ تھام کر اسے ایک طرف لے آیا۔

”سب سے وقف! یہ تم کس کو لے کر آ گئے ہو؟ یہ بندہ میرے کس کام کا؟“

”باس یہ بہت زبردست ڈائیور ہے۔“ کالے خان نے بتایا۔ ”آندھی طوفان کی رفتار سے گاڑی چلاتا ہے۔“

”اور آندھی طوفان کی طرح گاڑی کو ٹکرا بھی دیتا

ہوگا۔“ میں نے جل کر کہا۔  
”نہیں باس۔ چالیس سال سے ڈرائیورنگ کر رہا ہے، صرف دو حادثے کیے ہیں۔ ایک بار دو تین بندے بھی مار دیے تھے۔ اور دوسری بار خود مرتے مرتے بچے۔“

”اور تیسری بار ہمیں مار دیے گا۔“  
”ایسا نہیں ہوگا باس۔ اسی گارنٹی میں دیتا ہوں۔“  
”اس کی تو آنکھیں بھی مزور معلوم ہو رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”صرف موتیا اتر رہا ہے۔ ڈاکٹر نے آپریشن کے لیے کہا تھا لیکن صرف ہمارے مشن کے لیے اس نے آپریشن ملتوی کر دیا ہے۔“

”اور وہ دوسرا؟“ میں نے کالے خان کے علاقے ہی کے ایک بندے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ لمبا چوڑا بندہ۔ وہ دیکھنے سے ہی خوفناک معلوم ہو رہا ہے وہ کس مرض کی دوا ہے؟“

”اس کا نام ہلاکو ہے باس، بہترین نشانے باز ہے۔ گولی اس طرح مارتا ہے جیسے لوگ گالیاں

مارتے ہیں۔ بس ایک کمزوری ہے کہ زرا اونچا سنتا ہے۔“

”کتنا اونچا؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔  
”زیادہ نہیں باس۔ بس تھوڑا چنچنا پڑے گا۔“ کالے خان نے مجھے تسلی دی۔ ”دیکھنے میں خواخوہار لگتا ہے مگر اندر سے اتنا ہی نرم ہے۔ گولیاں مار کر مرنے والے کی مغفرت کی دعا میں مانگتا رہتا ہے۔“

”اور وہ تیسرا؟“ میں نے تیسرے کے بارے میں پوچھا جس کی صورت ڈاکٹر فوٹو جیسی تھی معلوم ہو رہی تھی۔ لمبی سی ڈاڑھی جیسے گہری کی دم نک رہی ہو۔

”یہ کس کام کا ہے؟“ میں نے اس کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

”اس کا نام بالم ہے باس۔ یہ بہت زبردست کارنگر ہے۔ تالے کھولنے میں اس کا جواب ہی نہیں۔ بڑے سے بڑے تالے اور تجوریاں ایک اشارے میں کھول دیتا ہے۔ آٹھ بار جیل ج چڑھا ہے۔“

”واہ کیا ٹیم جمع کی ہے تم نے۔“ میں نے طنز کیا۔  
”آپ ان سے کام تو لیں باس۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ تینوں بہت ہی صابر اور شاکر قسم کے بندے ہیں۔ آپ ان کے حصے کے نام پر انہیں کچھ بھی دے دیں گے تو یہ ہنسی خوشی لے لیں گے۔“  
”ان کو بتا دیا ہے ناکہ کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ہاں باس۔ انہیں معلوم ہے کہ ہمیں بینک لوٹنا ہے۔“ کالے خان نے کہا۔

یہ میری ہی پلاننگ تھی، ایک بینک کو لوٹنے کی۔ یہ بینک ہمارے فلیٹ کے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ اس میں لوگوں کی آمد و رفت ابھی کم ہی تھی کیونکہ وہ ایک نئے بینک کی نئی شاخ تھی۔ اس کے دروازے پر ایک چوکیدار بٹھا رہا تھا۔ جس کے ہاتھ میں نہ جانے کس زمانے کی بندوق تھی۔ اس کے علاوہ بینک کا ایک ہی دروازہ تھا۔



صرف پانچ آدمی تھے۔ اس میں سے بھی دو عورتیں تھیں۔ اس عمل کو بہت آسانی سے قابو میں کیا جاسکتا تھا۔ پلاننگ یہ تھی کہ کالے خان اپنی گاڑی لے آئے گا۔ ہم سب کی چہروں پر نقائیں ہوں گی۔ گاڑی بینک سے کچھ فاصلے پر رک جائے گی۔ سب سے پہلے میں آگے جاؤں گا اور اس چوکیدار سے کچھ پوچھوں گا، اس کے بعد ہلاکو پیچھے سے آکر اسے قابو کر لے گا۔ ہم اسکو ریٹائل بنا کر بینک میں داخل ہوں گے۔ پھر کالے خان، ہلاکو اور بلم بھی بینک میں داخل ہو جائیں گے۔

ہم میں سے کسی کے پاس بھی اسلحہ نہیں ہوگا۔ ڈرانے کے لیے کھلونا پستولوں سے کام لیا جائے گا تاکہ کیس سرس نہ ہو پائے۔ پھر اس کے بعد وہی سب کچھ ہونا تھا جو فلموں وغیرہ میں دکھایا جاتا ہے۔ ہم بینک لوٹ کر فضل دین کے ساتھ بیٹھ جائیں گے۔ اور وہ گاڑی لے کر نکل چلے گا۔

ہم سب مختلف مقامات پر اتر جائیں گے۔ صرف میں ایک لمبا چکر کاٹ کر لوٹی ہوئی رقم کے ساتھ اپنے فلیٹ کی طرف آؤں گا۔ اور ساری رقم چھپا کر رکھ دوں گا۔ دو تین ماہ بعد سب جمع ہوں گے اور رقم کی تقسیم ہو جائے گی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کم از کم دو مہینوں تک اس میں سے کوئی رقم خرچ نہیں کرے گا۔

میری پلاننگ پریکٹ تھی۔ ہم نے مشکل کا دن مقرر کیا تھا۔ کیونکہ ایک نجومی نے بتایا تھا کہ اس قسم کے کاموں کے لیے مشکل کا دن بہت مبارک ہوا کرتا ہے۔

ہم مشکل دن کے ایک جگہ جمع ہوئے۔ یہ جگہ میرے فلیٹ کے علاوہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں اس وقت خود کو باس نہیں بلکہ بگ باس ہی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے سب ہی ساتھیوں میں نقائیں

تقسیم کرتے ہوئے کہا۔

وقت ہونے والا ہے، سب لوگ اپنی اپنی نقائیں پہن لو۔ ہم یہاں سے پیدل ہی جائیں گے کیونکہ بینک زیادہ دور نہیں ہے۔

”وہ تو ٹھیک ہے باس لیکن جب ہم نقائیں پہن کر ایک ساتھ باہر نکلیں گے تو جمع ہمارے پیچھے پڑ جائے گا۔ بچے تالیاں بجاتے ہوئے، نعرے لگاتے ہمارے پیچھے آجائیں گے۔ لوگ الگ شک کریں گے۔“ کالے خان نے کہا۔

”ہاں یہ تو صحیح کہہ رہے ہو تم۔“ میں اس کی بات سمجھ گیا۔ ”تو پھر کیا کیا جائے؟ نقائوں کا استعمال بھی تو ضروری ہے۔ ورنہ ہماری شکلیں سی سی وی کیمروں میں آجائیں گی اور ہم پکڑے جائیں گے۔“

”باس چونکہ تم نے پہلے کبھی بینک نہیں لوٹا اس لیے تمہیں طریقہ نہیں معلوم۔“ بلم نے کہا۔ ”طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کے دروازے پر نقائیں لگاتے ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے گردن ہلائی پھر ہلاکو کی طرف دیکھا۔ ”ہلاکو تم تیار ہونا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں باس میں بالکل بیمار نہیں ہوں۔ بس پرسوں تک کھانسی تھی، اب بالکل ٹھیک ہے۔“ ہلاکو نے کہا۔

”لعلت ہو۔ ابے میں بیمار نہیں، تیار ہوں پوچھ رہا ہوں۔ تیار۔ تیار۔“ میں چلایا۔

”نہیں بس اتنی بڑی مہم ہے۔ اتنا جوش ہے پھر بے زاری کس بات کی؟ میں بالکل بے زار نہیں ہوں۔“

”ابے یہ کس قسم کے بندے کو اٹھا کر لے آئے ہو؟ یہ بندہ تو میرا دماغ ہی خراب کر دے گا۔“ میں

نے کالے خان کی طرف دیکھا۔

”باس میں نے بتایا تھا نا کہ یہ آدمی زرا اونچا نسا ہے۔“ کالے خان نے وضاحت دی۔

”ابے اور کتنا اونچا سنے گا؟ کیا میں پہاڑ پر پڑھ کر آوازیں دوں اسکو؟“ مجھے غصہ آیا۔

”فکر نہ کریں باس۔ اس کا علاج میرے پاس ہے۔“ کالے خان بولا۔

”کیا ہے علاج؟“

”بھونپو۔“

”کیا بھونپو؟“

”ویسا ہی جیسا منجن پیچنے والے استعمال کرتے ہیں۔ ہلاکو کے لیے میں نے یہ پہلے سے ہی خرید کر رکھا ہے۔ وہ ہم ساتھ لے کر جائیں گے۔“ کالے خان نے حل نکالا۔

میں نے دل ہی دل میں کالے خان کو گالیاں دیتے ہوئے نقاب کی تقسیم شروع کر دی۔ پہلی نقاب کالے خان کو اور دوسری فضل دین کو دینے لگا تو اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر شروع کر دیا۔

”اسکو کیا ہو گیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں باس۔ اس کا موتی تنگ کر رہا ہوگا۔“

اس لیے آپکا ہاتھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“ کالے خان نے بتایا۔

”کالے خان خدا تم سے سمجھے، اس شخص کو میرا ہاتھ تک نہیں دکھائی دے رہا۔ یہ تو ہم سب کو گاڑی سیت جنم میں پہنچا دے گا۔“

”کچھ نہیں ہوگا باس۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس کی ساری حسیں کام کرنے لگتی ہیں۔ اس وقت یہ دوسروں سے زیادہ ہی دیکھنے لگتا ہے۔“

مجھے اپنی اس مہم کے آواراجھے نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو میں پھنس ہی چکا تھا۔

”چلو اب تم بلم کی خوبی بتا دو۔“ میں نے کالے خان سے پوچھا۔

”یہ تو بالکل ٹھیک ہے باس۔ دنیا بھر کے تالے منوں میں کھول دیتا ہے۔ بڑی بڑی ججوریاں اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ بس صرف اتنا مسئلہ ہے کہ اس کو کاندھوں پر اٹھا کر چلنا پڑے گا۔“

”کاندھوں پر اٹھا کر؟“ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بھا۔

”کاندھوں پر کیوں؟“

”کیونکہ یہ بے چارہ چل نہیں سکتا۔“ کالے خان نے دکھ سے بتایا۔

اس بار میرا دل چاہا کہ اس کم بخت کالے خان کا گلا ہی دبا دوں۔

”کالے خان!“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ہم بینک لوٹنے جا رہے ہیں یا معذوروں کا اسکول کھولنے؟“

”ارے آپ فکر نہ کریں باس۔ اس میں سے کوئی بھی ہمارے لیے بوجھ نہیں بنے گا۔ سوائے بلم کے۔ کیونکہ بلم کو آپ ہی کے کاندھوں پر سوار ہونا ہے۔“

”کیا پاگل ہو گئے ہو؟“ اس بار میں پھٹ ہی پڑا تھا۔ ”میں اس شخص کو اپنے کاندھوں پر بٹھا کر ڈاکہ ڈالنے جاؤں گا؟“

”یہ تو مجبوری ہے باس۔ کیونکہ اس کی ناک بہت اونچی ہے۔ یہ باس سے کم کے درجے والے انسان کے کاندھوں پر سوار نہیں ہوتا۔“

”دیکھو کالے خان! ہمیں بینک لوٹنا ہے۔ کوئی سرکس کا کھیل نہیں دکھانا۔“ میں نے چپ کر کہا۔ ”تم مجھے کن چکروں میں پھنسا رہے ہو؟ مجھے ایسی مہم نہیں چاہیے۔ لے جاؤ ان لوگوں کو۔“

”باس اب تو سب کچھ ہو چکا ہے۔“ کالے خان گڑبڑا کر بولا۔ ”اب ہم پیچھے ہٹے تو ڈاکوؤں کی



آنے والی نسلیں ہمارا مذاق اڑائیں گی۔“  
 ”اور اگر ہم اسی حال میں ڈاکہ ڈالنے پہنچے تو  
 موجودہ نسل مذاق اڑائے گی۔“  
 ”ایسا کچھ نہیں ہوگا باس۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ  
 ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔“ کالے خان نے یقین  
 دلایا۔

اب میں بھی سمجھ نہیں ہٹ سکتا تھا۔ کم بخت  
 بہت بری جوشن ہوئی تھی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے  
 ماندن والا معاملہ تھا۔ بہر حال ہوا یہ اس چکر میں  
 بینک کھلنے کا وقت آ گیا۔

ہماری پلاننگ کی مطابق ہمیں ٹھیک گیارہ بجے  
 بینک میں داخل ہونا تھا لیکن کھلنے کے دو گھنٹے بعد۔  
 میں نے اندازہ لگا دیا تھا کہ بینک میں گیارہ سے ایک  
 بجے تک لوگوں کی آمد و رفت کم ہوا کرتی تھی۔ البتہ  
 شام کے وقت تھوڑا رش ہو جاتا تھا۔

ایک بار میں نے دوبارہ پلاننگ دہرائی۔ ہمیں  
 کیا کیا کرنا ہے، کس طرح کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس  
 وقت فصل دین کی چیخ سنا دی۔ جو کچھ دکھانے کے  
 لیے ہمیں کھڑکی سے پاس بلارہا تھا۔ ہم سب جلدی  
 سے کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔

نیچے سڑک پر ایک حیرت انگیز منظر ہمارے  
 سامنے تھا۔ سینکڑوں لوگ اپنے ہاتھوں میں پلے  
 کارڈز اٹھاے چل رہے تھے۔ جن پر طرح طرح  
 کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ اور ایک بینر آل  
 پاکستان کرس ایسوسی ایشن کا تھا۔

یعنی کلرکوں نے اپنے مطالبات منوانے کے  
 لیے جلوس نکالا تھا۔ اور اس جلوس کی سب سے حیرت  
 انگیز بات یہ تھی کہ زیادہ تر لوگ نقاب پوش تھے۔

ایک بینر پر لکھا ہوا تھا۔  
 ”ہم سفید پوش لوگ شرمندگی سے اپنا چہرہ نہیں  
 دکھا سکتے۔ ہم نے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے اور اپنے دکھ

سامنے کر دئے ہیں۔“  
 یہ بینر پڑھ کر مجھے سمجھ آ گیا کہ ان سب  
 نقاب کیوں لگا رکھے ہیں۔  
 ”باس یہ بہت اچھا موقع ہے۔“ کالے خان  
 نے کہا۔  
 ”کس بات کا موقع؟“

”ہم بھی نقابیں باندھ کر ان میں شامل ہو جاتے  
 ہیں۔ اور بینک کے قریب آتے ہی بینک میں داخل  
 ہو جائیں گے۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ ہم نے  
 نقابیں کیوں پہن رکھی ہیں۔“ کالے خان نے مشورہ  
 دیا۔

”مگذا! یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔“  
 ”تو پھر اٹھا ڈاکو! اپنے کاندھوں پر۔“  
 ”یار کالے خان کیوں ناس کم بخت کو نہیں  
 چھوڑ دیا جائے۔“

”نہیں باس پھر بینک میں داخل ہونے کا کیا  
 فائدہ ہوگا؟ ہم وہاں تفرق کے لیے تو  
 نہیں جا رہے۔“ کالے خان کی بات درست تھی۔  
 مرنے کیلئے کرتا مجھے اس بلم کو اپنے کاندھوں پر  
 اٹھانا پڑا۔ میرے ہاتھ ہی میں بھونپو بھی تھا۔

سب سے آگے میں تھا۔ میرے کاندھوں پر بلم  
 تھا، اس کے بعد کالے خان پھر وہ دونوں۔ ہم سب  
 ہی نقاب میں تھے۔ کالے خان کی بات بہت  
 درست تھی کہ چونکہ پورا مجمع ہی نقاب پوشوں کا ہے  
 اس لیے کوئی خاص طور پر ہماری طرف دھیان نہیں  
 دے گا۔ اور واقعی کوئی بھی دھیان نہیں دے رہا تھا۔  
 ہم احتجاج کرنے والوں کا ہی ایک حصہ بن گئے  
 تھے۔

لیکن یہ صورتحال زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی  
 کیونکہ کچھ لوگ اس کم بخت بلم کی وجہ سے ہماری  
 طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ واحد آدمی تھا جو کسی کے

کاندھوں پر سوار تھا، یعنی ایک نقاب پوش کے اوپر  
 ایک اور نقاب پوش۔  
 اچانک ایک نقاب پوش نے ہماری طرف  
 اشارہ کیا۔  
 ”دیکھا یہ ہے جذبہ! ہمارا ایک کلرک بھائی اپنے  
 ایک معذور بھائی کو اپنے کاندھوں پر بٹھا کر لایا  
 ہے۔“

پھر ایک نے نعرہ لگایا۔ ”کلرکوں کا اتحاد!“  
 دوسرے نے زندہ باد کہا۔ پھر ایک نے میری  
 طرف اشارہ کیا۔

”بھائیوں ہمارا یہ جاں نثار کلرک بھائی اپنے  
 ہاتھ ایک بھونپو بھی لے کر آیا ہے۔ شاید یہ ہم سے  
 کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

آس پاس کے نقاب پوش کلرک زور زور سے  
 نالیاں بجانے لگے۔ میں اس صورتحال پر بوکھلا کر رہ  
 گیا۔ لوگوں نے شاید مجھے کرس ایسوسی ایشن کا کوئی  
 اہم امیدوار ہی سمجھ لیا تھا۔ اس لیے وہ سب کے سب  
 میرے گرد جمع ہو گئے۔ عجیب مضحکہ خیز صورتحال تھی۔  
 میرے چاروں طرف نقاب پوش تھے۔ اور اس بھیڑ  
 میں پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ میرے اپنے ساتھی  
 کہاں ہیں۔

ہمیں جس بینک میں ڈاکہ ڈالنا تھا وہ بھی  
 سامنے ہی تھا۔ لیکن میں بری طرح پھنس چکا تھا۔  
 بہر حال میں نے بھونپو ہاتھ میں لے کر تفریر شروع  
 کر دی۔ وہ مفلوج بلم بدستور میرے کاندھوں  
 پر سوار تھا، میرا خیال ہے کہ کسی لیڈر نے ایسی حماقت  
 انگیز چوٹن میں بھی تقریر نہیں کی ہوگی۔

بہر حال میں نے بولنا شروع کر دیا۔  
 ”میرے مظالم کلرک بھائیوں میں جانتا ہوں  
 کہ تمہارے ساتھ کیا گزر رہی ہے۔ تم لوگ کتنے  
 برے حال میں ہو۔ تمہارے گھر میں کھانے کو کچھ

نہیں ہے، چوبیس گھنٹے بچکے ہیں، تمہاری  
 بیویاں تمہاری مفکری کی وجہ سے گھروں سے بھاگنے کو  
 تیار ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا لیکن ظالم، بے رحم اور  
 بے درد حکمرانوں کو تمہاری حالت پر رحم تک نہیں آتا،  
 شرم نہیں آتی۔ ان لوگوں کو میرے کلرک بھائیوں یہ  
 تمہیں مار دینا چاہتے ہیں۔“

زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔ اس وقت میں  
 نے محسوس کیا کہ شاید میرے لیے یہ فیئلہ بہت  
 مناسب ہے، میں بہت اچھا سیاست دان بن سکتا  
 ہوں۔ میرے اندر واحد صلاحیت اس وقت سامنے  
 آرہی تھی۔ میں نے پورے جھوم پر جوش کر دیا تھا۔  
 لوگوں کو یہ تو نہیں معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور  
 میرا نام کیا ہے۔ اس لیے وہ کچھ اس قسم کے نعرے لگا  
 رہے تھے۔

ہمارا نقاب پوش بھائی زندہ باد! ہمارا گم نام بھائی  
 زندہ باد! زندہ باد! زندہ باد!“

میری سرشاری شاید کچھ اور دیر جاری رہتی لیکن  
 ہوا یہ کہ اس وقت پولیس نے ہم پر دھاوا بول دیا۔  
 پولیس والے لالچیاں برساتے ہوئے ہم پر حملہ آور  
 ہو گئے۔

بدقسمتی یہ تھی کہ ہمارے ارد گرد جو لوگ جمع تھے وہ  
 پولیس کو دیکھ کر فوراً ادھر ادھر ہو گئے۔ میرے  
 کاندھوں پر سوار بلم نے مجھے دو ہتھوڑا مارنا شروع  
 کر دیے تھے۔

”ارے باس بھاگو! بھاگو! ورنہ ہم پھنس  
 جائیں گے۔“

میں نے سوچا کہ کم بخت بلم کو نیچے گرا کر وہاں  
 سے بھاگ جاؤں۔ لیکن میں بھاگ نہیں سکا، پولیس  
 نے مجھے پکڑ لیا۔ صرف مجھے ہی نہیں بلکہ میرے  
 ساتھ وہ بلم بھی پکڑا گیا۔

عجیب صورتحال تھی، پورے مجمع سے صرف میں

## ”سچی کہانیاں“ اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے

ادارہ ”سچی کہانیاں“ اپنے قارئین کی سہولت کے لیے دفتر میں ایک ڈیسک قائم کر رہا ہے۔ آپ کو اگر ”سچی کہانیاں“ ملنے میں دشواری ہے تو بذریعہ فون یا میسج ہمیں مطلع کریں آپ کہیں بھی رہتے ہیں ادارہ آپ کے گھر کے پتے پر بذریعہ وی پی ”سچی کہانیاں“ ارسال کرے گا اس طرح آپ اور آپ کے پیارے ”سچی کہانیاں“ کے درمیان جو دوریاں پیدا کر دی جاتی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ ”سچی کہانیاں“ اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے۔

فوری رابطہ 021-35893121-22-23

موبائل نمبر 0304-3168708

کے پاس لے آیا۔ باس سے اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ اس کے علاوہ ہلاک اور فضل دین بھی اس میں شامل تھے غرض اس نے ساری پلاننگ بتادی۔ ”لیکن تم لوگ ڈاکہ ڈالنے کے بجائے کلرکوں کے جلوس میں پھنس گئے۔“ ایس ایچ او نے تبصرہ کیا۔ ”یہ ہماری بد قسمتی ہے جناب۔ یہ باس کا آئیڈیال تھا کہ سب کے چہروں پر نقائیں ہوں گی۔ اور ان جلوس میں شامل ہوں گے۔“

”اب تو بتا باس! تو وہاں تقریر کیوں کرنے لگا تھا؟“ ایس ایچ او نے میری طرف دیکھا۔

”قسمت کی خرابی اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرے باس بھونپو تھا اور یہ کم بخت باس میرے کاندھوں پر لوگوں نے مجھے تقریر کے لیے کہا اور میں مرنا کیا کرتا، اپنی جان چھڑانے کے لیے مجھے تقریر کرنا پڑی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میری تقریر کچھ زیادہ پر جوش ہو گئی جس کے نتیجے میں پولیس نے ہلا بول دیا اور میں یہاں تھا نے میں۔ اس کو کہتے ہیں کہ کھانا پیا گلاس تو ڈاکہ مار دے۔“

یہ احوال سن کر ایس ایچ او کے ساتھ ساتھ اس کمرے میں موجود سارے پولیس والے بھی زور سے ہنسنے لگے۔

کسی بھی ڈاکہ کی ایسی کہانی ان پولیس والوں نے کبھی نہیں سنی ہوگی۔ مگر قصہ مختصر یہ کہ کیونکہ ہم پینک لوٹنے کی پلاننگ کی تھی۔ ایک بڑا جرم کرنے کی کوشش کی تھی اسی بنیاد پر ہمیں عدالت نے ایک ایک سال کی سزا سنائی۔ کالے خان اور فضل دین کو گرفتار کر لیا گیا۔

اور اب میں اس ایک سال جیل میں بیٹھ کر نئی فیلڈ کے بارے میں سوچوں گا۔ جی ہاں آپ سمجھے۔ سیاست کے بارے میں پلاننگ۔

☆☆☆.....☆☆☆

اور باس ہی تھے۔ باس کو میرے کاندھوں سے اتار کر موبائل میں بٹھا دیا گیا۔

تمنا یہ تھی کہ گرفتار ہونے والا صرف میں تھا۔ شاید پولیس نے یہی مناسب سمجھا کہ مجمع میں سے کسی اور کو پکڑنے کے بجائے مجمع کے لیڈر کو ہی پکڑ لیا جائے۔ اور بد قسمتی اس وقت تقریر جھڑتا شخص میں ہی تھا جس پر لیڈر کا گمان ہوتا تھا۔

بہر حال ہم دونوں موبائل کے ذریعے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ اگر معاملہ صرف کلرکوں کے جلوس کا ہی ہوتا تو کوئی بات ہی نہیں تھی مگر وہاں پہنچنے پر صورتحال کچھ اور ہو گئی۔

پولیس کے خوف سے باس نے شور مچانا شروع کر دیا۔

”خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔ ہمارا کلرکوں اور ان کے جلوس وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”اگر تعلق نہیں ہے تو پھر تم دونوں نے یہ نقائیں کیوں لگا رہی تھی؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”جناب ہم دونوں تو پینک لوٹنے کے چکر میں نکلے تھے۔“ باس نے اگل دیا۔

”کیا؟ پینک لوٹنے۔“ ایس ایچ او سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ یہ بکواس نہیں جناب۔ سچ ہے۔“

”خاموش رہو۔“ میں نے باس کو ڈانٹا۔

”نہیں باس بتانے دو مجھے۔ میں اب اگلے سیدھے چکروں میں نہیں پڑوں گا۔ میں تو کسی اور کام سے تمہارے پاس آیا تھا یہ تم نے مجھے کہاں پھنسا دیا۔“

”بتا کس کام سے گیا تھا؟“ ایس او ایچ نے پوچھا۔

پھر باس کم بخت نے واقعی کم بختی کا ثبوت دیا اور پوری کہانی سنائی کہ کس طرح کالے خان اسے باس

## دینی سے ارسال کردہ

### مسلم خواتین



میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غم ناک بہت

نہیں ممکن مگر اس عقدہ مشکل کی کشود

اسلام نے خواتین کو وہ عزت اور مرتبہ دیا جس کی وہ حق دار تھیں ایک

بہترین تحقیقی مضمون سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے.....

تہینہ جلیل عظمیٰ

### تہینہ جلیل عظمیٰ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”دنیا کی چیزوں میں

مجھے خوشبو اور عورت پسند ہے اور نماز میری آنکھوں کی

عورت فضا کے عالم کی وہ خوبصورت قوس قزح ہے جس کے ایک ایک رنگ سے زندگی کے سو سو پھول پھولتے ہیں۔ جس کی سانس کار کہے کائنات کے سینے میں چلتی ہے۔ تو پھر صنف نازک پر یہ ظلم کیسا؟

مذہبی حلقہ کہتا ہے کہ عورت کو مرد کی اداسی کم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہزاروں سال زمین پر صرف مرد کی حاکمیت ہے عورت کو صنف نازک بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ عورت وہ کام نہیں کر سکتی جو ایک مرد کر سکتا ہے۔ عورت کو ”ناقص العقل“ بھی کہا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہزاروں سال سے عورت کا تسلط قائم نہیں ہو سکا اگرچہ زندگی کے تمام شعبوں میں عورت نے آگے بڑھنے

میں لڑکپن میں والدین کی، جوانی میں اپنے شوهر کی

روم میں مرد کی حکومت عورت پر انتہائی جاہلانہ مصلحت محض ایک لونڈی تھی اسے کسی قسم کا حق حاصل نہیں تھا وراثت میں کوئی حصہ نہیں تھا مرد جب چاہتا بیوی سے رشتہ توڑ لیتا اور اس کو مارتا پیٹتا، ایران میں عورت کو بیچارہ عیار اور بدچلن سمجھا جاتا اور حالت اتنی شرم ناک تھی کہ باپ اور بھائی اپنی بیٹی اور بہن کو اجیت میں لے لیتے۔ وہاں عورتی بیویوں کو چاہتے مادی کرتے اور طلاق دیتے۔ داشے عورتوں کو رخصتے کا

واج عام تھا۔ ہندو مذہب میں بھی عورت کی قابل نہیں سمجھی جاتی تھی اور نہ ہی اس کی زندگی خود مختار تھی، بدھ مت میں بھی عورت کو خوب برا بھلا کہا گیا۔ 586 میں نبی کریم ﷺ کی پیدائش کے 10 برس

تک یہ عالم تھا کہ یہ بات زیر بحث تھی کہ کیا عورت انسان ہے؟؟ بڑے مباحثے کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ یہ مان لیا جائے کہ وہ کوئی نجس حیوان نہیں ہے بلکہ مردوں کی خدمات کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

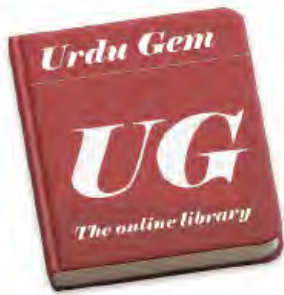
عرب معاشرے میں تو عورت کو ملکیت تصور کیا جاتا رہا مردان کا کوئی پاس ہی نہ رکھتا تھا لڑکی کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیا جاتا تھا قرآن پاک میں ان لوگوں کے جذبات کی یوں منظر کشی کی گئی۔

ترجمہ: اور جب ان میں سے کسی کی بیٹی ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ ”کالا“ رہتا ہے اور وہ عقدہ کھاتا ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بشارت کی برائی کے سبب کیا اسے کیا ذلت کہ ساتھ رکھے گا یا اسے مٹی میں دبا دیگا۔ خبردار بہت ہی برا حکم لگاتے ہیں“

یہودی مذہب میں عورت کو بدنیت اور مکار سمجھا







# UrduGem.com

## URDU KA KHAZAANA



جاتا تھا عیسائیت میں بھی عورت کے ساتھ یہودیت جیسی روش اختیار تھی بلکہ اور زیادہ ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔

مذہب اسلام میں عورت کو بہترین مقام پر فائز کیا گیا اس کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔  
اللہ کے نظام میں برابر کا درجہ دیا گیا

”تھن لباس لکم وانتم لباس لھن“  
یعنی وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

ایک اور جگہ فرمایا۔  
”دنیا ایک فلع کا سامان ہے اور دنیا کا بہترین سامان نیک اور صالحہ بیوی۔“

اسلام نے عورت کی عزت اور عظمت کا قائل کیا اور بتایا کہ اس کو کم حیثیت ماننا نوع انسانی کے لیے خطرہ اور نقصان ہے۔

آج ہم یہاں اُن چند مرتبت خواتین کا ذکر کریں گے جو نہ صرف خواتین بلکہ انسانوں کے لیے بھی باعث احترام اور فخر ہیں۔

حضرت مریم علیہ السلام:  
حضرت مریم علیہ السلام، حضرت عمران علیہ السلام کی بیوی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تھیں۔

آپ ایک انتہائی شریف، عقیقہ اور پارسا خاتون تھیں اور ہر وقت عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔  
قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت مریم کے پاس

حضرت جبریل تشریف لائے اور اللہ کے حکم سے ان میں ایک نئی روح پھونک دی اور وہ حاملہ ہو گئیں اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

آخری الہامی کتاب اور تمام آسمانی کتابوں میں اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت جبرائیل نے انہیں بیٹے کی خبر دی۔

قرآن حکیم کی پوری سورۃ حضرت مریم سے منسوب ہے  
اگر قرآن حکیم کے نزدیک عورت کا مقام مرد سے کمتر ہوتا اور اس کی عظمت اور بزرگی مرد کے مساوی نہ ہوتی تو قرآن پاک میں سورۃ مریم حضرت مریم کے

بجائے حضرت عیسیٰ کے نام سے منسوب کی جاتی۔  
کے علاوہ بیس مقامات پر قرآن کریم میں حضرت کا ذکر کیا گیا ہے

اللہ کی طرف سے بھیجے گئے فرشتے نے حضرت مریم سے طویل گفتگو کی اور قرآن میں اس کی وحی شہادت بھی موجود ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔  
”انہوں نے کہا۔“ بھلا میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے نہ مجھے کسی مرد نے چھوا اور نہ میں بدچل ہوں۔ فرشتے نے جواب دیا تمہارے پروردگار

کہا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے اور ایسا ہی ہوگا کہ ہم لوگوں کے لیے اس کو نشانی بنا دیں۔ یہ بات طے شدہ ہے۔ پھر مریم کو حمل قرار پایا پھر وہ اسے لیے کہیں دوڑ چلی گئیں۔ ان کو درد وزہ ہوا۔ وہ اس درد کے سبب ایک جھوٹے درخت کے نیچے چلی گئیں۔

کہنے لگیں کاش میں پہلے مرئی ہوئی اور لوگ مجھے بھلا چکے ہوتے۔ پھر فرشتے نے مریم کو پکارا اور کہا۔ تم مت گرو تمہارے پروردگار نے تمہارے قریب ہی ایک نہر جاری کر دی ہے تم اس جھوٹے تنے کو ہلا دو

اس سے تم پر تازہ جھورس گریں گی تم انہیں کھا دو اور اگر کوئی شخص تم سے بات کرے تو کہہ دینا۔ میں نے خدائے رحمن کے لیے روزے کی نذر مان رکھی ہے ان سے کہہ دینا آج میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔“

حضرت آسیہ علیہ السلام:  
حضرت آسیہ بنت مزاحم مصر کے بادشاہ فرعون کی بیوی تھیں۔ بہت پارسا اور ہمدرد خاتون تھیں۔ جب

موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی والدہ صاحبہ انہیں ایک صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں ڈال دی۔ تاکہ فرعون کو پتہ نہ لگ جائے اور وہ انہیں مل نہ دے۔ جب یہ صندوق فرعون کے گھر کے قریب پہنچا

آسیہ نے صندوق کو دیکھ کر اسے دریائے نیل کے کنارے پر رکھا اور اپنا بچہ نظر آیا تو بڑی محبت سے اس کی پرورش کی

آسیہ فرعون سے اپنا ایمان مخفی رکھی اور ہر وقت اس سے اس کے متعلق علم ہو گیا تھا۔

1۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

”اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے فرعون کی دیوی کی مثال بیان کی ہے کہ جب اس نے کہا اے میرے رب میرے لیے اپنے پاس جنت میں ٹھہرنا، اور فرعون اور اس کے عمل سے نجات نصیب فرما اور مجھے ظالموں کی قوم سے بھی نجات عطا فرما۔

2۔ ابو موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مردوں میں سے تو بہت سے درجہ کمال تک پہنچے لیکن عورتوں میں سے سوائے فرعون کی بیوی آسیہ اور مریم بنت عمران کے کوئی اور عورت درجہ کمال تک نہیں پہنچی، اور عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باقی سب عورتوں پر فضیلت ایسی طرح ہے کہ جس طرح شریہ

باقی سب گناہوں پر افضل ہے۔

3۔ ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین پر چار لکیریں لگائیں اور فرمانے لگے:

”کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟“ صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زیادہ علم ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”جنتی عورتوں میں سب سے افضل خدیجہ بنت نولید اور فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم اور مریم بنت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہا جمع ہیں۔“

4۔ انس بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

آپ کو (کمال کے اعتبار سے) دنیا کی سب عورتوں سے مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور فرعون کی بیوی آسیہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کافی ہیں۔ امام

ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

5۔ حافظ ابن حجر کا کہنا ہے:

فرعون کی بیوی آسیہ علیہ السلام کے فضائل میں سے ہے کہ انہوں نے دنیا کی ان نعمتوں کے بدلے میں جس میں وہ تھیں دنیا کے عذاب و تکالیف اور بادشاہی کے بدلے میں نل ہونا اختیار کر لیا اور ان

کی موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فراست کچی تھی جب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں (ان کو) دریا سے نکالتے ہوئے) یہ کہا یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

اسی طرح سورہ القصص اور سورہ تحریم میں حضرت آسیہ کا ذکر موجود ہے۔

حلیہ سعدیہ  
حلیہ بنت ابی ذؤبیب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی والدہ ہیں، بی بی ثویبہ کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ نے نبی آخرتک دودھ پلایا، اس

وقت آپ کے ساتھ عبد اللہ ابن حارث کو بھی دودھ پلایا، آپ کی بڑی بیٹی شہما حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گود میں کھاتی لوریاں دیتی تھیں۔ چار پانچ سال

حلیہ کے پاس بادیہ بنو سعد میں میسر رہے۔

حضرت خدیجہ کو یہ منقبت حاصل ہے کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہوئیں یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت اسلام تمام انسانوں سے پہلے انہوں نے قبول کی۔ ان سے پہلے نہ کوئی مرد اسلام لایا نہ عورت نہ

بوزہانہ بچہ۔

ایک مرتبہ حضرت خدیجہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کھانا اور سالن لے کر جا رہی تھیں ابھی پہنچنے ہی نہ پائی تھیں کہ حضرت جبریل آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ خدیجہ آ رہی ہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچ جائیں تو ان کو اللہ کا اور میرا اسلام پہنچا دیجئے اور ان کو جنت کا ایسا مکان مل جائے کی خوشخبری سنا دیجئے جو موتیوں کا ہوگا جس میں نہ ذرا شور و شغب ہوگا نہ

ذرا تکلیف ہوگی۔

جنت میں خلاف طبع آواز تو کسی کے کان میں بھی نہ آئے گی مگر خصوصیت کے ساتھ حضرت خدیجہ کو جو ایسے مکان کی بشارت دی گئی یہ غالباً اس لیے کہ دشمنان اسلام، اسلام اور داعی اسلام کے خلاف جو

طرح طرح کی باتیں کرتے تھے وہ ان کے کانوں پر نہ پڑتی تھیں ان کی وجہ سے جو سخت کوفت ہوئی تھی اس کی وجہ سے سلی دینے کیلئے یہ خصوصی بشارت دی گئی۔

جب تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں آنحضرت صلی



اللہ علیہ وسلم نے کسی اور عورت سے نکاح نہیں کیا۔

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا:

فاطمہ ہے۔ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کا معروف نام فاطمۃ الزہرا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خدیجہ بنت خویلد کی بیٹی تھیں۔

حضرت فاطمہ الزہرا رضی تعالیٰ عنہا کی ابتدائی تربیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی تعالیٰ عنہا نے کی۔ اس کے علاوہ ان کی تربیت میں اولین مسلمان خواتین شامل رہیں۔

بچپن میں ہی ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی تعالیٰ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے اسلام کا ابتدائی زمانہ دیکھا اور وہ تمام مکی برداشت کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدائی زمانہ میں قریش کے ہاتھوں برداشت کی۔

ایک روایت کے مطابق ایک دفعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ میں حالت سجدہ میں تھے جب ابو جہل اور اس کے ساتھیوں نے ان پر اونٹ کی اونچھری ڈال دی۔ حضرت فاطمہ رضی تعالیٰ عنہا کو خبر ملی تو آپ نے آکر ان کی کمر پائی سے دھو لی حالانکہ آپ اس وقت کم سن تھیں۔

اس وقت آپ روتی تھیں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو کہتے جاتے تھے کہ اے جان پدرو نہیں اللہ تیرے باپ کی مدد کرے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک فرشتہ جو اس رات سے پہلے کبھی زمین پر نہ اتر ا تھا اس نے اپنے پروردگار سے اجازت مانگی کہ مجھے سلام کرنے حاضر ہو اور یہ خوشخبری دے کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا اہل جنت کی تمام عورتوں کی سردار ہے اور حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ جنت کے تمام جوانوں کے سردار ہیں۔

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ میری جان کا حصہ ہے پس جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے شک فاطمہ سلام اللہ علیہا میری جان کا حصہ ہے۔ اسے تکلیف دینے والی چیز مجھے تکلیف دیتی ہے اور اسے مشقت میں ڈالنے والا مجھے مشقت میں ڈالتا ہے۔

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے شک فاطمہ سلام اللہ علیہا میری جان کا حصہ ہے۔ جس نے اسے ستایا اس نے مجھے ستایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثویبان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنے اہل و عیال میں سے سب کے بعد جس سے گفتگو فرما کر سفر پر روانہ ہوتے وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہوتیں اور سفر سے واپسی پر سب سے پہلے جس کے پاس تشریف لاتے وہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہوتیں۔

ایک اور مشہور حدیث (جو حدیث کساء کے نام سے معروف ہے) کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بیٹی چادر کے نیچے حضرت فاطمہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ و حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ بے شک اللہ چاہتا ہے کہ اے میرے اہل بیت تجھ سے رجس کو دور کرے اور ایسے پاک کرے جیسا پاک کرنے کا حق ہے۔

ایک دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت فاطمہ کو طلب فرمایا اور اپنے پاس بٹھا کر کان میں چند باتیں فرمائیں۔ حضرت فاطمہ رونے لگیں اور بہت مہلکین ہوئیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے کان میں دوبارہ ایک بات کہی۔

حضرت فاطمہ روتے روتے جب ہو گئیں اور مسکرانے لگیں۔ حضرت عائشہؓ نے بی بی فاطمہؓ سے جب استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ پہلی مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کان میں کہا تھا کہ جبرائیل سال میں ایک مرتبہ مجھ سے قرآن سناتا

ہیں۔ لیکن جبرائیل نے اس سال دو بار مجھ سے قرآن سنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سال رخصت ہو جاؤں گا۔ یہ سن کر میں رونے لگی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرگوشی میں فرمایا۔ اہل بیت میں سے تم سب سے پہلے مجھ سے ملاقات کرو گی۔ یہ سن کر میں مسکرا دی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ ماہ بعد حضرت فاطمہؓ اپنے والد گرامی کے پاس تشریف لے گئیں۔

خولہ بنت الازور:

خولہ بنت الازور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی ایک نمایاں خاتون تھیں حضرت ضرار کی بہن تھیں۔

آپ ایک عرب خاتون تھیں

آپ کو تیر اندازی میں مہارت حاصل تھی آپ اور آپ کہ بھائی خالد بن ولید کی قیادت میں رہے۔ خولہ بنت ازور عورت تھیں لیکن ان کی شمشیر خوار اشکاف بڑے بڑے چیلوں کا پتہ پائی کر دیتی تھے۔

خولہ بنت الازور بھی بہت دلیر مجاہدہ تھیں، جنگ اجتاد بن نقاب اوڑھ کر میدان میں مجاہدین کے ہمراہ برسرِ پیکار ہوئیں تو عیسائی ان کی خداداد جنگی صلاحیتیں دیکھ کر سمجھے کہ یہ خالد بن ولید ہیں۔ ان بہن بھائی نے لازوال داستانیں رقم کیں۔

پاکستان آری کے مایہ ناز نینک کا نام ضرار ہے، عراق کے عورتوں کی سب سے بڑی یونٹ خولہ بنت الازورؓ، سعودی عرب کے خواتین کی ٹریننگ کے سرکاری کالج کا نام بھی خولہ بنت الازورؓ ہے۔

رفیدہ ال اسلامیہ:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی ایک صحابیہ حضرت رفیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں جو کہ اسلامی تاریخ کی سب سے پہلی نرس خاتون تھیں۔ حضرت رفیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا پورا نام حضرت رفیدہ بنت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھا جن کا تعلق بنو اسلم سے تھا جو کہ مدینہ کے خضر قبیلہ کا حصہ تھا۔

حضرت ام رفیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مدینہ میں

آپ کی آمد سے پہلے پیدا ہوئی تھیں اور آپ ان جید صحابیات میں سے تھیں جو مدینہ میں سب سے پہلے اسلام لائے۔ حضرت ام رفیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان صحابیات میں تھیں جنہوں نے آپ کا مدینہ پہنچنے پر استقبال کیا۔

جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے تو انہوں نے انصار خواتین کا دل کھول کر خیر مقدم کیا۔ آپ ایک پیشہ ور نرس تھیں آپ کو طب میں مہارت حاصل تھی۔

یہی نہیں آپ نے انصار ساتھی خواتین کی بھی طبی شعبے میں تربیت کی اور انکو بھی ماہر بنایا۔

رفیدہ ال اسلامیہ اسلام کی پہلی نرس اور سماجی کارکن تھیں۔

وہ ایک منظم خاتون تھیں آپ نے مدینہ کے بے شمار لوگوں کی مدد کی۔ وہ بے شمار ضرورت مندین کی مدد کرتی تھیں اور معذور اور محتاجوں کے کام آتی تھیں۔ انہوں نے جنگوں میں شریک ہونے والوں کی اپنی طبی مہارت سے خوب مدد کی۔

ام عمارہ:

غزوہ بن عمرو کیساتھ بیعت عقبہ میں شرکت کی۔ بیعت عقبہ میں 73 مرد اور دو عورتیں شامل تھیں، ام عمارہ کا بھی انہی میں شمار ہوتا ہے۔

غزوہ احد میں شریک ہوئیں اور نہایت بامردی سے لڑیں، جب تک مسلمان فوج تھے، وہ مشک میں پانی بھر کر لوگوں کو بلارہی تھیں، لیکن جب شکست ہوئی تو آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہوئیں، کفار جب آپ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کا خود بیان ہے کہ میں احد میں ان کو اپنے دائیں اور بائیں برابر لڑتے ہوئے دیکھتا تھا۔ ابنِ قتیہ جب دڑاتا ہوا آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ گیا تو ام عمارہ نے بڑھ کر روکا۔ چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا، انہوں نے بھی تلوار ماری لیکن وہ دودھری زرہ پہنے ہوئے تھا اس لیے کارگر نہ ہوئی۔

بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے ایک کافر کو



قتل کیا تھا، اُحد کے بعد بیعت الرضوان، خیبر اور فتح مکہ میں بھی شرکت کی۔ ابوبکر کے عہد میں یمامہ کی جنگ پیش آئی، مسیلہ کذاب مدعی نبوت سے مقابلہ تھا۔ اُمّ عمارہ اپنے ایک لڑکے (حبیب) کو لے کر خالد کے ساتھ روانہ ہوئیں اور جب مسیلہ نے ان کے لڑکے کو قتل کر دیا تو انہوں نے منت مانی کہ ”یا مسیلہ قتل ہوگا یا وہ خود جان دے دیں گی۔“ یہ کہہ کر تلوار پھینک لی اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئی اور اس پامردی سے مقابلہ کیا کہ ۱۲ زخم کھائے اور ایک ہاتھ کٹ گیا، اس جنگ میں مسیلہ بھی مارا گیا کھاجاتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ خوفزدہ رہتی ہیں۔ ان میں بہادری کم ہوتی ہے۔

سودہ بنت عمارہ نے ابوسفیان سے بھرے دربار میں بے خوفی کے ساتھ بحث کی اور ایسے مسائل زیر بحث لائیں کہ شام کا حاکم جواب نہ دے سکا۔ انصاف نہ کرنے پر انہوں نے مقابلے کی دھمکی بھی دی۔ آخر کار ابوسفیان نے مجبور ہو کر سودہ بنت عمارہ کا مطالبہ پورا کیا۔ (العقد العزیز: جلد اول)۔

رابعہ بصری:  
قرون اولیٰ کی معروف صوفی شخصیت رابعہ بصری کی پیدائش عراق کے شہر بصرہ میں ہوئی۔ اسلامی ادب میں رابعہ بصری سے جزی بے شمار روحانی کرامات کے واقعات ملتے ہیں، اولیاء اللہ خواتین میں آپ کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ آپ قلندرانہ اوصاف رکھتی تھیں اور مرتبہ ولایت نہایت بلند تھا۔

اولیاء اللہ میں حضرت رابعہ بصری پیدا ہوئیں اور بے شمار خواتین پیدا ہوئیں بے شمار قلندر ہوئیں۔  
مس الدین صاحب فرماتے ہیں ”یہ ادھا قلندر کیا ہوتا ہے؟ ایک عورت نے اگر ایم۔ اے کیا ہے تو وہ آدمی ایم۔ اے ہے؟ ایک عورت اگر پی۔ ایچ۔ ڈی ہے تو وہ آدمی پی۔ ایچ۔ ڈی ہے؟ فرد نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی تو وہ پورا پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی؟ عورت ہو یا مرد۔۔۔۔۔۔ ہے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اس طرح قلندر، قلندر ہے۔۔۔۔۔۔ چاہے وہ

عورت ہو یا مرد ہو اور تاریخ پر چونکہ مردوں کا تہذیب رہا، اقتدار بھی مردوں کے ہاتھ میں رہا، بادشاہیں مردوں کے ہاتھ میں رہیں نتیجہ یہ نکلا کہ اولیاء اللہ خواتین کے نام بھی گئے چنے رہ گئے۔

قلندریت ایک صفت ہے جس میں بندے کی طرز فکر غیر جانبدار ہوتی ہے۔ ”قلندر“ ایسے ”صوفی“ کہ کہتے ہیں جس کی چشم حقیقت کے سامنے ہر شے کی حقیقت منظر بن گئی ہو۔ اور وہ مراتب اعلیٰ کو سمجھ کر ان میں عروج کرتا رہے۔ ”قلندر“ وہ ہے ”میں غرق ہو کر“ ”مرتبہ احدیت“ کا مشاہدہ برقرار ہے۔ مشاہدے کے بعد انسانی مرتبے پر واپس پہنچ کر ”عبدیت“ کا مقام حاصل کرے۔ جزو میں کل اور کل میں جزو کو دیکھے۔

یہ ایک روحانیت کا درجہ ہے جس کے لیے مرد اور عورت ہونا ضروری نہیں۔

رابعہ بصری کے والد کو خواب میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی اور انہوں نے رابعہ کے والد کو بشارت دی کہ ”تمہاری نومولود بیٹی، خدا کی برگزیدہ بندی بنے گی اور مسلمانوں کو کوچ راہ پر لے کر آئے گی۔“

کچھ عرصے بعد رابعہ بصری کے والد انتقال کر گئے۔ اس اثناء میں بصرہ کو سخت قحط نے اپنی پیٹ میں لے لیا۔ قحط کے دوران آپ (رابعہ بصری) اپنی بہنوں سے بچھڑ گئیں۔ ایک بار رابعہ بصری ایک قافلے میں جا رہی تھیں کہ قافلے کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور ڈاکوؤں کے سرغنہ نے رابعہ بصری کو اپنی تحویل میں لے لیا اور آپ کو لوٹ کے مال کی طرح بازار میں لوٹھری بنا کر بیچ دیا۔ آپ کا آقا آپ سے انتہائی سخت محنت و مشقت کا کام لیتا تھا۔

اس کے باوجود آپ دن بھر میں کام کرتیں اور رات بھر عبادت کرتی رہیں اور دن میں بھی زیادہ تر روزے رکھتیں۔ اتفاقاً ایک دفعہ رابعہ بصری کا آقا آدمی رات کو جاگ گیا اور کسی کی گریہ و زاری کی آواز سن کر دیکھنے چلا کہ رات کے اس پہر کون اس طرح گریہ و زاری کر رہا ہے! وہ یہ دیکھ کر حیران رہ

گیا کہ رابعہ بصری اللہ کے حضور سر بسجود ہیں اور نہایت عاجزی کے ساتھ کہہ رہی ہیں۔

”اے اللہ! تو میری سبجوں سے خوب واقف ہے۔ گھر کا کام کاج مجھے تیری طرف آنے سے روکتا ہے۔ تو مجھے اپنی عبادت کے لیے پکارتا ہے مگر میں جب تک تیری بارگاہ میں حاضر ہوتی ہوں، نمازوں کا وقت گزر جاتا ہے۔ اس لیے میری محذرت قبول فرما لے اور میرے گناہوں کو معاف کر دے۔“

اپنی کثیر کا یہ کلام اور عبادت کا یہ منظر دیکھ کر رابعہ بصری کا مالک خوف خدا سے لرز گیا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسی اللہ والی کنیز سے اپنی خدمت کرانے کی بجائے بہتر یہ ہوگا کہ خود اس کی خدمت کی جائے۔ صبح ہوتے ہی وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کیا۔ اس نے کہا کہ آج سے آپ میری طرف سے آزاد ہیں۔ اگر آپ اسی گھر میں قیام کریں تو میری خوش نصیبی ہوگی ورنہ آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں، تاہم اگر آپ یہاں سے کوچ کر جانے کا فیصلہ کرتی ہیں تو میری جس ایک درخواست ہے کہ میری طرف سے کی جانے والی تمام زیادتیوں کو اس ذات کے صدقے معاف کر دیں، جس کی آپ راتوں کو جاگ جاگ کر عبادت کرتی ہیں۔

بی بی رابعہ کو کسی نے بازار حسن میں فروخت کر دیا۔ خدا داد حسن کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ جو شخص نانکھ سے معاملہ طے کر کے رات کو جاتا وہ قحطی دیر بعد کمرے سے عجیب کیفیت کے ساتھ باہر چلا جاتا۔ کافی دن گزر گئے تو نانکھ نے محسوس کیا جو شخص ایک بار آتا ہے وہ واپس نہیں آتا۔

ایک رات اس نے چھپ کر کمرے میں جھانکا تو حیران رہ گیا کہ اندھیرے میں بی بی صاحبہ کا جسم نور کے جسم کی طرح روشن ہے۔ اس نظارے سے اس کی کیفیت غیر ہوئی۔ صبح سویرے بی بی صاحبہ کے پاس آئی اور قدموں میں گر کر معافی طلب کی، کہا، ”خدا را میرا قصور معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ آج سے آپ آزاد ہیں۔“

بی بی صاحبہ نے فرمایا۔ ”اری امتی! تو نے مجھے

آزاد کر کے جاری فیض کو ختم کر دیا۔“  
حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ایک بار نماز کے بعد میں بی بی رابعہ بصری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بی بی صاحبہ نے کھانا پکانے کے لیے گوشت باغی میں ڈال کر جو لیے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ ہم سے گفتگو میں مشغول ہو گئیں۔ نماز مغرب کے بعد بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ رات کے وقت آپ کھانے کے لیے روٹی اور پانی لے کر بیٹھیں تو اچانک باغی کا خیال آیا کہ اس میں بہت دیر سے ساکن پک رہا ہے اور خیال آیا کہ جل گیا ہوگا۔ دیکھا تو نہایت عمدہ گوشت نکلا ہوا موجود ہے۔ بی بی صاحبہ نے وہ گوشت ہمیں بھی کھلایا۔ ایسا لذیذ ساکن ہم نے بھی نہ کھایا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصری جذب کی حالت بصرہ کی گلیوں میں ایک ہاتھ میں شعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی لیے جا رہی تھیں۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ کیا کرنے جا رہی ہیں؟ تو رابعہ بصری نے جواب دیا کہ میں اس آگ سے جنت کو جانے اور اس پانی سے دوزخ کی آگ بجھانے جا رہی ہوں، تاکہ لوگ اپنے معبود حقیقی کی پرستش جنت کی لالچ یا دوزخ کے خوف سے نہ کریں، بلکہ لوگوں کی عبادت کا مقصد محض اللہ کی محبت بن جائے۔

حضرت رابعہ بصری دن رات کا اکثر حصہ نماز میں گزارتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ بخدا اتنی نماز کے قیام سے میری غرض ثواب حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ یہ چند لکھنیں اس لیے ادا کر لیتی ہوں کہ قیامت کے دن دوسرے انبیائے کرام کے سامنے سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ فرما کر سرخرو ہوں کہ یہ نماز میری امت میں سے ایک عورت کی ہے۔

حضرت رابعہ بصری سے کسی نے سوال کیا آپ نے شادی نہیں کی کیا آپ کو شیطان سے ڈر نہیں لگتا؟ حضرت صاحبہ نے فرمایا۔ ”مجھے رحمان سے ہی فرصت نہیں۔“ جب رحمان سے ہی فرصت نہیں تو شیطان کا خیال ہی نہیں آتا۔

☆☆☆☆☆

## یا کولڈ فیئر؟

آں..... چھوڑو میرا بازو، نہیں جانا میں نے، مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا، ڈر لگتا ہے، یہ کہہ کر وہ اندر بھاگی تو بھائی دکی نے کہا بیٹا، جو ادھیک کہہ رہا ہے، تمہیں ساتھ جانا ہوگا، اور ڈرنے کی ضرورت نہیں، ہم سب ساتھ ہی تو ہیں، یہ کہہ کر وہ.....

(آخری قسط)

شبکہ مظہر راٹھیا

کیا تو بہت کچھ ہے ایویں تو میری بہن، بچاری کا دماغ خراب نہیں ہوتا ناں، لاہور جانا ہے تو پلٹ کے خبر تک نہیں لیتا، خرچہ نہیں بھیجتا، بچے بچارے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں، امی تو شروع ہو گئیں لیکن میں نے ٹوک کے پھر سوال داغا، لیکن یہ یہاں کیوں نہیں رہتے؟ ان کو چاہئے کہ اپنے بیوی بچوں کے پاس رہیں، ارے وہی تو بتا رہی ہوں ناں، یہاں لوگوں سے قرضہ لے کر بھاگا ہوا ہے، لاکھوں روپے ہمارے بھائیوں کے نام پہ لوگوں سے قرضے کے نام پہ بٹورے ہوئے ہیں، پٹھانوں کے پیسے دینے ہیں شہر میں سب کے سامنے داخل ہوتا گیا تو چڑا جائے گا، کتنے لاکھ تو بھائی غفور نے اس کا قرضہ اتارا ہے یہ پھر چڑھا لیتا ہے، اور نویدہ کو اندر سے وہی غصہ ہے اس کھٹو پہ، آں۔۔۔ پھر تو خالہ گچی ہے بھی، ہانڈی چڑھاتے ہوئے میں نے خالہ سے ہمدردی کی، لیکن کان اوپر سے آنے والی آوازوں پہ لگے ہوئے تھے کافی شور و غوغا

کیونکہ کھانا بنانا تھا، میں نے روٹی تو بے پڑا لی اور دوسرا بیڑا بنانے لگی اسی اثناء میں پھر حزرہ بھاگتا ہوا آیا، آخنی آخنی خالہ نے اوپر آگ لگا دی ہے، ہائے میرے اللہ، خالو عنایت کو آگ لگا دی کیا؟ جی خالو کو کپڑوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ حزرہ پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا لیکن میں ساس کو آوازیں دینے لگی وہ کمرے میں جا چکی تھیں، میں پیچھے بھاگی امی امی اوپر جانیں فوراً، حزرہ کہہ کر گیا ہے کہ خالہ نویدہ نے خالو عنایت کو آگ لگا دی ہے، خالہ ساجدہ اپنے گھر کپڑے لینے گئی ہوئی تھیں، امی اور میں اوپر بھاگیں کیونکہ واقعتاً جلنے کی بو آ رہی تھی۔ جب اوپر پہنچی تو میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، خالہ نے سچ سچ آگ لگا لی ہوئی تھی اور اس قدر زیادہ آگ تھی کہ شعلے لپک کر



کو جلایا ہے، آپ اور امی کمال کرتی ہیں، وہ زندہ سلامت اندر بیٹھا ہوا ہے، علی بھی ہمارا شور سن کر پاس آ گئے، ہم دونوں حیران ہو گئیں، پھر خجالت سی محسوس ہونے لگی کہ بچے کی بات کو لے کر اتنا شور مچایا وہ واپس پلٹ گیا تو ہم دونوں بھی مطمئن ہو گئیں، جو ادنیٰ علی کو ہمارا بلند رستایا تو وہ ہنسنے لگے، ادیار خالو کو اندر بٹھایا ہوا ہے۔ میں نے بات کاٹ کر پوچھا تو پھر یہ کیا جمل رہا ہے؟ میں خالو کو خود دیکھنا چاہتی ہوں، ارے نہیں نہیں ابھی ان سے تم نہیں مل سکتی، بچے چلو میں آ کر سب بتاتا ہوں، کہتے ساتھ ہی مجھے سیڑھیوں کی طرف موڑ دیا مجبوراً میں ڈھیلے قدموں سے پھر واپس آ گئی

☆.....☆.....☆

بعد کے واقعات کے مطابق علی نے بتایا کہ خالو عنایت کو جب خالہ نویدہ پتھر اور اینٹیں مار مار کر تھک گئی تو بار پھر بھی نہیں مانی، دائیں سائیڈ کی دیوار کی بڑھی ہوئی اینٹوں سے اوپر چڑھنے لگی اس کوشش میں کتنی ہی بار گری کبھی بالائی اور کبھی نیچے پھلا گئی، ہم سب منع کرتے تو ہمیں چھڑی لے کر پڑ جاتی، آخر وہ کی بھائی نے کہا خالہ ہم خالو کو نیچے لے آتے ہیں لیکن ایک شرط پر؟ کیا شرط ہے تیری نکلو؟ خالہ نے وہی بھائی کے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کیا، ہم پھپھسی ہنسی ہنس پڑے تو انھوں نے شرمندہ ہو کر کہا خالو کو اس شرط پر نیچے لایا جائے گا کہ تم اسے کچھ نہیں کہو گی، منظور ہے؟ میں اسے جلا دوں گی، یہ بہت برا ہے، اس نے شدید غصے سے جواب دیا، جب بلال نے کہا تو پھر ٹھیک ہے خالو کو ہم چھت کے اوپر سے بھاگ دیتے ہیں، خالہ کسی شعلے کی طرح اس کی طرف لپٹی ہی تھی کہ خالو علیم نے خالہ نویدہ کو ڈانٹا، اپنی حد میں رہو اور اس بات کی گارنٹی دو کہ عنایت

کو کچھ نہیں کہو گی پھر وہ نیچے آئے گا اور ہم اسے کوئی اور سزا دیں گے، خالہ نے سر نیچے کر کے خاموشی اختیار کی جس کا مطلب تھا کہ وہ ہماری بات مان رہی ہے، جیسے ہی خالو عنایت کو نیچے اتارا گیا خالہ نے اچانک اس پر جھپٹا مارا اور سیدھا اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا ہم سارے ہونٹوں کی طرح یہ سب ہوتا دیکھ رہے تھے، کہ خالہ نے اس کا گریبان چاک کر ڈالا، وہ خالو کو ایسے بھنبھوڑ رہی تھی کہ گویا مار ہی ڈالے گی بازوؤں سے بھی لمبیں تار تار ہو گئی اور ساتھ ہی اس نے خالو کی شلوار کے پانچے بھی اوچھڑ ڈالے، ہم لوگ حیران تھے کہ بظاہر تو خالہ ہاتھوں سے حملہ کر رہی ہے لیکن یوں کپڑے پھٹنے لگتا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں چھریاں لگی ہیں، خالہ جب شلوار کے پانچے پڑی تو خالو عنایت آگے بھاگ پڑا، خالہ پیچھے پیچھے، اور ہم سب کانپ کانپ کر برا حال تھا، اوہ وہ تو اس کی عزت کی دمن بن گئی، آپ نے روکا نہیں خالہ کو؟ میں نے غصے سے کہا تو علی کہنے لگے ہم کیا روکتے اسے، یوں لگتا تھا کہ خالہ کے ہاتھ میں کوئی نادیہ چھری ہے جو کسی کا سینہ بھی چاک کر دے گی، اس لیے ہم نے خالو کو ایک بھیا تک مشورہ دیا، کیا؟ میں نے ہولناک انداز سے پوچھا، وہ یہ کہ خالو اپنے کپڑے خالو کو اتار کے دے دیں، چھی چھی، اتنے گندے مشورے؟ ضرور آپ نے ہی دیے ہونگے، میں نے ٹک بھری نظروں سے علی کو دیکھا تو وہ تمللا ہی گئے، بیوی صاحبہ، ہم سب نے یہ فیصلہ خالہ کی نفسیات کے پیش نظر کیا تھا، اس لیے کہ وہ بار بار کہہ رہی تھی میں عنایت کو جلا دوں گی، اور جب وہ اس کے کپڑوں کو جلائے گی جو کہ پہلے ہی پھٹ چکے تھے تو خود بخود اسے سکون آ جائے گا، اس

لیے اور والے کمرے میں خالو کو گھسا کے اسے وکی کے کپڑے دیے اور خالو کے کپڑوں کے سارے ٹکڑے خالہ نویدہ کے حوالے کر دیے اس نے فحاش کام والے میلے کپڑوں کو آگ دکھائی اور ساتھ ہی خوشی سے نعرے مارنے شروع کر دیے کہ میں نے عنایت کو جلا ڈالا ہے، اسی اثناء میں تم اور امی اوپر آ گئے اور باقی کہانی وہی ہے یہ سب سن کر مجھے تو خالہ نویدہ سے شدید خوف محسوس ہوا کیونکہ وہ تو کسی کو بھی آرام سے مار ڈالے اور ٹینشن بھی نہ ہو، جبر جبری آتے ہی میں اپنے آپ میں سمٹ کر سونے لگی کیونکہ صبح بھی ٹائم سے اٹھنا تھا

☆.....☆.....☆

زندگی جب ڈھنگ نہ تھی، نہ کوئی سکون تھا اور نہ ہی خوشی تھی، گھر میں پریشانیوں کا ڈیرا تھا، خالہ ساری رات بین کرتی تھی، نہ خود سوتی تھی اور نہ ہمیں سونے دیتی، اونچا اونچا روتی رہتی، خالو عنایت کو اب بھی بہت اذیت دیتی تھی، کبھی کبھی کھڑے ہو جاؤ اور کبھی کبھی بیٹھے رہو، ایک دن تو اس نے حد کر دی، دوانی کھانے لگی تو خالو عنایت نے پانی کا گلاس پکڑ لیا، بس بیٹھے بٹھائے خالہ کا دماغ گھوما اور اس کو سمیٹنے سے پکڑ کر پاس بٹھا لیا، ہاں اوئے تو مجھے دوانی کھلاتا ہے؟ تیرے کہنے سے میں دوانی کھا لوں گی؟ نہیں ابھی نہیں، میں یہ دوانی آج تیرے سنکھے (حلق) میں اتاروں گی، اس پر وحشت طاری ہوئی اور خالو کو چار پائی یہ بٹھا کے خود کھڑی ہو گئی، پڑیا پہلے سے کھلی ہوئی تھی اس نے سر کے پیچھے ہاتھ رکھ کے خالو کو رعب سے کہا عنایت منہ کھول، خالو جی تھوڑا جھجکے تو خالہ نے دوسرے ہاتھ سے جبڑے پکڑ کے خود کھولے اور دوانی حلق سے پار ہو گئی خالو

ترپنے لگے۔ عنایت ہوش کر، ساری دوائی کھا، ابھی تو ایک خوراک رہتی ہے، اٹھ جا شربت پی، لیکن خالو دنیا فینہا سے بے خبر ہو گئے، ان کی گردن ڈھلک گئی اور آنکھیں بند ہو گئیں، ہائیں اسے کیا ہوا؟ سوچی گیا، اس دوائی میں اتنا سکون ہے تو پہلے ہی لے لیتا ایک خوراک، جاہل آدمی۔۔۔۔۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر کی طرف چل دی۔

☆.....☆.....☆

تقریباً ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا، آرام آ کے نہیں دے رہا تھا، ہم روحانی علاج کروا رہے تھے لیکن پیر فقیر بھی ہمیں تو لوٹنے والے ہی لے، کوئی کہتا کہ انھیں پھل پیری چڑیل ہے کوئی کہتا کہ خالہ نویدہ کے ساتھ پوری سوا لاکھ جنوں کی پھھی ہے، کسی نے کہا کہ خالہ کسی کچی جگہ (جہاں جنوں چڑیلوں کے ڈیرے ہوتے ہیں) سے گزری ہے یا اس سے کوئی بے ادبی ہوئی ہے، غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور جتنی بیماریاں اتنے علاج بتائے جاتے، ہم لوگ اکتا گئے لیکن خالہ کے جوش جذبے میں ابھی تک فرق نہیں آیا تھا، جس گھر میں خالہ رہتی تھی وہاں کسی بزرگ کے زمانے سے پرانا پتیل لگا ہوا ہے، سنا ہے ایک کھمستان نامی بزرگ نے وہ درخت لگایا تھا، وہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک بار اس درخت والی جگہ پہ وہ بابا جی بیٹھے ہوئے غالباً اپنے مویشیوں کے لیے کلمہ گاڑ رہے تھے ان کا یہ رویہ سن کر کام تھا، پاس سے کچھ ہندو عورتیں گزریں اور مذاق سے کہا بابا جی آپ تو ادھر کلمہ اس طرح روز گاڑتے ہیں جیسے یہاں کلمہ نہیں پتیل کا درخت اگے گا، یہ کہہ کر وہ ہنسی کھٹھول کرتی آگے چلی گئیں لیکن بابا جی نے لوگوں کے سامنے جلال میں آ کر کہا کہ اگے تے



نہیں پر ہن کڑیے اچھے پیتل ای اگے گا، وہ بانی  
بھر کر واپس آئیں تو ٹھیک اسی جگہ ہرا بھرا گھٹنا  
پیتل کا درخت آگ کھڑا تھا، تب لوگوں کے  
سامنے بابا جی کا پردہ ظاہر ہوا، زمانے بیٹے لیکن  
اس درخت کو وہاں سے کوئی بھی اکھاڑ نہ سکا بلکہ  
اس کی چھال کو بانی میں بھگو کر رکھیں اور وہ پانی بعد  
از کچھ وقت پلے گئیں تو دائمی بخار سے آرام آ جاتا  
کرتے کرتے وہ گھر خالہ نویدہ کے والد نے خریدا  
اور وہی پیتل کا درخت آج خالہ نویدہ کے گھر میں  
تھا، سنا ہے کہ وہاں متعدد بار کسی بزرگ کو دیکھا گیا  
ہے چھت پہ اس پیتل کی چھاؤں میں بھی  
بیڑھیوں میں، بھی درخت کے اوپر، کئی دفعہ بچوں  
کو اس بزرگ نے کھانے کی چیزیں بھی  
دیں، ایک بار کی تو میں خود گواہ بھی ہوں، خالہ  
نویدہ کے گھر میلاد پہ ہم لوگ گئے تھے راولپنڈی  
سے مہمان آئے ہوئے تھے انکے بچے چھت پہ  
کھیل رہے تھے میلاد ختم ہونے والا تھا ابھی کھانا  
کسی کو بھی نہیں ملا تھا، بچے چھت سے نیچے آئے تو  
ان کے ہاتھوں میں بہت سی کھانے کی چیزیں  
تھیں، ان کی ماں کی نظر پڑی تو اس نے ڈانٹا خاور  
یہ کس نے چیز لے کر دی ہے؟ تم نے پھر کسی سے  
پیسے لے کر چیز لی ہے؟ نہیں امی مجھے تو بابا جی نے  
چیز لے کر دی ہے۔ ہائیں، کون سے بابا جی؟ امی وہ  
چھت پہ بیٹھے ہیں ان کی بہت سفید داڑھی ہے  
آئیں میں آپ کو دکھاتا ہوں، اس کی امی ساتھ گئی  
کہ دیکھو تو وہی کون سے بابا جی اس پہ مہربان ہو  
گئے ہیں، جا کر دیکھا تو چھت خالی تھا کوئی بابا جی  
نہیں پہ بھی نہ تھے، جب انھوں نے نیچے آ کر یہ  
واقعہ سنایا تو خالہ نویدہ کے گھر والوں کے ساتھ  
ساتھ محلے والوں نے بھی گواہی دی کہ یہ بابا  
گھرستان ہیں کیونکہ وہ متعدد لوگوں کو بے خبری

دیکھا تو ہنسنے لگے، جو اد میاں تم ڈراؤنے کم اور  
مزاحیہ زیادہ لگ رہے ہو اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تم  
سے خالہ نویدہ کے جن در جائیں گے تو یہ تمہاری  
بھول ہے بچے، چل خالہ کی ویسے ہی منت ساجت  
کریں علی نے ناسخا نہ انداز سے کہا اور اٹھ  
کھڑے ہوئے، ان کی باتیں سن کر جواد کے  
چہرے پہ مایوسی پھیل گئی، چپ چاپ دونوں خالہ  
والے کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں انکے داخل  
ہوتے ہی بھونچال آ گیا، خالہ نے بہت عجیب  
حرکت کی، ہنسی پہ بیٹھے بیٹھے نیچے فرش پہ چھلانگ  
لگائی اور سیدھا جواد کے قدموں میں جاگری  
، مرشد مرشد میرے مرشد میں آپ کو ہی یاد کر رہی تھی  
، آپ کہاں چلے گئے تھے؟ ان لوگوں نے مجھے  
بہت ستایا ہے، میں آپ کی ہر بات مانوں گی میرے  
بچے چھت پہ لٹکے ہوئے ہیں آپ ان کو قید سے  
چھڑائیں میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گی  
، میرے تن بھاگ میرے مرشد، میرے تن بھاگ  
میرے سائیں۔۔۔۔۔ مجھے یہاں سے دور لے  
جائیں میں آپ کی باندی ہوں میں آپ کی داسی ہوں  
میرے آقا چلو چلیں یہاں سے دور چلیں، آ آپ  
مجھے لینے آئے ہیں ناں، اس کی تو حالت سمجھ سے  
باہر تھی، جواد اور علی بھونچکے کھڑے تھے سارے گھر  
والے یہ تماشا دیکھ کے ششدر ہو گئے، وہ آہ و  
زاری کرتی رہی، ہاڑے ڈالتی رہی۔ اور تبھی علی  
نے جواد کے کان میں کہا یا تم نے کیا ڈرامہ کرنا تھا  
ادھر تو دنیا سین شروع ہو گیا ہے، تجھے تو بیٹھے  
بٹھائے فقیری مل گئی ہے، بڑے ٹکڑے مرید ملے  
ہیں، او بھائی علی یا کیا آئیڈیا دیا ہے، بس آپ  
چپ رہنا، جواد نے نظر بھر کر خالہ کی طرف دیکھا  
جو کہ اس کے پاؤں میں لوٹ رہی تھی، اور بھی اس  
کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا، وہ دیوانہ دار اور پرہو کر اپنے

مرشد کا ہاتھ چومنے لگی، میں صدقے میں داری  
میں قربان میرے پیر پہ میں ان سب کی جان  
قربان کر دوں اس نے ہم سب کی طرف اشارہ  
کیا تو ڈر کر ہم چند قدم پیچھے ہو گئے، بھلا ہماری  
جان کیوں قربان کر دے گی، اپنی کرے ناں،  
اب جواد پہ سب کی نظریں گڑی ہوئی تھیں کہ پتہ  
نہیں اس نے کیا سوچا ہوا تھا جو یہ واقعی پیر بن گیا  
تھا، اس نے ایسے ہی جی سی کالی چادر اوڑھ رکھی  
تھی اور اس میں سے ذرا سامنے نکال کر دیکھ رہا تھا  
، اے نویدہ بی بی چل اٹھ کھڑی ہو جا، بڑے نالک  
کر لیے ہیں تم نے، اس نے موٹی آواز نکال کر کہا  
تو ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی لیکن حیرت کی بات تھی  
کہ اب کی بار خالہ نویدہ نے ہماری ہنسی کو نوٹس  
نہیں کیا تھا۔ اچھا سہ کار جی میں کھڑی ہو گئی ساتھ  
ہی خالہ تن کرونیوں کی طرح کھڑی ہوئی، ان کی  
یہ حرکتیں دیکھ کر ہم ہنسنے ہنسنے پاگل ہو رہے تھے  
، میں نے غور کیا کہ جواد بھی اندر سے مسکرا رہا تھا  
، اسی لیے اس نے منہ پہ شال کر رکھی تھی، نویدہ  
میں تجھے جو حکم دوں گا تو مانے گی؟ جواد نے بھاری  
آواز سے پوچھا۔ جی مرشد آپ کہو نویدہ کنوئیں  
میں چھلانگ لگا تو نویدہ ذرا بھی دیر نہیں کرے گی  
، چلو پھر ایک جگہ جانا ہے تیری کرو ہمارے پاس  
وقت کم ہے، یہ کہہ کر جواد کمرے سے نکلا بمشکل  
ہنسی روکتے ہوئے جدھر ہم سب تھے ادھر آ کے  
شال اتاری اور پرے پھینک دی، ہم سب اس پہ  
جھپٹ پڑے، جواد تم نے تو کمال کر دیا اتنی بڑی  
بلا کو چھوٹے سے نالک سے قابو کر لیا، اور پتہ ہے  
تم تو ایکٹنگ بھی خوب کر رہے تھے میں نے داد  
کے ڈونگرے برسائے تو خالہ کہتی واہ جواد  
ادا کاری تو کوئی تم سے سیکھے، امی کو تو تم نے اپنا  
دیوانہ بنا لیا ہے۔ ہنن، ہے جو سدا کا ڈراے





ہے، کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا، آخر رعب دار آواز میں بولا، اے نویدہ۔۔۔ چل پیچھے سے اٹھ ادھر کرسی پہ بیٹھ کے غور سے میری بات سن، نہیں سرکار نہیں، پہلے اس کو واپس بھیجیں، جواد کو غصہ آگیا، تیرا یہ دل ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی یہاں سے چلا جاؤں؟ جواد کے اس طرح مصنوعی غصہ کرنے سے ہم لوگوں کا ہنستہ ہنستہ برا حال ہو رہا تھا، نہیں نہیں، سرکار آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے، میں آپ کی بات مانوں گی، وہ سرعت سے کرسی پہ جا بیٹھی اور برداشت کرتے کرتے ہمارے منہ سے ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑے، کان کھول کر میری بات سنو، اس بندے نے تجھے کچھ بھی نہیں کہا، یہ میرے ساتھ ہی ہوتا ہے اور جو پڑھ رہا ہے ہم نے ہی کہا ہے کہ پڑھ کے تجھے یہ دم کرے، اس دوران اگر تجھے کوئی پریشانی آتی ہے تو اس میں تیرا ہی فائدہ ہے تھیلے، آخری بات کہتے کہتے جواد نے لہجہ دھیمہ کر لیا اور خالہ نویدہ کے کان کے ساتھ منہ لگا کے نہ جانے آہستہ آہستہ کیا کہا کہ وہ ناصر ف رام ہوگئی بلکہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے نیم دراز ہوگئی، مرشد پاک! آپ بھی میرے پاس بیٹھ جائیں مجھے اس کالے منہ والے پہ یقین نہیں ہے یہ کچھ الناسید حانہ پڑھے آپ میرے پاس ہی بیٹھ جائیں خالہ نے بیچارے اصلی پیر صاحب کی اچھی خاصی بے عزتی کی لیکن وہ خاموشی سے اپنے کام میں لگن تھے، جواد بھی مجبوراً ہانپنے کا فون آف کر کے خالہ کے پاس بیٹھ گیا، ہم لوگ محن میں بیٹھے آہستہ آواز میں گپ شپ کر رہے تھے، جواد پیروں تک شال اوڑھے دوسری کرسی پہ بیٹھا باہر ہم لوگوں کو دیکھنے لگا تھوڑی دیر بعد بور ہو تو فیس بک کھول کے بیٹھ گیا، پیر صاحب نے دم کر کے پانی خالہ کے منہ

لگا دیا وہ اب شور نہیں کر رہی تھی، بلکہ چپ چاپ ان کی باتوں کو مان رہی تھی، اب شاید کوئی حصار کھینچا جا رہا تھا، خالہ پرسکون کرسی پہ آکھیں موندے لیٹی تھی، جواد نے دیکھا کہ اب خالہ حصار سے باہر نہیں نکل سکتی تو وہ آہستہ آہستہ اٹھا کمرے سے غیر محسوس طریقے سے باہر نکلا اور ہم لوگوں کے پاس سے تیزی سے گزر کر باہر چلا گیا، علی نے آواز دی، اوئے جواد کدھر جا رہے ہو، وہ پیچھے دیکھے بغیر تیزی سے آگے بڑھتا گیا، علی بھی اس کے تعاقب میں چلے گئے، جواد۔۔۔ جواد پار رک تو سہی، کہاں جا رہے ہو؟ اس کے نزدیک پہنچ کر علی نے اکھڑی سانسوں میں بات کی، نہیں علی بھائی میں نہیں رک سکتا عجیب ڈرامہ ہے میں ہانپا کو وقت نہیں دے پارا مجھے گھر جا کر اسے بھی منانا ہے، یہ مسئلہ تو پتہ نہیں کب ختم ہوگا، بات کرتے کرتے وہ ست روی سے چلنے لگا، ٹھیک ہے یار، مجھے تو خود نیند آئی ہوئی ہے، چل میں بھی گھر چلتا ہوں، علی اور جواد واپس گھر چلے گئے، بہت سکون آور ماحول تھا کیونکہ سارے ادھر چھوٹے گھر گئے ہوئے تھے اور پہلی بار یہ خاموشی دونوں بھائیوں کو بہت بھائی، علی جاتے ہی سو گئے اور جواد ہانپا کے ساتھ بات کرنے لگا تقریباً ایک گھنٹہ اس کے ساتھ بات کی اور تب جا کر اس کی ناراضگی ختم ہوئی، وہ چونکہ باہر رہتی تھی اس لیے وقت کا فرق تھا ادھر رات بھیک رہی تھی دس بجے عمو ماسب سونے چلے جاتے اور وہ ڈیوٹی آف کر کے اس وقت ٹرام پکڑ کے گھر جانے والی ہوتی، کچھ دیر بعد بات کرنے کے وعدے کے ساتھ دونوں نے فون آف کر دیا، اپنے کمرے میں شال لپیٹے جواد فیس بک چلا رہا تھا کیونکہ اسے ہانپے کے فون کا انتظار جو کرنا تھا، کچھ دیر بعد علی نے

اس کے دروازے کو ناک کیا، جواد جواد، یار دروازہ کھولو تمھارے لیے فون ہے، کس کا فون ہے؟ ہانپے سے ابھی تو بات ہوئی ہے بڑا ہاتے ہوئے اس نے بے دلی سے دروازہ کھولا تو علی جلدی سے اندر چلے گئے یار ہم ادھر سے آتے ہوئے ہیں لیکن خالہ نویدہ پھر قافلو سے باہر ہوگئی ہے، ان پیر صاحب نے کہا ہے کہ انھیں کھانا کھلاؤ وہ کھانا نہیں کھا رہی بس مرشد مرشد کہہ کے روٹی جا رہی ہے، اب وکی بھائی نے فون کیا ہے کہ ایک دفعہ جواد کو بولو آگے خالہ کو کھانا کھلا جائے، سنتے ہی اس نے تو بات کرنے سے انکار کر دیا علی نے کافی منت سماجت کی لیکن وہ وہاں جانے سے انکاری رہا، آخر وکی نے کہا کہ تم نہ آؤ لیکن خالہ سے فون یہ تو بات کر لو، کیا پتہ وہ مان ہی جائے اس تجویز سے جواد نے اتفاق کیا اور فون کان سے لگا لیا، اے نویدہ بی بی سنا ہے تو کھانا نہیں کھا؟ جواد کی اتنی سوئی آواز سن کر علی ہستے ہستے بیٹھ پہ لیٹ گئے اور منہ پہ تکیہ رکھ لیا، جی سرکار جی جی آپ کہاں چلے گئے ہیں آپ کے بغیر میں کیا کھاؤں بیویں، آپ آجائیں اور اس کالے منہ والے سے میری جان چھڑائیں، آپ آئیں گے تو روٹی کھاؤں گی، اے پاگل عورت ہمیں اور کام بھی ہوتے ہیں، ضروری کالیں کرنا ہوتی ہیں، لوگوں سے رابطے رکھتے ہوتے ہیں، ساری دنیا پہ نظر رکھنی پڑتی ہے، ساتھ ساتھ ہائیں ہاتھ سے وہ تیزی سے فیس بک کے کسی گروپ چیٹ میں کمٹ ٹائپ کر رہا تھا، اب ہم صرف تیرے لیے تو اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے، دیکھ کچھ کہنے لوگوں کو جواب دینا بے حد ضروری ہوتا ہے، تو روٹی کھا اور میں دشمنوں کے منہ بند کر کے ابھی آتا ہوں، جی مرشد پاک میں ابھی کھانا کھاتی ہوں آپ

جلدی سے آگے مجھے۔۔۔ لائین کاٹ کے جواد اور علی کا ہنس ہنس کر برا حال ہونے لگا، دونوں بیڈ نہ مگرے یوں دھاڑ دھاڑ کے ہنس رہے تھے کہ کمرہ بھی دہلنے لگا

☆.....☆.....☆

خالہ کورات کی نسبت کچھ آرام تھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ رات کو کھانا کھا کے وہ فوراً سو گئی تھی، اور دن کے دس بج رہے تھے ابھی تک نہیں جاگی تھی، ہم لوگ خوش تھے کہ چلو آرام کر لے خالہ، ہم بھی اتنے میں اپنے کام بنالیں، علی کی پھوپھو بھی ان دنوں ملنے آئی ہوئی تھیں وہ گاؤں سے تھیں اس لیے حقہ چیتی تھیں، چھت پہ ایک سائیڈ پہ آگ جلا کر وہ حقہ بتا رہی تھیں، میں نے جلدی جلدی صفائی سہرائی کر لی کیونکہ لوگ خالہ نویدہ کی خیریت پوچھنے صبح آ جاتے تھے، میں فرش صاف کر رہی تھی کہ کمرے سے اونچی آواز میں کچھ پڑھنے کی آواز آئی، یوں جیسے سبق پڑھا جا رہا ہو، یہ کون پڑھ رہا ہے؟ میں اندر جھانک کر دیکھ ہی رہی تھی کہ خالہ نویدہ کی گرجدار آواز گونجی اے کون ہے تو؟ میں ڈر کے پیچھے ہٹ گئی تو بجلی کے کوندے سے بھی تیزی سے خالہ میرے پیچھے ہال میں آگئی میں نے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی اس کے ہاتھ میں مجزوں والی وہ کتاب تھی جو میری ساس جمہرات کو پڑھا کرتی تھیں، ایک ہاتھ میں وہ مجزہ پکڑے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ میں جوتا پکڑ کے مجھے ڈرانے لکڑی تھی، یہ دیکھ کے مجھے اس سے ڈر کیا لگا اللہ پاک سے ڈر لگنے لگا کہ وہ ہمیں بھی اور اسے بھی معاف کریں، جو بھی تھا مجزے کی کتاب میں پاک ہستیوں کے نام تھے، لیکن وہ ہوش سے بیگانہ پاکی ناپاکی میں فرق نہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھی، اے



کڑیے، میری کتاب تو پڑھ میں بیٹھ کے سنوں گی، جب تک میرے مرشدوں کا اور دس بیسیوں کا ظہور نہ ہو جائے اسکو پڑھتے جانا ہے پڑھتے جانا ہے پڑھتے تے تے تے۔۔۔۔۔ جانا ہے، اور یاد رکھ، جس وقت تو رک گئی میں تجھے حلا دوں گی۔ کسی صورت بھی رکنا نہیں ہے، میری تو گھسی بندھ گئی، مجھ پر کڑ کر میں تھر تھر کاٹنے لگی، خالہ نے دوبارہ مجھے زور سے ڈانٹا تو میں الٹا سیدھا پڑھنا شروع ہو گئی، مجال ہے کہ وہ مجھے فالتو سانس بھی لینے دے رہی ہو، نہ بیٹھے دے رہی تھی نہ رکے دے رہی تھی، میں سب کو کوس رہی تھی کہ کہاں چلے گئے ہیں میری جان ہی نہیں بھٹ رہی تھی، مجھ سے بھی پڑھ پڑھ کر ختم ہو گئے تھے میں نے بتانا چاہا۔۔۔۔۔ خا۔۔۔۔۔ خا۔۔۔۔۔ خا، مجھ سے پڑھ لیے ہیں، کیا کہا؟ تو پھر رک گئی؟ بولا ہے زور سے اس کو پڑھ۔۔۔۔۔ جب خالہ پھر دھاڑی تو میں نے روتے ہوئے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا، اتنے میں باہر کا گیٹ زور سے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی، تھوڑی دیر بعد ہال میں انکل علیم اور بلال بھائی داخل ہوئے انکل نے آکر میرا حال دیکھا تو خالہ کو ڈانٹنے لگے کہ لڑکی کو کس چیز کی سزا دے رہی ہو؟ خالہ جوابا کہتی ہے یہ پڑھے گی تو میرے مرشد آجائیں گے، اے اے اے۔۔۔۔۔ تو پھر رک گئی؟ چل پڑھ مجھ، میں جلدی جلدی پڑھنے لگی، چھت کی بیڑھوں سے پھوپھو حلا ڈال کر نیچے اتر رہی تھی، خالہ نے جب اسے دیکھا تو شور مچا دیا وہ دیکھو میری بی بی آگئی ہیں، میری پاک بی بی (نمود بائد) آپ کدھر گئی اور کہاں گئی تھیں آپ؟ دیکھو دیکھو سب، یہ میری پاک بی بی آگئی ہیں، علیم باجی میں نے سچ کہا تھا کہ یہ لڑکی مجھ پر پڑھے گی تو میرے سارے مجھڑے

ہوئے مجھ سے آن ملیں گے، یہ سن کر بھائی بلال سے تو ہنسی نہ روکی گئی وہ اونچے قہقہے لگانے لگا، میں نے بلال کو اشارہ کیا کہ میری جان چھڑواؤ، وہ اٹھا اور اس نے ایک غیر متوجہ حرکت کر ڈالی دانتوں میں انگلی دا بے میں حیرت سے دیکھتی رہی، وہ خالہ نویدہ کے ارد گرد لڈیاں ڈالنے لگا، پتہ نہیں کیوں خالہ کو شدید دورہ پڑ گیا ادھر بھائی بلال ناچ ناچ کے ناچتا رہا شاید اس لیے کہ اس وقت ہم سب خود کو بے بسی کی عجیب انتہا پہ محسوس کر رہے تھے، اسے اس عالم میں اور تو کچھ نہ سمجھا اٹھ کے لڈی ڈانس شروع کر دیا جب بھائی بلال باز نہ آیا تو خالہ اس پہ حملہ کرنے کو دوڑی، وہ یقیناً اس صورتحال کے لیے تیار تھا، تیزی سے چھلانگ لگائی اور بیڑھوں سے نیچے آئی سمارٹ سی پھوپھو کو حقے سمیت اٹھا کر واپس چھت پہ بھاگ گیا، خالہ پیچھے دوڑی تو انکل علیم نے ان کو پکڑ لیا، میں بھی اس سارے ڈرامے سے جکے سے نکل کے سامنے والے کمرے میں بھاگ گئی، خالہ تو بوڑھے سے انکل علیم سے قابو ہی نہ آئے، سوئے ہوئے سب جاگے اور پھر وہ ہاتھ پائی ہوئی کر رہے نام اللہ کا۔

☆.....☆.....☆

کل خالہ نویدہ کے بھائی کا باہر سے فون آیا تھا، وہ اس کے لیے بہت پریشان تھے، چونکہ باہر (انگلینڈ) رہتے تھے اس لیے جن یا بھوت پریت یہ ان کا کوئی یقین نہیں تھا، ساری کیس ہسٹری سن کر انھوں نے فتویٰ دیا کہ میری بہن پاگل ہو گئی ہے اس لیے اسے راولپنڈی کے بڑے ہسپتال میں علاج کے لیے بھیجا جائے، کوئی پیر فقیر نہیں اور کوئی دم درو نہیں، بس آج ہی نویدہ کو راولپنڈی لے جاؤ، تم لوگوں نے بہت وقت ضائع کر دیا

ہے، میں پیسے بھینچتا ہوں اور تم لوگ گاڑی کا ارنج کر کے نکلنے کی تیاری کرو، یہ ساری باتیں سن کر خالو علیم نے کہا بھائی جان بات تو صحیح کہتے ہیں، امی نے کہا جیسے بھائی کہتے ہیں ویسے ہی کر لیتے ہیں گھر پہ تو کافی علاج کروائے ہیں، جن ٹکنا ہوتا تو اب تک نکل چکا ہوتا۔ اسے اب بجلی کے جھٹکے لگوانے کی ضرورت ہے، جو ادے نہ کہا امی بجلی کے جھٹکوں کے بعد خالہ ٹھیک ہو جائے گی؟ ہاں بیٹا میری بہن کے دماغ پہ جو بوجھ ہے وہ بجلی کے جھٹکوں کے بعد ختم ہو جائے گا، اس کا دماغ ہکا پھلکا ہو جائے گا، امی اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑانے میں مگن تھیں، ادوہ، شکر ہے، میری تو جان چھوٹ جائے گی، کیوں تیری جان کیوں چھوٹ جائے گی؟ جو ادے کے جواب پہ امی نے گھور کر سوال کیا، وہ ہر وقت مجھے جو اپنا مرشد کہتی رہتی ہے، مرشد پاک مرشد سائیں اور پتہ نہیں کہی کیسی باتیں کرتی ہے سچ کہہ رہا ہوں امی میں اب اس سب سے تنگ آ گیا ہوں، خالہ کو جلدی ہسپتال بھیجیں، اس کے اس طرح کہنے پہ امی بھی خاموش ہو گئیں، کیونکہ وہ بھی توجہ ہی کہہ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام تک خالہ کے کپڑوں کی ساری پیکنگ ہو گئی، خالو، سا جو نہیں جا رہی تھیں، انھیں ڈر لگتا تھا، ان کے علاوہ باقی سارے بڑے جا رہے تھے، امی کچھ دن خالہ کے پاس رہ کے آجائیں گی پھر دوسری خالہ جائیں گی، خالو عنایت ساتھ ہی جا رہے تھے، وہ دونوں بہنیں میرے پاس ہی رک گئیں، علی اور جو اد بھی گھر ہی تھے، جس دن یہ لوگ گئے تھے علی اس دن کوئی پڑھائی کرنے چھت پہ بیٹھے تاکہ خالہ نویدہ کے ساتھ اس کے اثرات بھی ہمارے گھر سے چلے جائیں (وظیفہ یا

چلے کرتے رہے ہیں)، ہم سب نیچے میرے کمرے میں تھے، علی نے مجھے اوپر بلوا بھیجا، میں گئی تو وہ دیا جلائے کچھ پڑھ رہے تھے، میں نے تو کمرے میں جانے سے انکار کر دیا، وہ مجھے اشارہ کر رہے تھے کہ اندر آؤ لیکن میں سخت وحشت زدہ ہو رہی تھی، میں نے تو صاف انکار کر دیا، انھیں بھی شدید غصہ آیا اور دیا جلا کے جو حصار بنایا تھا اسے اوپر لی ہوئی شال کا پلو ڈال کے وہ آدھی پڑھائی درمیان میں چھوڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے، حصار توڑ دیا تو میں اور ڈر گئی، تجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں بول نہیں سکتا تھا اشارے سے یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ۔۔۔۔۔ ادوہ کمرے کی چھت سے اینٹوں والے موٹے موٹے ٹکڑے نیچے گرے تو لوہے کی بڑی چادر پہ گرنے کی وجہ سے بہت اونچی آواز پیدا ہوئی، میرا فو کس علی کی بات سے ہٹ گیا، ادوہ یہ پڑوسیوں کے بچے رات کے وقت بھی آرام نہیں کرنے دیتے انچی کل ہی تو امی نے ان کی شکایت اٹکے گھر والوں سے کی تھی آپ رکیتے میں ان کو ڈانٹ کر آئی، میں اٹھنے ہی لگی کہ انھوں نے سرعت سے مجھے پکڑ کے اسے ساتھ لگا لیا میں نے متوقع خطرے کے پیش نظر لرز کے پوچھا کیا

ہوا؟ انھوں نے کہا کہ باہر گر نہیں ٹکنا جب تک میں نہ کہوں، باہر کون ہے؟ میں نے کھکھکاتے ہوئے پوچھا تو علی جھنجھلا گئے، جو حصار باندھ کے تمھاری وجہ سے توڑا ہے، وہ ہی اب حساب لینے آ گئے ہیں، میں نے جب یہ سنا تو میری ٹانگوں میں جان ختم ہو گئی، میں علی کے بازوؤں میں جھولنے لگی، میرے لیے تو یہ بات ہی جان لیوا تھی کہ جنات نے چھت سے پتھر پھینکے ہیں، ابھی وہ مجھے سنبھال ہی رہے تھے کہ دوبارہ ایک بوچھاڑ آئی، میں نے انھیں زور سے پکڑ لیا، لیکن اب کے وہ

مجھے خود سے الگ کر کے باہر جانے لگے میں نے روک لیا تو کہتے کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا میں نے پڑھائی کی ہوئی ہے صرف تمہاری فکر ہے، اور جب تک میں نہ کہوں باہر مت آنا، وہ جھٹت پہ سامنے کھلے میں چلے گئے اور میں دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپک کے کھڑی ہو گئی، پانچ منٹ گزر گئے لیکن علی کمرے میں نہیں آئے تھے، میں سخت بے چین تھی، کچھ ہمت پیدا کی اور باہر دیکھنے کے لیے تھوڑا آگے ہوئی، وہ پھڑکی پکڑ کے کچھ پڑھ رہے تھے اور اس طرح چھڑی کو حرکت دے رہے تھے جیسے کسی کو ہانک رہے ہوں، یا رستہ صاف کر رہے ہوں کچھ دیر بعد کمرے میں آئے، مجھ پہ کچھ پڑھ کے پھونکا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کہا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ جگہ صاف ہے تم کنارے کنارے چلتی نیچے چل جاؤ، میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجھے سیڑھیوں تک چھوڑا، میں نے بجلی آنکھوں سے انھیں دیکھ کے کہا آپ بھی آ جاؤ تو مسکرا کے کہتے پریشان مت ہو میں ٹھیک رہوں گا اور بس تھوڑی دیر میں نیچے آ رہا ہوں، ساتھ ہی مجھے ہلکا سا ایک سیڑھی نیچے ڈھیل رہا، میں نیچے آئی تو سارے خوش گپیوں میں مگن تھے، میرے آتے ہی سا جو کہتی بھابھی اوپر شور کیا تھا، میں نے چونک کر پوچھا کیسا شور؟ وہ ہی، جیسے بہت زیادہ غنکرا یا پتھر ایک ساتھ گرے ہوں۔۔۔۔۔ سب نے وہ آوازیں ہی ہیں؟ میرے احمقانہ سوال پہ جواد نے قہقہہ لگایا، بھابھی کیسی بات کرتی ہیں، اتنی زوردار آوازیں تھیں ظاہر ہے، ہم سب نے ہی سنی ہیں، بلکہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ جاتے ہی آپ نے بھائی کے ساتھ پھنڈا ڈال دیا ہے۔ اس کی بات پہ خالو سا جو گھا پھاڑ کے ہنسنے لگیں، تب میں نے دھیرے دھیرے ساری بات ان لوگوں

پہ ہو گئیں اور جواد کو ساتھ صوفے پہ میں نے لٹا دیا، اس کا بہت آسرا تھا، یہ بتاتی چلوں کہ علی سیڑھیوں کے پاس چار پائی بچھا کے سوئے تھے، ہم لوگ تقریباً ایک دو بجے تک جاگتے رہے پھر ایک ایک کر کے سب سو گئے، اس طرح کی نیند میں انسان تھکن سے چور ہوتا ہے نہ کوئی خواب آتا ہے اور نہ ہی آنکھ کھلتی ہے، اس لیے صبح سارے لیٹ جاگے، پہلے میری ہی آنکھ کھلی جلدی سے اٹھی، منہ دھویا اور کچن میں گھس گئی، ناشتہ بناتے بناتے میں نے سب کو آوازیں دے دے کر چگا دیا تھا۔ جب ہم لوگ ناشتے کی ٹیبل پہ بیٹھے تو سا جو کہ ابھی بھی نیند کے جھٹکے لگ رہے تھے، جواد نے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے پیچھے کھڑے ہو کر لمبی لمبی جمائیاں لیتی ہوئی سا جو پہ پانی کا پورا جگ انڈیل دیا، فروری کے درمیانی دن تھے اور خٹنڈ بھی آج کافی تھی، سا جو چینی مارنے لگی، جن جن جن۔۔۔ ہائے مجھ پہ چڑیل نے پیشاب کر دیا ہے، ہائے خالو میں مر گئی، وہ تو اٹھ کر کودنے لگی اور ہم سب کی آنکھوں سے ہنس ہنس کے پانی بہہ رہا تھا، پھر خالدہ کو خیال آیا اس نے اٹھ کر بہن کا چہرہ خشک کیا اور اندر لے جا کر خشک کپڑے دیے، جواد میرے بچے ایسی شرارتیں تھوڑی کرتے ہیں اگر اب اسے بخار ہو گیا تو۔۔؟ علی نے سرزنش کی تو جواد مسکرا کر کہنے لگا بھائی کچھ نہیں ہوتا اس کی نیند ایسے ہی ختم ہونا تھی، اب دیکھنا ڈٹ کر ناشتہ کرے گی، کیونکہ ایک تو پورے ہوش میں ہے دوسرے وہ پورے غصے میں ہے، ہم سب اس کی لالچک پہ مسکرا دیے۔

☆.....☆.....☆

ساجو نے جواد کی پیشین گوئی کے مطابق

واقعی پوری طرح جاگ کے اور منہ پھلا کے قل غصے میں ٹکڑا ناشتہ کیا تھا، میں نے اچھی سی سٹرائیک جائے بنا کے دی تو اس کا غصہ پل میں ختم ہو گیا، بھانجھی رات کو علی بھائی جاگ رہے تھے؟ اس نے مجھ سے پوچھا، کیوں؟ وہ تو ہم سب سے پہلے سونے چلے گئے تھے، یاد نہیں ہے کیا؟ نہیں اس کے بعد جب ہم سو رہے تھے تو کمرے میں جب وہ آئے تھے، شاید آپ سے انھیں کچھ کام تھا؟ اور آپ سو رہی تھیں، یہ نہیں، مجھے واقعی علم نہیں ہے، ویسے تم کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہو؟ میں نے ازراہ مذاق پوچھا، بھابھی شاید تبجد کے بعد کا وقت تھا اور کمرے میں بھائی علی آئے ہیں انھوں نے لائٹ بھی جلائی تھی اور کانی درہم سبکو گھور گھور کر دیکھتے رہے تھے، میں جاگ گئی تھی، جب میں نے دیکھا تو خاموشی سے باہر چلے گئے تھے، اس کی بات سن کر دل کو کچھ ہوا تو ضرور لیکن میں نے کہا وہ رات کو اکثر جاگ جاتے ہیں اور چکر وغیرہ لگاتے رہتے ہیں، پریشان مت ہو آتے ہیں تو میں ابھی پوچھ لیتی ہوں، ابھی ہم لوگ یہ بات کر رہی رہے تھے کہ علی بھی آفس جانے کے لیے کمرے سے باہر آئے، میں نے سب کے سامنے من و عن یہ سوال ان کے سامنے دھرنا تو وہ حیرت سے میرا منہ ٹٹکنے لگے، زہرا تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تھکا ہوا لینوں تو نہیں جاگتا اور پھر تین چار بجے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، خواہ مخواہ کے وہم دل میں نہ پالا کرو اور پلیز اب ریلیکس ہو جاؤ، رات والا واقعہ بھول جاؤ، دیکھو مجھے لہجے میں اپنی بات کہہ کے جب وہ باہر چلے گئے تو ہم سب پھر سر کچڑ کر بیٹھ گئے، سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ وہ علی نہیں تھے تو پھر آخراں کے روپ میں کون تھا جو ہم سوئے ہوؤں کو بغور دیکھ رہا



تھا، ساجدہ کہہ رہی تھی کہ کمرے کی جی بھی بند تھی اور محققہ ہاتھ روم کی جی آن تھی، دروازے میں کتنی دیر وہ کھڑا بھی رہا تھا، جسے وہ علی سمجھ رہی تھی، آخر وہ کون تھا جو ہمارے کمرے تک آ پہنچا تھا، خالد نویدہ یہ ہمارے علم کے مطابق جن تھے، لیکن ان کی بعض حرکتوں سے لگتا تھا کہ وہ محض ذہنی بیمار ہے، اسی لیے وہ ہسپتال بھیج دی گئی تھی، ہم چند گھنٹوں کے لیے ہی ریلیکس ہوئے تھے، نامعلوم یہ کون تھا جو خالد کے جاتے ہی ہمارے گھر ظاہر ہو گیا تھا، کیا واقعی یہ خالد نویدہ کے جنوں کی باقیات تھی جو اب ہمیں خوفزدہ کر رہی تھی؟ ساجو کی بات کے بعد ہم سب شدید متاثر ہوئے، مجھے تو اس حد تک خوف محسوس ہو رہا تھا کہ اگر علی جاب پہ ہوں اور ان کے روپ میں پھر کوئی اور میرے گھر آ گیا تو۔۔۔؟ خالدہ ساجدہ اپنے گھر چلی جائیں جو اب بھی گھر نہ ہو اور امی لوگ اپنی دور راوی پنڈی گئے ہوئے ہوں، اس صورت میں وہی سب وقوع پذیر ہو تو کیا مجھے زندہ چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا مجھے اذیت نہیں دی جائے گی؟ ہال کے وسط میں کھڑی ہو کر میں گہری سوچوں میں غم تھی، کچن سارا سیٹھنے والا تھا، باہر کا دروازہ بجاتا تو میں دوڑتی ہوئی گئی اور دروازہ کھول دیا، ساتھ والوں کا لڑکا باہر کھڑا تھا، بابی، بابی اس گلے موڑ پے علی بھائی کی کسی کی بانیٹ کے ساتھ گھر ہوئی ہے اور وہ سڑک پہ گرے ہوئے ہیں میزل یہ کہہ کے بھاگ گیا اور میں جس حال میں تھی پریشانی کے مارے ایسے ہی اس کے پیچھے دوڑی، گھر میں کسی کو بھی بتانا ذہن میں نہ رہا، موڑ پہ پہنچی تو پانچ چھ لوگ اکٹھے ہوئے تھے، میں ان کو ہٹا کے درمیان میں پہنچی تو علی زخمی حالت میں زمین پہ گرے ہوئے تھے، میں نے نیچے بیٹھ کے ان کا سر گود میں رکھ لیا، کیا ہوا آپکو، ساجو تو اچھے

بھلے گھر سے نکلے تھے، اور یہ آپکے کپڑے۔۔۔۔؟ علی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور میری کلائی پہ اپنا ہاتھ رکھ کے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، میں انکے ماتھے پہ آئی چوٹ کو پریشانی سے دیکھ رہی تھی، جان کیوں ہلکان کر رہی ہوں میں ٹھیک ہوں، ادھر دیکھو میری طرف، میں نے جب علی کی آنکھوں میں دیکھا تو بڑی عجیب الجھن ہوئی، یوں جیسے یہ علی نہ ہوں، ابھی میں نے انکے کپڑے دیکھے تو اور پریشان ہو گئی کیونکہ ساجو جب گھر سے گئے تھے تب تو کپڑے نیلے رنگ کے تھے اور اب براؤن رنگ کے تھے، آپکے کپ۔۔۔ کپڑے۔۔۔؟ میں ششدر تھی، یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپکے اپنے کپڑے کہاں ہیں؟ میں نے چلا کر پوچھا تو انھوں نے میری کلائی سے پکڑ کے مجھے کھینچا اور نزدیک کر کے سرگوشی کی، رات میں تمہارے کمرے میں آیا اور تم سوئی ہوئی تھی، تمہیں میرا انتظار کرنا چاہیے تھا، ساجدہ نہ جانتی تو میں نے تمہیں آواز دینا تھی۔۔۔۔۔ وہ علی نہیں تھے، بلکہ یہ وہی ساجو جو رات کو ساجو کو نظر آیا تھا اور اب مجسم میرے سامنے میری کلائی پکڑے بات کر رہا تھا میں بت بنی اس کی باتیں سن رہی تھی اور بند دماغ کے باعث حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی، سنو آج میں پھر آؤں گا اور تم نہ جا گی تو ساجو سے ہی بات کر لوں گا، مجھے علی نے بہت تنگ کیا ہے کل، اس کا بدلہ مجھے تم دو گی۔۔۔ اس نے جب یہ بات کی تو میرا ذہن غصے کے مارے کام کرنے لگا، کیونکہ میرا ماننا ہے کہ غصے میں انسان کی طاقت عود کرتی ہے، اس سے بازو چھڑایا اور پسینے سے شرابور میں اٹنے قدموں واپس بھاگی، اس کے بھیا تک قہقہے میرا تعاقب کر رہے تھے، سانس بری طرح پھول

گیا، ہشکل تمام میں اپنے دروازے تک پہنچی تو جو اب مجھے ڈھونڈتا ہوا باہر کی طرف آ رہا تھا، بھابھی۔۔۔ بھابھی کہاں چلی گئی ہو آپ؟ مجھے اپنے براؤن کپڑے نہیں مل رہے ڈھونڈ کے پریس۔۔۔ وہ بول رہا تھا اور میں دروازے میں جا گری، کیا ہوا آپکو، کہاں سے آ رہی ہو آپ؟ چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا اور رنگ ہلدی کی طرح۔۔۔ اس نے مجھے دروازے کی چوکھٹ سے اٹھایا، جو اب ادھر۔۔۔ ادھر علی کے روپ میں۔۔۔ ساجو ٹھیک کہتی تھی، وہ علی کی شکل میں تمہارے کپڑے اس نے پہنے ہوئے۔۔۔ اسے آدمی ادھوری بات سمجھ آئی اور مجھے دروازے کے اندر دھکیل کر باہر کی طرف بھاگا۔۔۔ میں نے کمزور لیچے میں اسے پکارا۔۔۔ مت جاؤ جو اب۔۔۔ وہ ٹھیک کچھ کہہ دے گا۔۔۔ میں خود کلائی کر رہی تھی لیکن اتنی سکت نہیں تھی کہ میں خود سے اٹھ سکوں اور جا کے دیکھوں وہ جو اب کوئی نقصان نہ پہنچا دے، ابھی تو خالو ساجو کو بھی پکارنے کی ہمت نہ تھی، جو اب ابھی قدموں سے بھاگتا ہوا واپس آیا بھابھی کمال کرتی ہو مجھے تو کوئی چیز بھی کہیں نظر نہیں آئی، سڑک ویران پڑی ہے، آپکو کسی نے بہکایا ہے، آں۔۔۔ ہاں ہاں جو اب یہ ساتھ والوں کا منزل بلانے آیا تھا، اس سے پوچھو ذرا، یہ گواہی دے گا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں، وہ پھر پلٹ کر ساتھ والوں کے گیٹ پہ پہنچ گیا، ناک کیا اندر سے کسی نے پوچھا کون ہے تو جو اب نے کہا اتنی ذرا منزل کو بلا دیں اس سے کام ہے انھوں نے کہا بیٹا وہ تو کل سے اپنی خالہ کی طرف گیا ہوا ہے، یہ سننا تھا کہ جو اب چونک اٹھا، وہ بھاگتا ہوا گھر آیا اور مجھے اندر ہونے کا کہہ کر جلدی سے گیٹ بھر کر دیا، بھابھی

وہ کون تھا مجھے سچ بتائیں کہ واقعی بھائی علی کے روپ میں کوئی ہمارے گھر پہ نظر رکھے ہوئے ہے؟ میں نے ہال میں آ کر جو اب اور خالو ساجو کے سامنے ساری بات بتائی، آخر وہ کون ہے، کیوں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے اور وہ چاہتا کیا ہے؟ ہم سر جوڑے اسی سوچ میں تھے کہ چھت پہ کسی کے چلنے کی آواز آئی، قدم گھٹ رہے تھے، سا۔۔۔ جو میں نے رات کو آنا تھا تو ابھی آ گیا، چھت کے درمیان میں جو روشن تھا اس کے قریب آواز آئی، خوف کے مارے ہم لوگ اندر بھاگے، اور جو اب چھت پہ بھاگ نکلا، میں پکارتی رہ گئی لیکن وہ ان سنی کرتے ہوئے جا چکا تھا۔۔۔ ہم تینوں چیخ رہی تھیں، قیامت پانچھی لیکن اوپر سناٹا طاری تھا ایسے لگ رہا تھا جیسے اوپر کوئی بھی موجود نہیں ہے، میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور روتے ہوئے سبز ہریاں چڑھنے لگی، خالدہ مجھے پکڑنے کو بلکی۔ لیکن مجھے جو اب کی فکر تھی، میں نے اسے جھٹکا اور چھت پہ جا پہنچی، میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ دنیا کے انھوں تجو بے سم نہ تھا، گنگ ہو کر میں آنکھیں پھاڑے دیکھے جا رہی تھی۔۔۔۔۔ کاش میں جو اب کو اوپر نہ آنے دیتی، میرے سر میں دھواں جمع تھا اور جو میں دیکھ چکی تھی جگر پھٹ جاتا تو بھی عجب نہ تھا، میری زندگی کا شاید اختتام قریب تھا، سارے مناظر دیکھ دیکھ کے آخر میں نیچے گر پڑی لگ رہا تھا کہ آج ہم سب مارے جائیں گے، شاید میں بے ہوش ہو رہی تھی، سارے مناظر دھندلا رہے تھے، دھند گہری ہوئی تو اندر اچھا گیا اور۔۔۔ میرا وجود مکمل تاریکی کا حصہ بن گیا۔



ڈیرہ اللہ یار سے ارسال کردہ پراسرار تحریر

## جن کا انتقام

جن بھی انسانوں کی طرح انتقامی جذبات رکھتے ہیں

تبھی تو مولوی مقبول کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالا.....

ساحل ابڑو

”کہو بیٹا کسی طبیعت ہے؟“ میں کہہ کر اپنے بیٹے قیصر کے برابر بیٹھا۔ قیصر نے مجھے گھور کر دیکھا اور تلخ لہجے میں کہا۔

”آپ کی ہمت کیسے ہوئی میرے برابر میں بیٹھے کی؟ انہیں اور سامنے بیٹھ کر بات کریں۔“ اس کے انداز اور زبان سے مجھے بھی شک ہوا کہ معاملہ کچھ خراب ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے قیصر پر ایک سچ کی سی کیفیت طاری ہوئی اور اس کے ہاتھ پاؤں اٹھنے لگے اور وہ لیٹتا چلا گیا۔

میں نے اور نامہ نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ پاؤں سہلائے۔ تھوڑی دیر بعد قیصر ٹھیک ہو گیا۔ وہ رونے لگا اور اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ قیصر کی یہ عجیب و غریب بیماری میری بھی دماغی پریشانی کا باعث بن کر رہ گئی تھی۔

قیصر تین چار مہینے سے بیمار تھا۔ چند روز شدت کا بخار رہا اور پھر اس پر یہی کیفیت طاری

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ”ہاں بس قیصر کی طرف سے پریشان ہوں۔“

میں بھنگن سے زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ بولی۔

”بابو جی! اس کا علاج حکیموں کے پاس نہیں ہے۔ میری مانو تو اسے مولوی مقبول کے پاس لے جاؤ۔“

”مولوی مقبول جو دو گلی چھوڑ کر رہتے ہیں؟“ ”ہاں بابو جی دی۔ وہ کالا علم کا توڑ جانتے ہیں، ان کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ ایسا تعویذ لکھ کر دیتے ہیں کہ کیسا ہی بیمار ہو، کیسا ہی مسئلہ ہو، اللہ کے حکم سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بڑی دور

سے لوگ آتے ہیں ان کے پاس اور اپنی مراد پاتے ہیں۔“

وہ اپنی نوکری پاس رکھ کر بولی۔ ”پھر تو واقعی کمال ہے ان کے ہاتھ میں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

بھنگن نے مجھے متاثر دیکھا تو کہا۔ ”کمال سا کمال بابو جی۔ وہ جو اپنے یا سر صاحب ہیں نا، ان کی بیوی کی اور ان کے بڑوں کے امین صاحب کی بیگم میں جھڑپ ہو گئی۔ یا سر صاحب کی بیوی امین صاحب کی بیگم کو بہت کوس رہی تھی کہ انہوں نے ان کا پلا پلایا سرغا کاٹ کے کھالیا۔ بہت گالم گلوچ ہوئی، بات اتنی بڑھ گئی کہ امین صاحب کی بیگم نے قسم کھائی کہ تو نے میری بے عزتی کی ہے،



اجہا نہیں کیا۔ تین مہینے کے اندر اندر تیرے بیٹے کو ختم نہ کروایا تو میں بھی اپنے باپ کی بیٹی نہیں۔ بابو جی مجھے سب حال معلوم ہے۔ قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ٹھیک تین مہینے بعد یا سر صاحب کا گھبر و ساچہ لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ہائے ہائے۔“ بھنگن کانپ گئی۔

”ارے سچ سچ مر گیا بیچارہ؟ یہ تو بڑا ظلم ہو گیا۔ کیا زبردلوادیا اسے؟“  
”نہ نہیں بابو جی! کالے علم کے زور سے۔ میں امین صاحب کی بیگم کے کھر بھی جاتی ہوں۔ وہ مجھے پان تبا کو کھلا دیتی ہے۔“

جمہرات کی روٹی میں کبھی ناغہ نہیں کرتی۔ میں دو گھڑی بیٹھ کر بات بھی کر لیتی ہوں، میں نے ایک دن انہیں یا سر صاحب کی بیوی والی لڑائی یاد دلائی تو وہ بولی کہ میں نہیں بھولنے والی ہوں۔ اللہ چاہے تو میرا کیچہ جلد ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”بابو جی میں تو ڈرنے لگی کہ ہائے ہائے یہ کیا کر بیٹھے گی اب۔ اسی خیال سے ایک دن یا سر صاحب کے ہاں چلی گئی۔ ان کی بیوی بہت اداس تھی، اس نے مجھے بہت سا آنا اور پانچ سو روپے خیرات کے دیے۔ میں نے جاتے ہوئے جب ان کے بیٹے کو دیکھا تو سچ کہتی ہوں کہ وہ گول مٹول سا بچہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا تھا۔ تو یہ تو بہ کر کے کہتی ہوں کہ بالکل بے جان لگ رہا تھا۔ معصوم بچے کی یہ حالت دیکھ کر میرا کیچہ پھٹنے لگا۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ پھر دوبارہ بولی۔

”پھر یا سر صاحب کے بیٹے کی موت کے وقت جب وہاں تھی تو مولوی صاحب نے ان

کے بیٹے کی صورت دیکھ کر یہی کہا تھا کہ کسی نے بڑا سخت علم کروایا ہوا تھا۔ اگر یا سر صاحب ان سے بردت رابطہ کر لیتے تو وہ یقیناً اس بچے کی جان بچا سکتے تھے۔“

بعد میں مولوی صاحب نے بتایا کہ کالا علم بہت زور آور تھا، کسی نے بیگن میں علم پڑھ کر اس میں کانٹے چھوئے تھے، جوں جوں وہ بیگن سوکھتا گیا، یا سر صاحب کے بیٹے کا جسم بھی سوکھتا گیا۔ آخر سوکانے پورے ہونے پر اس کا انتقال ہو گیا۔ میرے جی میں آیا کہ سب کو ساری بات بتا دوں مگر پھر میں ڈر گئی کہ اگر امین صاحب کی بیگم کو پتہ چل گیا تو وہ میرے اوپر بھی کوئی جادو نہ نہ کروادے۔

بابو جی مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ اپنی کہہ کر بھنگن مجھے سلام کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس کی باتیں میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ مجھے اعتبار نہیں آرہا تھا۔ عورتیں ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ کیا پتہ کہ بھنگن نے مجھے متاثر کرنے کے لیے یہ بات خود ہی گھڑ لی ہو۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ ڈاکٹروں حکیموں کو بہت آزما چکے۔

چلو مولوی مقبول کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ اسی شام عصر و مغرب کے درمیان میں قیصر کو لے کر مولوی مقبول کے مکان پر پہنچ گیا۔ دستک دینے پر مولوی صاحب بہ نفس نفیس باہر تشریف لائے۔ ان کے سراپے پر نظر پڑتے ہی میں ان کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور بے اختیار میرے دل سے آواز اٹھی کہ یقیناً اللہ کا ان پر کوئی خاص کرم ہے۔

سفید شلوار آمیزش میں ملبوس، پچاس کے قریب سن، عاجزی اور احترام مہر انداز، چہرے پر نور

کا احاطہ تھا۔ میں نے سلام کر کے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

اور قیصر کو چار پائی پر لٹا دیا۔ وہ ایک لمحہ اسے غور سے دیکھتے رہے پھر میری طرف دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولے۔

”بہت دیر کر دی برخود دار۔ اس کا حال تو بہت برا ہو چکا ہے۔ اب خبر لی ہے تم نے؟“  
”جی بہت عرصے سے علاج معالجہ ہو رہا تھا مگر آرام نہیں آرہا تھا۔“

”آرام کیسے آتا۔ اس کی تو جان پکڑی ہوئی ہے۔ ایسے میں کوئی دوا کیسے اثر کرتی۔“  
میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ ”کس نے جان پکڑی ہوئی ہے مولوی صاحب اور کیوں پکڑی ہوئی ہے؟“

”ابھی پتہ لگ جاتا ہے۔“ کہہ کر مولوی صاحب اندر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹی سے پیالی میں تھوڑا سا روغن لیے ہوئے باہر آئے۔

قیصر کے سر ہانے بیٹھ کر کتنی ہی دیر کچھ پڑھ کر دم کیا۔ پھر روغن قیصر کے کانوں اور ناک کے نتھوں میں لگایا۔ روغن کی خوشبودار مٹھ میں پچھتے ہی قیصر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مولوی صاحب نے جلدی جلدی پڑھ کر پھونکیں مارنی شروع کر دیں۔ قیصر کا جسم اینٹھتا رہا۔ سچ کی سی کیفیت ہوتی رہی۔ اور میں حیرت و استعجاب سے یہ رد عمل دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قیصر کا چہرہ ہنسمانے لگا۔ وہ ایک تڑپ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور چلنے لگا۔

”مجھے جانے دو۔“  
مولوی صاحب کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔

وہ بڑے پروقار لہجے میں بولے۔  
”ہرگز نہیں جانے دوں گا۔ بتاؤ تم کون ہو؟“

قیصر کا جیسے گلا گھٹ رہا تھا۔ اس کی رگیں تن گئی تھیں۔  
جسم میں ایک زبردست کھنچاؤ تھا۔ وہ بڑی کشش کے بعد بولا۔

”میرا نام عمیر ہے۔“  
”ہوں۔“ مولوی صاحب کرخٹ لہجے میں بولے۔ ”تم اس معصوم بچے کو کیوں پریشان کر رہے ہو؟“  
”اس نے میرے بچے کی ٹانگ توڑ دی تھی۔“  
”ٹانگ توڑ دی تھی؟ وہ کیسے؟“

”ان کے مکان کے قریب پرانے پینل کی جڑ میں ہمارا گھکانہ ہے۔ ایک روز میرا بچہ وہاں کھیل رہا تھا کہ اس نے وہاں اسے ٹھوکر ماری۔ میرے بچے نے اس کی ٹانگ پکڑ لی تو اس نے پتھر اٹھا کر مارا۔ اپنے بچے کے بلبلانے پر میں آیا اور اسے پکڑ لیا۔“

”مگر تمہارا بچہ تو اس غریب کو دکھائی ہی نہیں دیا ہوگا۔ وہ اس کے راتے میں آیا ہی کیوں تھا۔ بہر صورت اب تو اسے کافی سزا مل چکی ہے۔ تمہارا بدلہ برابر ہو گیا۔ اب اس کی جان چھوڑ دو۔“

”نہیں ہرگز نہیں۔ میرے بچے کی حالت نازک ہے۔ اس وہ مر گیا تو میں اس کی بھی جان لے لوں گا۔“

مولوی صاحب یہ سن کر جوش میں آ گئے اور گرج کر بولے۔  
”یہ نوبت نہیں آنے پائے گی۔ اس سے پہلے

میں تمہارا خاتمہ کر دوں گا۔ تم شاید مجھ سے واقف نہیں ہو۔ کان کھول کر سن لو یا تو ایک ہفتے کے اندر اس کا چھپچھوڑ دو ورنہ میں تمہارا گل کر دوں گا۔  
”یہ نہیں ہوگا۔“  
”یہی ہوگا۔“

”اچھا ابھی مجھے جانے دو۔“

”جاؤ۔“ مولوی صاحب نے اسے آزاد کیا۔

میں خواب کی سی حالت میں ان کی صورتیں تک رہا تھا۔ آنکھیں دیکھ رہی تھی مگر دل اسے فریب نظر کھ رہا تھا۔

کان یہ عجیب و غریب مکالمہ سن رہے تھے مگر دماغ یقین کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مولوی صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ قیصر بے ہوش ہو گیا تھا، ہوش میں آ کر منہ بسور رہا تھا۔ اس کے کمر در سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

مولوی صاحب نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

”میں تعویذ لکھ کر دے دیتا ہوں۔ وہ بیچ کے گلے میں باندھ دینا، اول تو وہ نہیں آئے گا اگر پھر بھی آجائے تو فوراً بیچ کو میرے پاس لے آنا۔“

مولوی صاحب اندر تعویذ لکھنے چلے گئے تو قیصر سے میں نے بہت سوال کیے مگر وہ مگر میری طرف دیکھنے لگا۔

مولوی صاحب نے تعویذ لا کر دیا اور ہم وہاں سے چلے آئے۔

گھر آ کر میں نے تعویذ قیصر کے گلے میں باندھنا چاہا تو وہ تڑپنے لگا۔ میں نے زبردستی باندھ دیا تو اس نے کھینچ کھانچ کر دھاگہ توڑ دیا

اور تعویذ گلے سے نوح کر دور پھینک دیا۔ میری بیوی ڈر گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔

”اس وقت زبردستی نہ کرو، بیچہ کمزور ہے۔ جب سو جائے گا تو میں چپکے سے باندھ دوں گی۔“

جب قیصر گہری نیند سو گیا تو جو نبی اس کے گلے میں تعویذ ڈالا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ پہلے کی طرح جھنجھنے لگا۔

ایسے موقع پر نہ جانے اس کی کمزور ہڈیوں میں اتنی طاقت کہاں سے آ جاتی ہے کہ وہ ہم دونوں میاں بیوی کے قابو میں نہ آتا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں جا کر سارا ماجرا بیان کیا۔ وہ بولے۔

”بہت ضدی اور مغرور معلوم ہوتا ہے۔ اس کا علاج کرنا ہی پڑے گا۔ تم ایسا کرو کہ جمعرات کی رات کو ایک لہا گھیا لے کر بیچ کے ساتھ لٹا دو اور صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ گھیا اور بیچ کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ انشاء اللہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں اس مشورے پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے لوٹ آیا۔ جمعرات آئی و رات وہ گھیا جو اس مقصد کے لیے پہلے ہی لا کر رکھ دیا تھا، بے خبر سوئے ہوئے قیصر کے پہلو میں ڈال دیا لیکن وہ ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھیلے لگا۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر گھیا چار پائی سے ہٹا لیا گیا۔ جب دوبارہ سو گیا تو آہستہ سے پھر گھیا اس کے پہلو میں لٹا دیا گیا۔ وہ پہلے کی طرح پھر اٹھ گیا اور وہی حرکتیں شروع کر دی۔ وہ دونوں میاں بیوی بہت حیران تھے۔

اسی کشمکش میں رات بیت گئی۔ اسی طرح صبح

ہوتے ہی میں قیصر اور گھیا لے کر مولوی صاحب کے مکان پر جا پہنچا۔

انہوں نے مجھے اندر بلا لیا، مولانی کو چائے بنانے کے لیے کہا۔ اور ایک آنکھٹی گرم کرائی، اس کے قریب وہ بوری بچھا کر ایک طرف وہ خود بیٹھ گئے اور سامنے مجھے بٹھالیا۔ آنکھٹی میں دیکھتے ہوئے کولتے تھے۔

مولوی صاحب نے ایک پڑیا سے آگ پر عود لوہان چڑکا۔ ایک تیز خوشبو کا بھپکا اٹھا اور کمرے میں تحلیل ہو گیا۔ ماحول بہت پر اسرار سا ہو گیا۔ میں نے قیصر کی طرف دیکھا اور کسی لاشعوری احساس کے تحت اسے کیچے سے لگا کر بھیج لیا۔

مولوی صاحب چھری ہلا کر سامنے رکھتے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے آنکھٹی میں عود لوہان بھی چڑک دیتے، آخر انہوں نے چھری آگ میں ڈالی۔ قیصر کا جسم کاپٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت جھلکنے لگی۔

جوں جوں چھری سرخ ہوتی گئی، قیصر کا خوف دہراں بڑھتا چلا گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ مجھ پر بھی خوف طاری ہو گیا۔ مولوی صاحب نے چھری کے دستے پر ہاتھ ڈالا تو قیصر چیخ مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔

مولوی صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ اسے مضبوطی سے پکڑ کر رکھوں۔ میں نے قیصر پر اپنی گرفت مضبوط کر لی مگر وہ اس قیدی کی طرح پھلنے اور تڑپنے لگا جیسے جلاد پھانسی کے تختے پر لے جا رہے ہوں۔

مولوی صاحب کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ ایک ہی بار انہوں نے دھکی ہوئی چھری کھینچ کر قیصر کے گھسادی۔ قیصر نے ایک دلدوز

چیخ ماری کچھ دیر تک اس کا جسم میری آغوش میں ذبح ہوتے ہوئے دہنے کی طرح تڑپتا رہا اور پھر زور سے جھرجھری لے کر ساکن ہو گیا۔ قیصر کو اپنے ہاتھوں میں یوں بے دم اور نڈھال ہوتے دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔  
”مولوی صاحب میرا بچہ۔“

مولوی صاحب مسکرائے، ایک نرم مسکراہٹ۔ ”تمہارا بچہ صحیح سلامت ہے، البتہ جو جن اس کے اوپر حاوی تھا وہ گل کر دیا گیا ہے۔“  
اس دن سے قیصر کو افاقہ ہونے لگا۔ اس کی خوراک معمول پر آ گئی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چند دن بعد وہ بالکل تندرست ہو گیا۔

مولوی مقبول کے اس عجیب و غریب علاج نے مجھے ابھن میں ڈال دیا، مجھے خواہ خواہ دلچسپی ہونے لگی کہ مولوی صاحب سے مل کر جنات کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہئے۔

چنانچہ ایک اتوار کو فرصت ملنے ہی میں ان کے ہاں پہنچا، دستک دی تو مولانی صاحبہ دروازے پر آئیں۔

مجھے دیکھتے ہی رونے لگی۔ خدا خیر کرے، کیا ماجرا ہے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے جلدی سے مولوی صاحب کا حال پوچھا تو روتے ہوئے بولیں۔

”بھائی وہ تو اسی دن سے بستر پر پڑے ہیں جس روز تمہارے بچے کا علاج کیا تھا۔ ہر تیرے چوتھے روز آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو مارتے ہیں اور چلا کر کہتے ہیں کہ تو نے میرے بھائی کو مارا، میں تیری جان لیے بغیر نہیں ٹلوں گا۔“

دنیا جہاں کا علاج کرتے تھے اب ان کا علاج کون کرے گا۔ یہ کہہ کر مجھے اندر لے گئی۔



# پاکستانی شوبز

شوبز سے جڑی تہلکہ خیز خبریں.....

اور نئی ریلیزز.....

ادارہ

دکھائی جائے گی۔ فلم میں ہمارے پہاڑی علاقوں کی خوبصورتی کو نہایت بہترین انداز میں دکھایا گیا ہے فلم کی دیگر کاسٹ میں منشا پاشا، ڈالے سرحدی اور غیر ملکی بہرہ و کثبت ایس لی ہیں۔ ساڑہ شہروز بہت Excited ہیں کہ وہ انٹر نیشنل پلیٹ فارم پر پاکستان کی نمائندگی کریں گی۔

طیفان ٹریبل

مکو کہ پیشا شفع نے پوری کوشش کر لی تھی کہ



چلے تھے ساتھ  
ساڑہ شہروز کی فلم چلے تھے ساتھ جو پچھلے سال ریلیز ہوئی تھی SCO فلم فیسٹیول میں



بھیانک طور پر پوری انسانیت کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

اس کے لیے وہ جو ہدیہ طلب کریں گے میں دینے کو تیار ہوں۔“

اس کے اس طرح مذاق اڑانے سے میں کھسیانا ہو گیا اور اسے قائل کرنے کے لیے کہا۔

”آخر تم جانتے ہو کہ میں ان باتوں ہر اعتقاد نہیں رکھتا تھا مگر آنکھوں دیکھے حال کو کیسے جھوٹ اور فریب مان لوں۔

بہر صورت میں تمہیں کسی زور مولوی صاحب سے ضرور ملو اؤں گا۔“

ایک روز شام کے وقت میں اور اختر ٹہلنے ہوئے مولوی صاحب کے گھر کی طرف نکل گئے۔

گلی میں دو چار آدمی ہمارے قریب سے باتیں کرتے ہوئے گزرے۔

”بھی عجیب بات ہے دیکھنے میں تو بڈیوں کا ڈھانچہ تھے۔ مگر افوہ۔۔۔ میت لگتی وزنی تھی جیسے دو آدمیوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہو۔“ ایک نے کہا۔

دوسرا بولا۔ ”دو ہی تھے، ایک وہ دوسرا وہ جن تھا جوان پر سوار تھا۔ قبر تک پچھا نہیں چھوڑا اس نے بھی اور پھر جان کس مشکل سے نکلے ہے، تڑپ تڑپ کر اور سسک کر۔“

میں نے دیکھا۔ مولوی صاحب کے دروازے کے سامنے دری بجھی ہوئی تھی۔ چند بزرگ اور نوجوان بیٹھے تھے۔ وہ بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ایک نوجوان سے پوچھا کہ۔ ”کس کی میت ہو گئی ہے۔“

اور یہ سن کر کہ مولوی مقبول کا انتقال ہو گیا اور میرے کان میں مولانی کے بین کی آواز گونجنے لگی۔

☆☆.....☆☆

مولوی صاحب بے ہوشی کی حالت میں پڑے تھے۔

ان کا کرتا پیٹھے پر سے ہٹا کر دیکھا تو جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی اور خون رس رہا تھا۔

مولانی پھر سے رونے لگی۔

”رات وہ جن ان کے سر پر سوار ہوا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر میری چہنیں نکل گئی۔ سارے محلہ جمع ہو گیا۔

یا سرمیاں کا اللہ بھلا کرے، اسی وقت بڑی مسجد کے امام صاحب کو بلا لائے۔ انہوں نے کچھ دم کیا تو ہوش میں آئے ورنہ شاید خود کو جان سے مار دیتے۔“

اس ماجرے نے میری حیرت میں حد درجہ اضافہ کر دیا۔

عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی۔ کیا جنات بھی انسانوں کی طرح انتقامی جذبات کے مالک ہوتے ہیں۔

میرا ذہن فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ کئی دن گزر گئے اسی اثنا میں میری ملاقات اختر سے ہو گئی۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ ایک مدت کے بعد میں اسے دیکھ کر بے تحاشا خوش ہوا اور اس سے لپٹ گیا۔ کافی دیر تک ایک دوسرے کے حالات سنتے رہے۔ باتوں باتوں میں مولوی صاحب کا بھی ذکر آیا۔ تمام حالات سن کر اختر خوب ہٹا۔

اور کہنے لگا۔

”بھئی مجھے اس مولوی سے ملو اؤ اگر واقعی

عملیات کے ذریعے ان میں کسی کی جان لینے کی طاقت ہے تو وہ ایک عمل ان امن دشمن شخصیتوں کے لیے بھی پڑھ دیں۔

جنہوں نے آج جنوں بھوتوں سے زیادہ



طیقا ان ٹریل فلاب ہو جائے۔

مگر ملی ظفر کی قسمت بہت اچھی ہے فلم کو ضرورت سے زیادہ پذیرائی ملی۔ شائقین سنیما کا کہنا ہے کہ طیقا ان ٹریل بے انتہا دلچسپ فلم ثابت ہوئی اور آئندہ بھی ایسی فلمیں بنی جائیں۔ ملی ظفر کے ہمراہ مایا علی ہیں اور اس جوڑی کو دیکھنے والوں نے بہت سراہا۔ ویسے کہنے والے تو کہتے ہیں عشا شفیع نے اپنے دوست کی خاطر اتنا بڑا قدم اٹھایا اور ہراساں کرنے کے لیے الزامات لگا کر فلم کو بہت روٹی بخشی۔

### Load Wedding

کہا جا رہا ہے کہ لوڈ ویڈنگ عید الاضحیٰ پر ریلیز ہونے والی سب سے بڑی ہٹ فلم ثابت ہوگی۔



اس فلم میں فہد مصطفیٰ کی لوک کو بھی بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ فلم میں فہد نے اپنا چہرہ موچھوں سے سجایا ہوا ہے۔ فلم میں مہوش حیات بھی موجود ہیں اور بہت دلی اسٹائل میں موجود ہیں کچھ ناقدین

کا کہنا یہ بھی ہے کہ لوڈ ویڈنگ کی ضرورت سے زیادہ چلتی ہو رہی ہے ورنہ یہ لوگ جو تعریفیں کرتے نہیں تھک رہے کہاں تھے اس وقت جب فلم کو ریلیز ہوئی تھی جو واقعی میں دیکھنے والی فلم تھی۔

آپ پر الزام ہے کہ.....

عاطف اسلم پر الزام ہے کہ انہوں نے نیویارک میں یوم پاکستان کے موقع پر ہندوستانی گانا گا کر پاکستانیوں کی دل آزاری تو کی تھی اس پر سونے پر سہاگہ پاکستانی جھنڈا اٹھانے سے بھی



انکار کر دیا۔ اور یہی بات پاکستانی کمیونٹی کے شدید غصے کا باعث بنی لیکن جواب میں عاطف اسلم کے مداحوں نے اس بات کو صرف الزام قرار دیا۔

عاطف اسلم نے کہا کہ مجھے اپنے وطن اور پرچم سے محبت ہے اور میں شکریہ ادا کرتا ہوں

اپنے فیمنز کا جنہوں نے ان بے سروپہ باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔

### پرفیکٹ جوڑی

آصف رضا میر کے صاحبزادے احمد میر آج کل خبروں میں بہت ان ہیں وجہ ان کی اداکاری نہیں بلکہ کوآرٹس منجمل کے ساتھ تعلقات ہیں۔



اس سے بل منجمل کا نام فیروز خان کے ساتھ لیا جاتا رہا ہے۔

احمد میر کا کہنا ہے کہ ڈرامہ یقین کا سفر کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ ہم دونوں کا کام کرنے کا انداز ایک سا ہے اور ہماری فیملیز بھی ایک دوسرے کو پسند کرتی ہیں۔

منجمل سے ملاقات کو میں اپنی زندگی کا خوبصورت ترین دن تصور کرتا ہوں۔

### تیسری جنس کیوں؟

مارویہ ملک پاکستان کی پہلی خواہہ سرا نیوز کاسٹرز جو کہ نور چینل سے وابستہ ہیں کہتی ہیں کہ کوہ



نور چینل میرا مضبوط سہارا بنا مجھے تو میرے گھر والوں نے بھی دھتکار دیا تھا مگر چینل نے مجھے عزت کا روزگار فراہم کیا۔ آسٹریلیا کی ہائی کشنر نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور جرمن سفیر بذات خود چل کر مجھ سے ملنے آئے۔ شہرت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب لوگ عزت دیتے ہیں رویے بدل گئے ہیں اور میری تمام پاکستانیوں سے گزارش ہے کہ وہ ہمیں بھی انسان سمجھیں جب مرد پہلی اور عورت دوسری جنس نہیں کہلاتے تو ہم تیسری جنس کیوں؟

☆☆☆☆☆



ایک نہایت ہی منفرد لپس براسر سلسلہ جسے آپ عرصہ دراز تک یاد رکھیں گے

المناس

علامہ سید ابوالحسن رضوی کا خیال

اس دل کا خیر تھا آئینہ اس سر کا تصور تھا موقلم  
تھل پہ لفظ لگا کیے تصویر بلی چلی مٹی

(قسط نمبر 11)

شازی سعید مغل

”اوہ..... اس نے پینٹنگ ہی بنا ڈالی..... انوکھی پینٹنگ.....“  
”واقعی انوکھی ہے واقعی اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ اس نے انجانے میں کیا کر ڈالا ہے  
یا اس سے کیا کر دیا گیا ہے۔“ نگار خود کلامی کے انداز میں مسلسل بڑبڑاتی تھی۔  
”کیا ہوا..... آنٹی کیا بات ہے؟“ سنہرا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔  
”ہوں.....“ نگار نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔  
”سنہرا تجھے وہاں پہنچنے میں دیر ہوگئی..... وہ پینٹنگ نہیں بنی چاہیے تھی اس کے مکمل ہونے سے پہلے  
تجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا تو ایسی صورت حال پیش نہ آتی خیر میرا نام بھی نگار ہے مجھے کچھ بھی کر کے اس  
صورت حال پر قابو پانا ہی ہوگا۔“  
”کیا کرو گی تم؟“ سنہرا نے جانا چاہا۔  
”دیکھتی جاؤ..... لا ذرا میرا فون تو اٹھا کر دے۔“ نگار نے دور پڑے اپنے سیل فون کی جانب اشارہ  
کیا۔ سنہرا نے نگار کا فون اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ نگار نے فون لے کر کسی کا نمبر ملایا۔  
”ہاں پرویز کیسے ہو؟“ نگار نے دوسری جانب سے فون اٹھانے پر نرم لہجے میں کہا۔  
”میں ٹھیک ہوں نگار صاحبہ..... آپ نے ناچیز کو یاد فرمایا خوش نصیبی ہے میری.....“ بڑی لجاجت و  
فرمانبرداری سے اس نے کہا۔  
”میں فون سنہرا کو دے رہی ہوں..... یہ تمہیں ایک پتہ سمجھائے گی اچھی طرح سمجھ لینا لکھ لینا پھر میں  
بات کرتی ہوں تم سے۔“ یہ کہہ کر نگار نے سنہرا کی جانب فون بڑھا دیا۔  
”لو اس کو اس لڑکے کا کیا نام ہے اس کا اور نگار کیب کے گھر کا پتہ بتاؤ۔“ سنہرا نے فون ہاتھ میں لے لیا۔  
دیر سے بولی۔



پراسرار واقعات پر بات نہیں کر سکا حالانکہ آج کی ملاقات صرف اسی لیے تھی ہوں گے سوئمنگ پول پر بیٹھنے والے واقعہ ایسا معمولی نہیں تھا کہ وہ پریشان نہ ہوتا یا نظر انداز کر دیتا۔

سنہرا کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد الماس اور صولت جہاں ہنسی مسکراتی باتیں کرتیں لوٹ آئیں تھیں اور نگزیب کھن میں اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں وہ ابھی تک بیٹھا تھا۔ الماس کی تیرہنسی نے اس کے خیالات میں رخنہ ڈالا تھا..... اس نے الماس کی طرف ایک تیز نظر دالی جواب میں الماس نے اُسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کا تسخراڑا رہی ہو..... اور نگزیب کے اندر بے حد اُبال اٹھ رہے تھے مگر اس نے سنہرا سے وعدہ کیا تھا کہ الماس سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرے گا اور نہ ہی گھر کے کسی فرد کو کل کے واقعات کے بارے میں بتائے گا۔ اس کا تجربہ تو اُسے پہلے ہی ہو چکا تھا جب اُس نے شروع میں الماس کے حوالے سے گھر میں بتایا تھا کوئی بھی اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھے لہذا وہ سب کی نظروں میں براہن گیا تھا۔ الماس سے تعلقات تو تب سے ہی خراب چل رہے تھے بس لے دیے انداز میں رہتے تھے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ..... یہاں بیٹھے ہوئے اُسے کافی دیر ہو چکی تھی بہت سی سوچیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں بہت سے واقعات اور مناظر ایسے تھے ایسے احساسات تھے کہ خوف کے مارے کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن خود پر اور ان واقعات پر غور کرنے سے ایک نیا احساس اور ہوا تھا وہ یہ کہ ان مافوق الفطرت واقعات نے خاص حوصلہ پیدا کیا تھا اس میں اور خوف کا وہ عمل اب نہیں رہا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ شام کے سائے ملنے سے ہو کر اب تاریک ہو گئے تھے۔

باہر بھینکتی تاریکی میں عجیب و غریب شکلیں سی بنتی نظر آنے لگیں لیکن وہ صرف احساس کے سائے تھے اس نے سر جھٹکا مگن میں برقی قمقمے جل اٹھے تھے اسی دم فائزہ نے گھر کے اندر دوئی صے سے اور نگزیب کو

”کیا کرنے لگی ہو کچھ بتاؤ گی بھی؟“  
”سوال نہیں کوئی.....“ نگار کے چہرے کے زاویے بگڑنے لگے۔ اس کے چہرے کے بگڑے زاویے کو دیکھ کر سنہرا نے پرویز کو اور نگزیب کے گھر کا پتہ سمجھنا شروع کر دیا۔ پتہ سمجھنے کے بعد دوسری جانب سے دہرایا گیا۔ سنہرا نے تائید کر دی نگار نے سنہرا کے ہاتھ سے فون تقریباً گھسیٹ لیا۔  
”آئی.....“ نگار نے اُسے یکسر نظر انداز کر دیا۔

”ہاں پرویز کو پتہ اچھی طرح نوٹ کر لیا ہے نا تم نے؟“  
”جی میں سمجھ گیا۔“ اس نے کہا۔  
”اچھی بات ہے.....“ نگار نے کہا۔  
”دیکھو اب تم نے کیا کرنا ہے اچھی طرح سمجھ لو میری بات غور سے سن لو جیسا میں بتاؤں اس پر حرف بہ حرف عمل کرنا ہے کہیں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔“ یہ کہہ کر نگار نے اُسے پورا منصوبہ سمجھایا۔ پرویز نے ساری بات سن کر نگار سے وعدہ کیا۔

”بالکل ایسا ہی ہو گا اور آج رات کو ہی ہو جائے گا۔“  
”ہاں مگر بے انتہا احتیاط اور ہوشیاری سے کرنا ہے سب۔“ نگار نے کہا۔  
”آپ بالکل بھی فکر نہ کریں میڈم جی آپ بس یہ بتائیے کہ اسے کہاں لے کر آؤں آپ کے پاس یا نہیں.....“

”اپنی تحویل میں رکھنا.....“ نگار نے اس کی بات کاٹی اور حکم سنایا۔  
”کام کر لو پھر بتاؤ مجھے میں تمہیں آگے کا لائحہ عمل بتاتی ہوں پھر۔“  
”ٹھیک ہے نگار میڈم جی.....“ پرویز نے خوشامدی انداز میں کہا۔ فون بند کر کے نگار نے سیل فون بیڈ پر اچھال دیا..... اور خود بھی بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔  
”تو ٹھیک ہے آئی میں ذرا کھوم پھر کر آ جاؤں۔“ سنہرا نے ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر کہا۔  
”ہاں جاؤ میری جان.....“ نگار نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔  
”اوہ کیا بات کرنی ہو آئی میری جان.....“ سنہرا مکر وہ ہنسی ہنس دی۔  
”ایسے جان لیوا موڈ میں کیوں آرہی ہو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ لچکتے ہوئے بولی۔  
”اداکاری اچھی کر لیتی ہو تم.....“ نگار نے اپنا سر گیت کیس اٹھایا اور سر گیت لگا کر ایک لمبا سانس لیا۔

”تم جان ہی ہو میرے مقصد کی یعنی میری جان کیا سمجھیں؟ اب جاؤ چلو زیادہ باتیں مت بناؤ مجھے ابھی بڑے کام کرنے ہیں۔“ نگار کا کہنا تھا کہ تیز پھڑ پھڑا ہٹ کے ساتھ کوئی چیز کھڑکی سے باہر نکل کر ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

سنہرا کے جانے کے بعد بہت دیر تک اور نگزیب الماس کے درخت کے نیچے نیچے تخت پر بیٹھا رہا اور آج کی عجیب و غریب ملاقات پر سوچتا رہا ایسی ہڑبوک مچی تھی کہ سنہرا سے وہ اہل کو لے کر ہونے والے

سچی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول ’تاشون‘ کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ  
ان کے ذاتی تحریکات اور اصل حقائق و اثرات  
سعادت و محنت کا حساب، حیرت و تجسس پوری ناول

تحریر: شازی سعید مخمل

**تاشون**

۲۵۰ صفحات

Postage Rs: 50

برصغیر میں علم خیر کے بانی حضرت کاش الہری کی  
عالمیت و کمالیت، روحانیت، محبت، تقویٰ اور دوسری دنیا  
کے تحریکات و شہادتات پر اسراریت کے منہ سے راز کھولنا ایک  
سرگزیر ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش الہریؒ ”بنام“

”تاشون“ ہیں

ابھی رابطہ کر کے اپنی کاپی بک کرو میں یا پے قریبی بکسٹال پر اپنا آرڈر بک کروا میں۔  
Auraz Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74800



آواز لگائی اب اس کا یہاں بیٹھا محال تھا فائزہ دو ایک بار پہلے بھی اُسے بلا چکی تھی۔ اب بھی ناجائز تو خود آجاتی پھر جانا ہی پڑتا۔ چنانچہ وہ بادل خواستہ اسٹھ کر اندر چل دیا۔ رات کا کھانا سب کے ساتھ ل کر کھانے کے بعد دو اپنے کمرے میں آ گیا۔ اپنے گوشہ مصوری کی طرف آ کر اس نے بلا مقصد کیونٹس پر اسٹروک لگانے شروع کر دیے کچھ دیر بے دلی سے اٹے سیدھے اسٹروک لگاتا رہا پھر گھر کے پچھلے سائیڈ بنے چھوٹے سے لان میں نکل آیا۔

اور لان میں ٹپٹنے لگا۔ باہر ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا چاند بھی اس وقت کسی نہ کسی بادل کی اوٹ میں باری باری چھپ رہا تھا چند سیکنڈ تک اورنگزیب منہ اٹھائے چاند کی بادلوں کے ساتھ چھین چھپائی دیکھتا رہا پھر چند گہرے سانس لے کر لان کی نرم گھاس پر ٹپٹنے لگا۔ ابھی اُسے کچھ بھی دیر ہوئی تھی کہ ماں نے باہر آ کر جھانکا۔

”کیا رات بھر ٹپٹنے کا ارادہ ہے آج تمہارا؟“

”نہیں بس امی جا رہا ہوں کمرے میں.....“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔  
”چلو پھر تم اندر جاؤ..... میں غیر ضروری لائٹس وغیرہ بند کرنے آئی تھی تو نہیں دیکھا مجھے پتہ ہے تم آج سنہرا کے ساتھ ملاقات کے وقت جو افرا تفری ہو گئی تھی اس وجہ سے پریشان ہونے سے بات کرتی مگر تمہارے دادا اور دادی کی فلائٹ ہے۔“

”کہاں..... کہاں جا رہی ہیں دادی جان مجھے معلوم نہیں؟“ اورنگزیب لاعلمی پر حیران ہوا۔  
”ہاں تمہیں فرصت نہیں ہے آج کل اور میں بھی بتانا بھول گئی اسی سلسلے میں آج مارکیٹ گئی تھی وہ اہل کے ساتھ پروگرام اچانک بنانا کا اماں کے بھانجی کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہے لاہور جا رہی ہیں بہت اصرار سے بلایا ہے اس نے اماں کی بہن تو رہی نہیں اب اماں کا جانا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ہم سب ایک ساتھ نہیں جاسکتے اہل کے پیپر ہو رہے ہیں۔“

”اچھا.....“ اورنگزیب نے ماں کی بات سن کر کہا۔  
”امی میں جا رہا ہوں سونے.....“ یہ کہہ کر اورنگزیب کمرے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ لاؤنج میں رکھے فون کی تیل ہونے لگی۔

”جی فرمائیے.....“ فون اٹھا کر کہا۔

”اوہ..... اچھی اس وقت.....“ دوسری طرف کی بات سن کر وہ بولا۔  
”اوہ نو..... نو پر ایلم ٹھیک ہے اوکے بائے۔“ جلد بازی سے فون رکھ کر مڑا فائزہ پشت پر کھڑی تھیں پوچھنے سے پہلے ہی جگت میں اورنگزیب بول پڑا۔

”امی وہ میری ایک پینٹنگ کے لیے سنہرا نے کسی سے بات کی ہے وہ ابھی لینے آرہے ہیں۔“

”اس وقت..... رات کے گیارہ سے اوپر ہو رہے ہیں۔“

”جی امی سنہرا کا کہنا ہے وہ بھی صبح کی فلائٹ سے نہیں جا رہے ہیں تو کیا کریں مجبوری ہے.....“  
”اوہ..... یہ بات ہے کل سارے شہر کو صبح کی فلائٹ سے جانا ہے۔“ کہتی فائزہ کمرے میں جانے کے بجائے کچن کی جانب چل دیں۔ چند سیکنڈ بعد اورنگزیب گیٹ کھول رہا تھا اُسے سنہرا نے سچ کیا

تھا دروازہ کھول دو..... اتنی رات میں اطلاعی گھنٹی بجنے سے سب ڈسٹرب ہوتے اورنگزیب خود بھی یہی چاہتا تھا وہ سنہرا کی عقل مندی کا بار بار قائل ہو رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر خندہ پیشانی سے آنے والے کا استقبال کیا اور ساتھ لے کر نشست گاہ میں پہنچا۔  
آنے والا اپنے فربہی مائل جسم کو لے کر دانتوں کی نمائش کرتا بغیر وقت ضائع کیے آرام دہ صوفے میں جھنس گیا۔

”اورنگزیب صاحب میں معافی چاہتا ہوں اس وقت تکلیف دی۔“ وہ ایسے شروع ہوا جیسے بٹن دبا دیا گیا ہو۔

”سنہرا جی نے بس اتنی تعریف کی نا کہ ہم جیسے قدر دان فن برداشت نہ کر سکے اور دیکھیے آن دھکے..... کیا سمجھے.....“

”جی نہیں جناب میری خوش قسمتی ہے یہ کہ آپ میری پینٹنگ خریدنا چاہتے ہیں۔“ اورنگزیب تشکر آمیز لہجے میں بولا۔

”سنہرا جی فن کی بہت بڑی قدر دان ہیں آج مجھے پورا یقین آ گیا ہے۔“ اورنگزیب سر تا پیر سنہرا کے خلوص و محبت فن کی قدر دانی کا قائل ہو چکا تھا۔

”اور میں آپ جیسے قدر دانوں کا بے حد شکر گزار ہوں۔“ اورنگزیب نے خلوص سے کہا۔  
”ارے..... اس تعریف سے مجھے شرمندہ نہ کیجیے مجھے صبح کی فلائٹ سے روانہ ہونا ہے کاروباری مسئلہ ہے کچھ دنوں میں ضرور کہتا کہ آپ کل دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔“ آنے والے نے دانتوں کی نمائش جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہاں میں ذرا اپنا کام بننا کر آ جاؤں پھر ملتے ہیں۔ یہاں شہر سے باہر میرا فارم ہاؤس ہے سربز و شاداب خوبصورت اور مضامقات میں ہونے کے باعث آلودگی سے پاک فارم ہاؤس دور تک گھنے درختوں کا سلسلہ امید ہے آپ کو جگہ پسند آئے گی آپ جیسے فنکار لوگ ایسی جگہوں کی تلاش میں ہوتے ہیں ہا ہا.....“ ایک بے ہنگم فہم کے ساتھ اس نے جیب سے چیک نکالی اور بلیٹک چیک پر دستخط کر کے اورنگزیب کی جانب بڑھا دیا۔

”فن کا قدر دان ضرور ہوں مگر قیمت لگائی آج تک نہیں آئی آپ نے جو سوچا ہو گا وہ قیمت لگا دیجیے گا۔“ اس نے اورنگزیب کا کندھا تھپتھپایا پینٹنگ اٹھائی۔

”ارے میں رکھوا دیتا ہوں گاڑی میں رکھیے۔“ اورنگزیب نے اس کے ہاتھ سے پینٹنگ واپس لینی چاہی۔

”ارے نہیں جناب اب تو یہ ہماری ہے۔“ اس نے پھر ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا۔

”اچھا اب اجازت دیں مجھے جلدی کہیں پہنچنا ہے پھر ملتے ہیں اور آپ سے مزید تصاویر کے منتظر رہیں گے۔“ اورنگزیب سے بات کرتا وہ گیٹ تک آیا۔ باہر باوردی ڈرائیور کھڑا تھا پینٹنگ گاڑی میں رکھوا کر وہ گاڑی میں بیٹھ کر طوفانوں کی طرح روانہ ہو گیا۔ اورنگزیب گاڑی کی سرخ بتیاں دیکھتا رہ گیا۔

اور پھر اپنے ہاتھ میں پکڑا بلیٹک چیک..... سب کچھ تیزی سے وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ وہ سنہرا کے خلوص کا

قاتل تو ہور ہاتھ مگر آج اُسے ایک عجیب سا احساس پہلی بار محسوس ہوا جیسے کچھ اور ہے جو پس پردہ ہے اُسے عجیب سی بے چینی نے آن گھیرا..... گیٹ بند کر کے اندر آیا تو فائزہ منتظر تھی۔

”میں نے ساری باتیں سن لیں ہیں تمہیں پہلی کامیابی بہت بہت مبارک ہو میرے لال.....“ کہہ کر فائزہ نے اورنگزیب کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”تم نے اپنے ابو کے سامنے میرا سرخسر سے بلند کر دیا ہے میں جب اُن کو یہ بتاؤں گی تو یقین جانو تم نہیں جانتے وہ کتنا خوش ہوں گے۔“ فائزہ خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔

”امی! امی!.....“

”ہاں کیا تمہیں خوشی نہیں اس کی پریشان کیوں ہو رہے ہو کیا بات ہے؟“ فائزہ نے اورنگزیب کے متھکر چہرے کو دیکھا۔

”کچھ نہیں امی بس سمجھ نہیں آ رہا مجھے یہ سب ایسے اچانک پینٹنگز کی نمائش نہیں ہوئی اور میری وہ پینٹنگ ہی فروخت ہو گئی۔“

”ارے پاگل نمائش کون کروا رہا ہے سنہرانا؟ تو بس اس نے تو آج دیکھ لی ہے اتنی بڑی آرٹ گیلری کی مالک ہے خرید و فروخت کرتی رہتی ہے اب گیلری میں فروخت کرے یا کہیں بھی تمہیں اس سے کیا.....

فن کو پروموٹ کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں کبھی بھی کہیں بھی کسی جگہ..... بس آفر کر دیتے ہیں اور فن کے دل دادہ بھی ایسے ہوتے ہیں جہاں کہیں کوئی فن پارہ پسند آ گیا کچھ نہیں دیکھتے اور خصوصاً پیسہ پاس ہو تو صرف دکھاتے ہیں..... یہ بلیک چیک۔“ فائزہ نے اورنگزیب سے بلیک چیک لیتے ہوئے کہا اور ہنس پڑی۔ اورنگزیب ماں کے اس مذاق پر چپکلی سی ہنسی ہنس دیا۔

”اوہ اب سو جو مت..... جاؤ جا کر سو جاؤ..... مجھے لگا تھا تم خوشی سے دیوانے ہو جاؤ گے اپنی ایسی کسی کامیابی پر مگر تم تو سنجیدہ بلکہ رنجیدہ نظر آ رہے ہو۔“

”اوہو امی اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ اورنگزیب نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کوئی بات نہیں ہونی چاہیے ایسی تمہارے دل و دماغ میں چلو اب سو جاؤ جا کر۔“

”اچھا امی!.....“ اورنگزیب نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکرا کر کہا۔ اور اپنے کمرے میں آ کر لائٹ آن کی لائٹ آن کرتے ہی پہلی نظر غیر ارادی طور پر ایزل کی جانب اٹھ گئی چند لمحوں پہلے فروخت کی گئی پینٹنگ ایزل پر بنو جو دی کا پتہ دے رہی تھی مگر دوسرے لمحے وہ اُس کی نظر کا دھوکا ثابت ہوئی وہ دوڑ کر ایزل کے پاس پہنچا وہاں کچھ بھی نہیں تھا اس نے اس کو اپنا وہم سمجھا اور ذہن سے جھٹک دیا۔ پھر اس نے کمرے کی لائٹ آف کی اور لیٹ گیا۔ آج کے سارے دن پر غور و فکر کرنے لگا اور پھر ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا یہ خیال اس کے دل و دماغ میں کافی پہلے سے تھا مگر وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا آج کے واقعات نے اور خصوصاً اُس کی بنائی گئی انوکھی پینٹنگ کی اس طرح انوکھی فروخت نے اسے یہ فیصلہ کرنے میں مدد دی فیصلہ کرتے ہی اُس کی بے چینی جیسے ختم ہی ہو گئی اور اسے نیند نے آ لیا۔

رات کے دو بجے پرویز کے پاس فون آ گیا جس میں اسے اطلاع دی گئی کہ پینٹنگ خریدنے کا ڈراما

کامیاب ہو گیا ہے پرویز یہ سن کر بہت خوش ہوا اور پینٹنگ کو مقررہ جگہ پر پہنچانے کا حکم دے کر فون کاٹ کر دوسرا نمبر ملانے لگا۔

نگار اس وقت اپنے عملیات کے کمرے سے فارغ ہو کر نکلی تھی کہ اُس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس وقت وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی مگر پرویز کا نام دیکھ کر فون ریسیو کر لیا۔ اُسے بالکل امید نہیں تھی کہ پرویز اُسے رات ہی فون کر دے گا۔

”بولو پرویز!.....“ نگار نے اپنے لہجے کو قدرے نرم رکھتے ہوئے کہا۔

”میڈم جی کام ہو گیا جی!.....“ اُس نے خوش خبری سنائی۔

”واقعی سچ کہہ رہے ہو.....“ نگار کی ساری کوفت دور ہو گئی۔ جو اس وقت پرویز کے فون سے پیدا ہوئی تھی۔

”جی میڈم بالکل سچ ہے.....“

”پینٹنگ کہاں ہے؟“

”انتہائی محفوظ جگہ ہے میڈم فکر مت کیجیے کہیے آپ کے پاس کب لے کر آؤں؟“

”ایسا کرو تم.....“ نگار نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تم نہیں آؤ میں کل شام تک تمہارے گھر آ کر لوں گی۔ تم کل دوپہر تک اپنے گھر منتقل کر لو اُسے.....“ پرویز پر تو شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی یہ سن کر کہ نگار جی اُس کے غریب خانے کو رونق بخشیں گی۔

”ہمارے تو بھاگ ہی جا گئے جی!.....“ وہ سرشار ہو کر بولا۔

”ہاں میں تمہارا نصیب ہی تو جگانے آ رہی ہوں..... یہ دنیا بھی تمہارا ایسے ہی انتظار کرے گی ایک دن جیسے تم میرا کر رہے ہو۔“ نگار نے ہراسہ لے لیا۔

پرویز نگار کے لہجے کی ہراسہ ریت پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔

”بس میں پھر شام کو آپ کا دل و جان سے انتظار کروں گا۔“ پرویز سے خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

پرویز بارہ سال سے نگار کے ساتھ تھا..... اس کے کئی کام اس نے کیے تھے قابل بھروسہ اور نگار کے ساتھ ایماندار تھا عملیات کا بے حد شوقین تھا۔ نگار سے ملنے سے پہلے ایک نجی آبادی میں رہتا تھا کرتا کرتا کچھ نہیں تھا بڑی مشکلوں سے انٹر پاس کیا تھا دولت حاصل کرنے کے لیے بہت سے شارٹ کٹ استعمال کیے چھوٹی موٹی چوریوں بھی کیں مگر خطرہ زیادہ اور پکڑے جانے کا دھوکا ہر وقت لگا رہتا تھا اس میں پہلے بیروں فقیروں کے پکڑ میں پڑا پھر جادو کے ذریعے دولت کمانے کے لیے ادھر ادھر دھکے کھاتا بالآخر ایک دن نگار کی گاڑی سے آ کر گر گیا۔ بس جب سے اُس کا بے دام غلام بن گیا جو کہتی کرتا۔

صرف اس لیے کہ نگار اسے عملیات سکھا دے اور ایک دن جادو کی دنیا کا بادشاہ بنا دے۔ مگر نگار نے کوئی کچی گولیاں تھوڑی سی کھلی ہوئی تھیں دو چار چھوٹے موٹے عمل اُس نے اُسے ضرور سکھا دیے تھے باقی کے لیے خوبصورت خواب دکھا دیے تھے ان میں سے ایک خواب پورا کرنے وہ اُس کے گھر آ رہی تھی۔

کئی کچی گولیاں تھوڑی سی کھلی ہوئی تھیں دو چار چھوٹے موٹے عمل اُس نے اُسے ضرور سکھا دیے تھے باقی کے لیے خوبصورت خواب دکھا دیے تھے ان میں سے ایک خواب پورا کرنے وہ اُس کے گھر آ رہی تھی۔

کئی کچی گولیاں تھوڑی سی کھلی ہوئی تھیں دو چار چھوٹے موٹے عمل اُس نے اُسے ضرور سکھا دیے تھے باقی کے لیے خوبصورت خواب دکھا دیے تھے ان میں سے ایک خواب پورا کرنے وہ اُس کے گھر آ رہی تھی۔

کئی کچی گولیاں تھوڑی سی کھلی ہوئی تھیں دو چار چھوٹے موٹے عمل اُس نے اُسے ضرور سکھا دیے تھے باقی کے لیے خوبصورت خواب دکھا دیے تھے ان میں سے ایک خواب پورا کرنے وہ اُس کے گھر آ رہی تھی۔



# PAKISTAN EYE BANK SOCIETY

Free  
Cornea Grafting  
Treatment with  
Dignity

46 Years  
Service to Humanity



With your Trust  
We have treated over

4.0 Million  
Patients Across Pakistan



PEBS & GENERAL HOSPITAL  
Contribute Zakat & Donation

Phone: 021-36908052-3 / 021-36985118  
Fax: 021-36908054  
Email: pakistaneyebank@hotmail.com  
Web: www.pakistaneyebank.org

Bank Account No.  
PK83 SAU900000002000828718 (Sik Bank)  
PK75 ABPA001001795080021 (ABL)  
PK29 11AB80007860079619003 (HBL)

سرشاری کے عالم میں پرویز نے نگار سے بات کر کے اپنا فون ہی آف کر دیا وہ ایک پرسکون نیند لینا چاہتا تھا تاکہ کل کی تیاری کر سکے۔

اورنگزیب کے گھر سے تھوڑی دور جا کر گاڑی رکی اور اس میں دو لوگ مزید آ کر بیٹھ گئے۔ جن میں سے ایک آفتاب اور دوسرے کو عمران کہہ کر پکار رہا تھا یہ تینوں اپنے کاموں میں ماہر تھے پرویز نے انہیں پینٹنگ چرانے کا منصوبہ دیا تھا مگر انہوں نے اُسے ایک کامیاب ڈرامے میں تبدیل کر دیا یہ طریقہ داروات نگار کو بے حد پسند آیا دولت کی اس کے پاس کی نشی اور پھر اس کا مقصد پورا ہونے کے بعد تو ساری دنیا کے خزانے اس کے قدموں میں آتے تھے۔

”ہاں بھی آفتاب مجھے یہاں اُتار دو اور اب تمہارا کام شروع.....“

”اوکے ہاس.....“ آفتاب نے کہا۔

”پینٹنگ اپنے گھر لے جاؤ کل پرویز صاحب لے جائیں گے آکر.....“ کچھ دیر اُن کی گاڑی خاموش چھوٹے راستوں پر چلتی رہی ہاس کا گھر ایک بڑی شاہراہ پر تھا گاڑی اس شاہراہ پر پہنچ گئی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ آفتاب اور عمران پر نیند طاری ہو رہی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی جس شاہراہ پر ڈالتی تھی وہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار یک جھٹکے سے تیز تر ہو گئی تھی ہاس کی آنکھیں غنودگی سے بند ہو رہی تھیں ایک دم کھل گئیں۔

”ارے شوکت..... کہاں لیے جا رہے ہو.....“

”ہاس کچھ گڑبڑ ہے.....“ شوکت چلایا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا گاڑی کا کنٹرول جیسے میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا آپ کے گھر کے سامنے سے ایسے نکلی رکی نہیں۔“

”بکواس بند کرو۔ وماغ مت خراب کرو گولی مار دوں گا تمہیں یہیں۔ روکو گاڑی واپس گھماؤ ڈرامے کرتے ہو مجھ سے۔“ ہاس برس پڑا۔

”میں‘ میں سچ کہہ رہا ہوں..... بریک کام کر رہا ہے گاڑی نہیں رک رہی.....“ شوکت بے ربط جملے ادا کر رہا تھا۔ اسٹینڈنگ چھوڑ دیا تو آنکھیں پھٹ پڑیں گاڑی نہایت مناسب رفتار سے شاہراہ پر دوڑ رہی تھی۔ علاقے میں آبادی کم تھی صرف ادھر ادھر کی فارم میں کوئی مکان نظر آ رہا تھا جو شام کی نیم تاریکی میں خاموشی میں کھویا ہوا معلوم دیتا تھا، تھوڑے فاصلے کے بعد ایسے مکانات بھی غائب ہو گئے اور جنگل کی پٹی شروع ہو گئی پینٹنگ کے خرید و فروخت کرتے وقت ڈرامے کو رچاتے وقت ان میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس تاریک رات کے آغوش میں جلد ہی ایک ایسا وقت بھی آنے والا تھا جب تیر کے کچھ مقامات سے روشناسی کرا کے جائے گا۔

سڑک کے دونوں اطراف درختوں کا سلسلہ جنگل تک بلکہ اس سے بھی آگے جا رہا تھا گاڑی کی رفتار متوازی تھی پھر رفتار قدرے کم ہو گئی۔ ہاس نے دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ لاکڈ تھا آواز اس کے گلے میں پھنس رہی تھی۔ یہی حال شوکت کا تھا گاڑی میں پیچھے بیٹھے ان کے ساتھی تقریباً بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ گاڑی آگے جا کر ایک سنسان موڑ کاٹ کر رک گئی جہاں سے ایک چھوٹا راستہ جنوب مشرق کی طرف

مڑ گیا تھا۔ یہ ایک خوبصورت جنگلی مقام تھا۔ جہاں تک نظر جاسکتی تھی جنگل کے درمیان ایک خوبصورت صاف راستہ بنایا گیا تھا۔ اس راستے پر دونوں طرف لگے درختوں کی شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ باہم مل کر ایک محراب کی صورت چھائی ہوئی تھیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی عظیم الشان محل کی ایک برگ پوش غلام گردش ہے جو کہ رات کی سیاہی میں ویران پڑی ہے۔

”گاڑی کیوں رک دی میاں نکالو یہاں سے۔“ باس نے چیخ کر کہا جبکہ شوکت متعدد بار گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا چلا گیا مگر گھر گھر کی آواز کے ساتھ بند ہو جاتی۔

”انجن چیک کرو جلدی کرو۔“ باس نے حکم دیا۔ شوکت دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ہانپتے کانپتے گاڑی کا بونٹ اٹھا کر انجن چیک کرنے جھکا پھر سیدھا ہو گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

”کیا کر رہے ہو۔“ شوکت نے بونٹ گرایا۔

”ارے رکو۔۔۔۔۔“ شوکت تیزی سے پیچھے ہٹا۔ گاڑی آگے کھسکی اسٹارٹ ہو چکی تھی اندر سے باس کے چیخنے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ یونانہ وار شوکت نے گاڑی کا تہی مڈ گاڑ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کی انگلیاں پھسل گئیں اور دوسرے ہی لمحے شوکت سڑک پر لہا لہا گر پڑا۔ اس نے فوراً ہی کھڑے ہونے کی کوشش کی اور جب وہ پھر اٹھ کر کھڑا ہوا گاڑی اس برگ پوش غلام گردش جیسے راستے پر گرجتی ہوئی جا رہی تھی۔

”ارے باس۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔“ اس نے غصے میں کئی گالیاں اپنے بے وفا ساتھیوں کو سنا ڈالیں۔ مگر اتنی دیر میں گاڑی جنگل کی تاریکی میں گم ہو چکی تھی۔ شوکت نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا درختوں کی شاخیں محراب کے مانند باہم جہاں ایک دوسرے سے کس ہوئیں تھیں وہاں کوئی کھڑا تھا۔

گھنے جنگل میں پراسرار غیر معمولی لمبا قد، گہرا سونو لارنگ ترشے ہوئے کھڑے کھڑے نقوش ایسا لگتا تھا جیسے مہانگی سے تراش کر بنائے گئے ہوں وہ انتہائی پُر غرور انداز میں اُس کی جانب بڑھا شوکت کو لگا دو قدیم درخت ٹکرا گئے ہو آپس میں اس کے چلنے سے جو دھمک پیدا ہو رہی تھی بڑی نیکی تھی شوکت کا پ رہا تھا۔ دوسرے لمحے ایک بار پھر وہ زمین پر آ رہا تھا۔ دوسرے دن حادثے کی خبر ملی جس میں آفتاب، عمران اور باس معمولی زخمی حالت میں بے ہوش پڑے ملے تھے جنہیں ری سکپوٹیم نے اسپتال پہنچایا زخموں کی حالت خطرے سے باہر تھی مگر جبریت انگیز طور پر تینوں دماغی توازن کھو چکے تھے۔ شوکت دو دن لاپتہ رہا پھر شہر کی سڑکوں کو چھینچلاتا پایا گیا جسے لوگوں نے پکڑ کر ایڈیسی کے مینٹل ہاسپتال پہنچا دیا۔

میڈیاں خبر کو بار بار نشر کر رہا تھا پرویز صبح ناشتہ کرتے ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ نیوز چینل کے انکر کے سنسنی خیز انداز میں کان پھاڑتی آوازیں جو سنائی دیں سامنے دیکھا تو اس کے تینوں ہر کاروں کی فوٹو سلائیڈز چل رہی تھیں۔ جیسے تیسے حلق میں چائے انڈیل کر وہ آندھی طوفان کی طرح وہاں سے نکل آیا۔ کچھ دیر بعد وہ نگار کو روح فرسا خبر دے رہا تھا۔ خبر سنستے ہی نگار پھری ہوئی شیرنی بن گئی۔ پرویز کو خوب کھری کھوئی سنائی۔ ہاتھ آئی کامیابی جو پھسل جائے گی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ پرویز کو شوٹ ہی کر دیتی۔

”اس وقت۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔ تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ پرویز خبردار جو مجھ سے رابطہ کیا جب تک میں خود نہ رابطہ کروں۔“ پرویز نے موقع غیبت جانا اور وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ پرویز کے جانے کے بعد بھی وہ اپنے کمرے میں انتہائی غصے کے عالم میں یہاں وہاں ہل رہی تھی کہ

سنہرا نمودار ہو گئی وہ نگار کی پریشانی اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اسے کچھ دیر بے قراری سے ٹپکتا ہوا دیکھتی رہی بالآخر اس سے بولے بتا رہا نہیں گیا۔

”آ خر تک اس طرح سے بھوکی شیرنی کی طرح ٹپلہ لگی آئی۔۔۔۔۔“ نگار کو بریک لگ گیا۔ ”تمہیں اندازہ بھی ہے کہ کیا ستم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“ نگار نے سنہرا کو کھانچا جانے والی نظروں سے گھورا۔ ”میں پریشانی سمجھ سکتی ہوں تمہاری آئی۔ چند دن کی بات ہے وہ میں دوبارہ بوالوں گی اس احمق سے۔“ سنہرا کا اشارہ اور نگار کی جانب تھا۔

”دوبارہ؟“ اس وقت تو دنیا کی سب بڑی احمق تو ہے۔“

”میں۔۔۔۔۔“ سنہرا بولی۔

”وہ پینٹنگ دوبارہ نہیں بن سکتی بنے گی ہی نہیں۔“ نگار نے کہا۔ اچانک اس کے غصے کا رخ سنہرا کی جانب ہو گیا۔

”پرویز سے زیادہ تو تو تصور دار ہے تجھے سزا نہیں ملنی چاہیے کیا؟“ نگار کی بھنویں تن کر کمان ہو گئیں۔ ”مجھے۔۔۔۔۔“ سنہرا پریشان سی ہوئی۔

”ہاں تجھے۔۔۔۔۔ کیا ضرورت تھی وہ کارروائی کی آرٹ گیلری کی دیوار پر وہ بنانے کی۔“

”کیا ضرورت تھی تجھے۔۔۔۔۔ تمثال کی شکل دکھانے کی اور اس سارے منظر میں الماس کو اس کے ساتھ۔۔۔۔۔ کیا ضرورت تھی تجھے۔۔۔۔۔ سارا میرا آگے کا بھی بنانا یا کام بگاڑ ڈالا۔ اب مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ جو میں ہرگز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ورنہ میں اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتوں گی۔“ نگار کے دل میں آگ بھڑک رہی تھی۔

پورے دن وہ یہاں وہاں چلے پیر کی بلی کی طرح پھرتی رہی سنہرا وہیں موجود تھی مگر نگار کے سامنے وہ اس وقت آئی جب وہ رات اپنے مخصوص کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ سنہرا اس کے دو قدم پیچھے آ رہی تھی۔

”کچھ بتاؤ گی نہیں کیا کرنے والی ہو؟“ نگار کمرے تک پہنچ چکی تھی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے مڑی۔

”سوال نہیں کوئی۔۔۔۔۔“ انتہائی نیکی نظروں سے اس نے سنہرا کو دیکھا سنہرا اچھوٹا اچھوٹا ہٹ گئی۔

”آئی ہوں۔۔۔۔۔ انتظار کرو میرا۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے نگار نے دروازے کا پینڈل کھمایا اور دروازہ کھول دیا کمرے میں داخل ہو کر پیچھے مڑے بغیر دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد دروازے کے پاس کھڑی سامنے کی دیوار پر بنی کھڑکیوں پر نظر گاڑے رہی جن کے شیشوں سے اس کے باغ کا آئینی ویداسرار منظر نمایاں تھا۔ کچھ دیر کھڑی زیر لب کوئی متر پڑھتی رہی اور کھڑکیوں کی طرف بھونک مار دی۔ اور اپنے مخصوص آسن پر آ بیٹھی جس کے چاروں جانب ایک دائرہ کھینچا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے لبوں سے ادا ہونے والے غیر مبہم الفاظوں میں تیزی آئی گئی اور اس کے جھومنے میں بھی وہ دیوانہ وار جھوم رہی تھی۔ جتنی تیزی سے وہ جھوم رہی تھی اور مترازا کر رہی تھی اتنی تیزی سے کمرے میں ایک سرد احساس اجاگر ہو رہا تھا کمرے میں سردی بڑھتی جا رہی تھی۔

رگوں میں خون منجمد کرنے والی سردی۔۔۔۔۔ نگار کو بھی خود ایک لمحہ انتہائی تیز برد احساس ہوا وہ جس



آپ دوشیزہ کے خدیجیہ میں کو ملک کو

نہ مبادلہ ہے

اندرون ملک = 1000 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

|           |                  |          |                  |
|-----------|------------------|----------|------------------|
| کوئٹہ     | 165 امریکی ڈالرز | ایران    | 165 امریکی ڈالرز |
| سعودی عرب | 165 امریکی ڈالرز | سری لنکا | 165 امریکی ڈالرز |
| یو اے ای  | 165 امریکی ڈالرز | جاپان    | 165 امریکی ڈالرز |
| مصر       | 165 امریکی ڈالرز | لیبیا    | 165 امریکی ڈالرز |
| یونان     | 165 امریکی ڈالرز | ڈنمارک   | 165 امریکی ڈالرز |
| فرانس     | 165 امریکی ڈالرز | جرمنی    | 165 امریکی ڈالرز |
| برطانیہ   | 165 امریکی ڈالرز | ہالینڈ   | 165 امریکی ڈالرز |
| ناروے     | 165 امریکی ڈالرز | پولینڈ   | 165 امریکی ڈالرز |
| امریکہ    | 175 امریکی ڈالرز | کینیڈا   | 175 امریکی ڈالرز |
| افریقہ    | 175 امریکی ڈالرز | آسٹریلیا | 175 امریکی ڈالرز |

### ذرا سنا

اگر آپ پاکستانی کرنسی میں پاکستان کے کسی بینک کے ذریعے ادائیگی کرنا چاہیں تو 175 امریکی ڈالر کے حساب سے مندرجہ بالا شرح کے مطابق بینک ڈرافٹ ارسال فرمائیں۔ مطلوبہ رقم کا ڈرافٹ Sach-Chee Kahaniyan Monthly کے نام بھیجیں۔ آپ کو ایک سال تک آپ کا پسندیدہ رسالہ ہوائی ڈاک سے بذریعہ رجسٹرڈ ملتا رہے گا۔

آج ہی رابطہ کیجئے 88-C II - فرسٹ فلور - خیابان جامی کراچی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیزہ 7 - کراچی  
P.O Box # 3129 P.E.C.H.S Karachi-75400. فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

دائرے کے اندر آسن جمائے ہوئے تھی اس کے ارد گرد منہمک کر دینے والی سردی چکر لگا رہی تھی۔ اسی وقت اچانک کمرے میں لگے واحد روشن برقی قہقہے کی روشنی تھرائی اور دھندلی پڑتی چلی گئی۔ اتنی دھندلی کے قہقہے کے اندر محض ہلکے سرخ تار آتشیں لکیروں کی طرح چمکتے نظر آنے لگے یہ ایک وسیع کمرہ تھا جو آہستہ آہستہ تاریک سائے کی آغوش میں ڈوب گیا۔

دائرے سے باہر سردی اب سمٹ کر ایک جگہ ٹھہر گئی تھی اور اس میں بنفشی کمرہ پیدا ہو کر اوپر اٹھنے لگا۔ اتنی ناقابل یقین تیزی سے لہراتا ہوا اور چکراتا ہوا جیسے کسی ریگستان میں کوئی شیطانی روح ایک بگولے کی شکل اختیار کر کے طوفانی رفتار سے لپک رہی ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کمرے میں اونچائی اور موٹائی پیدا ہو گئی۔ اور ادھر ادھر پھیل کر وہ ایک دھوئیں کا جسم سامنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی بجھتے ہوئے قہقہے کے آتشیں لکیروں کی طرح چمکتے تار بھی تاریکی کا حصہ بن گئے۔ اب کمرے میں بنفشی کمرے سے پھونکنے والی فاسفورس جیسی چمک پھیل رہی تھی۔

چمک اتنی تھی کہ کمرے میں رکھی چیزیں مبہم نقوش سے واضح ہو رہی تھیں۔ یکا یک ایک تیز قسم کی بو کمرے میں چکرانے لگی۔ جیسے کہ بہت سی چیزیں ایک ساتھ گلنے اور سڑنے لگی ہوں۔ عجیب بات تھی کہ باوجود ناگوار بو کے اس بدبو میں ایک نامعلوم قسم کا میٹھا پن تھا۔

نگار کے منٹروں میں مزید تیزی آ رہی تھی اس نے آنکھیں کھول دیں تھیں اور اب اس کی نظریں بنفشی کمرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی وقت ایک ناقابل یقین اور خوفناک منظر کمرے کے در دیواروں نے دیکھا۔ نگار کے ساتھ صرف کمرے کے در دیوار اس ناقابل یقین منظر کے گواہ تھے۔

فرش سے تقریباً سات فٹ اوپر کمرہ اب خود بخود سکڑنے سمٹنے لگا تھا پھر وہ سمٹ کر ایک سفید پھر سرمئی چہرے میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ سرمئی دھواں چہرے کے نقوش میں ڈھلنے لگا۔ دو آنکھیں جن کے ڈھیلے سفید تھے چہرہ سرمئی سے کالا تھا اب کمرہ دھیرے دھیرے اس طرح چکرانے لگا کہیں سے سمٹنے اور سکڑنے لگا کہ جسم کا ایک ایک حصہ خود بخود ہٹتا جا رہا تھا۔

اب نگار کے سامنے سوار ہوتی ہوئی شکل سر سے پاؤں تک مکمل ہو گئی تھی وہ عفریت نگار کے سامنے ایک مینار کی طرح کھڑی تھی اس کی آنکھیں جو ناک کی طرف ترچھی چمکی ہوئی تھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں خوف و دہشت کے جو معنی عام طور پر سمجھے جاتے ہیں نگار کی حالت اس سے بہت مختلف تھی۔ اس کی کیفیت اس منزل سے کہیں آگے بڑھ گئی تھی جب ایک عام انسان اس قسم کے زبردست شیطانی مظاہرے کی تاب نہیں لاسکتا۔ چیخ پڑتا ہے یا اس جگہ سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن نگار معمولی عورت نہ تھی طاقوت کی پیروکار تھی پجاری تھی انیس کی غلام تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے اب اپنے آقا کے سامنے کھڑی تھی اس کے سامنے پراسرار ہیولہ جس کی شکل انسانی بھی معلوم ہوتی تھی اور شیطانی بھی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ دھواں اس کے ارد گرد دھندلے لہروں کی طرح لہراتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ کمرہ پورے کمرے میں بھر گیا کمرے کا گوشہ گوشہ ایک انتہائی ناگوار تیز بدبو سے بھر گیا۔ یہ بدبو ایک خاص قسم کی بوتھی جو ایک شیطانی جسم کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔

(جاری ہے)



## مسئلہ ہے

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ ہرچے میں صفحات کی تعداد ہر سال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپروڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی، اجتماعی و دعا اور مسلمانین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے ذرائع خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذرائع خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپروڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اس مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =500 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مدتیں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صیاح استطاعت حضرات نوکین منی =500 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

=====

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جموں نے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

=====

88-C II - خیابان جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

میں صحت مند ہو رہا ہوں میں بہت کمزور ہوں۔ میں لوگوں کے طعنے سن کر کھج آ گیا ہوں۔ بابا جی آپ اللہ کے نیک بندے ہیں مہربانی کر کے مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتادیں جس سے میرا قدم بھی بڑھ جائے اور میں صحت مند و تندرست بھی ہو جاؤں۔ میں آپ کا بہت مشکور رہوں گا۔

☆ بیٹے نیب! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تم اپنی غذا متوازن کرو اور ورزش شروع کرو۔ صبح ناشتے سے پہلے ایک گھنٹہ دوڑا کرو۔ پھر خوب ڈٹ کر ناشتہ کرو جس میں ابلے ہوئے انڈے اور دودھ شامل ہو۔ رات کو سونے سے قبل دو انڈے توڑ کر دودھ میں ملاؤ اور پی لو چلتے پھرتے سبحان اللہ کا ورد ضرور کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ پلو شہ۔ کراچی

o بابا صاحب! میں بہت ممنون ہوں آپ کی کہ آپ نے میرے اتنے بڑے مسئلے کو توجہ دی اور حل کیا۔ سب سے پہلے تو شکریہ کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کیا۔ میری بیٹی کو عرصہ 3 سال سے اُس کا رشتہ کا چچا ہر سال کر رہا تھا مگر یہ بات ماننے کو کوئی تیار نہیں تھا کیونکہ ان صاحب نے اپنے اوپر مذہب کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا بلکہ میری ساس نے تو مجھے ہی بالکل قرار دے دیا تھا۔ اب دس سال کی بچی سے کیا گواہی دلواتی وہ تو ویسے ہی بہت خوف زدہ رہتی تھی۔

عزیزان من! اللہ میرے بچوں کو ہمیشہ اپنی اماں میں رکھے۔ ذوالحجہ کا مبارک ماہ بھی اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک دن ہم سب کی زندگیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بس فرق یہ ہے کہ انسان ایک بار دنیا سے منہ موڑنے کے بعد دوبارہ نہیں آئے گا لہذا اس وقت کو غنیمت جانیں اور نیک عمل کرتے جائیں کیا پتہ کب زندگی کی شام ہو جائے۔ نماز اور استغفار کو اپنی عادت میں شامل کر لیں۔ قرآن مجید کا روز مطالعہ انسان کو انسانیت کی معراج کی طرف پہنچاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ اُن تمام لوگوں کو صحت کاملہ عطا فرمائے جو بیمار ہیں جو بچیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں اللہ انہیں نیک لوگ عطا فرمائے۔ بے روزگاروں کو روزگار عطا ہو جس کی جو بھی پریشانی ہے وہ دور ہو اور وہ لوگ جو دنیا سے جا چکے ہیں اللہ پاک اُن کی مغفرت فرمائے آمین۔

□ نیب الرحمان، کراچی

o پیارے بابا جی! السلام علیکم! امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گے میں آپ کو پہلی بار خط لکھ رہا ہوں اور بڑی امید سے خط لکھ رہا ہوں۔ میرا نام فہم الرحمان ہے۔ میری عمر سترہ سال ہے لیکن میں کہیں سے بھی سترہ سال کا نہیں لگتا۔ بابا جی میں بہت پریشان ہوں نہ میرا قدم بڑھ رہا ہے اور نہ ہی

## اطلاع عام

قارئین بھائی! بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ اس نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتہ: 88-C-II - فرسٹ فلور - خیابان جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی  
مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121-35893122

چہرے پر رونق نہیں ہے، کیل مہاسے، جھانیاں  
ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے دوا چکی  
کہانیاں کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

آپ سے تعویذ لیا اور بابا جی یقین کریں اس انسان  
کا مکر وہ چہرہ خاندان والوں کے سامنے آ گیا میں  
اب بہت مطمئن ہوں۔ دوسرا بڑا مرحلہ اب بچی کی  
ذہنی نشوونما ہے مشورہ دیں کیا کروں؟  
☆ بیٹی پلوش اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے کرم  
کیا۔ خود بھی نماز کی پابندی کرو اور بیٹی کو بھی اب نماز  
کا پابند بناؤ۔ تعویذ انھی ایسے ہی رہنے دو جیسے ہے۔  
بچی کو کسی اچھی نفسیاتی معالج کو ضرور دکھاؤ کئی ماہ کے  
سیشن کے بعد وہ نازل زندگی کی طرف لوٹے گی۔  
بیٹی تمہارا فرض ہے کہ اپنے بچوں پر نظر رکھو جس  
اذیت سے بچی گزری ہے اس کی کسی حد تک تم بھی  
ذمہ دار ہو۔ اسی لیے کہتے ہیں اولاد پیدا کرنا آسان  
ہے پالنا بہت مشکل صبح و شام تمام بچوں کو آیت  
الکرسی کے حصار میں رکھو۔

□ نذیب بیگم

○ بابا جی! میری والدہ آپ کے رابطے میں رہتی  
تھیں اب وہ بہت ضعیف ہو گئی ہیں مگر مجھے کہہ رہی  
ہیں کہ اپنے مسئلے کے لیے آپ کو خط لکھوں سب سے  
پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے واٹس اپ نمبر کی  
سہولت دے دی ورنہ خط پوسٹ کرنے اور جواب  
آنے میں بہت دن لگ جاتے ہیں۔ بابا جی میں جہنم  
میں رہتی ہوں شادی ہو کر آئی تھی اب تو 24 سال  
گزر گئے۔ میرے 2 بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بابا جی  
یہاں کا ماحول بہت خراب ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ

جلد از جلد بیٹی کی شادی کروں بیٹے ابھی چھوٹے  
ہیں مگر یہاں دوستیوں کا رواج عام ہے بیٹی کے فرض  
سے فارغ ہو جاؤں تو پھر لڑکوں کا سوچوں گی۔ پایا  
جی مجھے تعویذ عنایت کر دیں کیونکہ میں بھی جاب کرنی  
ہوں اکثر نماز بھی تقاضا رہتی پڑتی ہے۔

☆ بیٹی نذیب! شکریہ بچی کہانیاں والوں کا کہ  
انہوں نے واٹس اپ کی سہولت باہر والوں کے لیے  
رکھی ہے ورنہ میں تو عام فون بھی استعمال نہیں کرتا  
عبادت کے لیے ہی وقت کم لگتا ہے پھر فون یا  
ملاقات کے بعد تو شاید فرض نماز میں بھی خشوع و  
خضوع سے ادا کرنا مشکل ہو جائے۔ بہر حال  
پریشان مت ہو بچی کے لیے میں تعویذ تیار کروں  
گا۔ بلکہ میں مشورہ دوں گا کہ بیٹوں کے لیے بھی  
تعویذ منگو الٹو مجھے اپنا پیسہ ارسال کرو دوسرا DHL  
کی فیس تمہارے تعویذ گھر کے پتے پر ارسال کر دیے  
جائیں گے۔ تمہاری خواہش تھی کہ جواب بچی  
کہانیاں میں بھی دیا جائے تو دیکھ لو جواب موجود ہے  
بس میں نے فرضی نام سے خط شائع کیا ہے۔

□ شاہین شیخ، لمٹان۔

○ محترم بابا جان! عرض یہ ہے کہ ہم نے تین  
سال پہلے یہ گھر خریدا تھا۔ جب سے ہم اس گھر میں  
آئے ہیں ہمیں شدید نقصان ہو رہا ہے جس کام  
میں ہاتھ ڈالتے ہیں بننے بننے کام بگڑ جاتے ہیں نہ  
ہی بچوں کو کوئی جاب مل رہی ہے نہ ہی کوئی کام ہو رہا  
ہے۔ دو چار عالموں سے پتا کروایا ہے کوئی کہتا ہے  
کہ آپ کے رشتے دار آپ سے بہت حد کرتے  
ہیں۔ آپ رشتے داروں سے دور چلے جائیں تو  
آپ کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ

بے اولاد جوڑوں کے لیے شرطیہ علاج با مجھ پن یا کسی اور وجہ سے اگر اولاد نہ ہوتی ہو تو فوری رابطہ کریں۔ اور  
چند ماہ کے علاج کے بعد اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں کلائیں۔

بالوں کا گرنا، خشکی ہے جان بال ان سب کے  
لیے جڑی بوٹیوں سے تیار 150 سو روپے پرانا  
نسخہ..... اب آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ رابطہ  
35893121-35893122.....

پہلے دوبارہ اپلائی کیا تھا لیکن انہوں نے ہماری فیملی  
کے ویزے refuse کر دیے ہیں۔ بابا جی! ہمارے  
تمام مسائل کے حل کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیں۔  
میرے خط کا جواب مارچ کے شمارے میں ضرور  
دے دیں مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی شاہین! اللہ تمہارے مسائل حل  
فرمائے۔ لاہور شفٹ ہونے میں ابتدا میں تو مسائل  
ہوں گے مگر بعد میں حالات قابو میں آئیں گے۔ تم  
جو کچھ پڑھ رہی ہو پڑھتی رہو، بس کچھ دنوں کے لیے  
سورۃ یسین پڑھنا ترک کر دو۔ بیٹے پر الحمد شریف اور  
چاروں فل پڑھ کر دن میں 5 بار ضرور دم کیا کرو۔

Hyd-A.B.C.□

○ محترم بزرگ! السلام علیکم! امید ہے کہ  
خیریت سے ہوں گے۔ اللہ رب العزت آپ کا  
سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ اس سے پہلے بھی  
آپ کو کئی خط پوسٹ کروائے مگر کوئی جواب نہ آیا۔  
ڈاک کی خرابی ہے آپ تک تو پہنچ جاتے ہیں مگر پھر  
نہیں پتا؟ بہر حال اب مجھے رسالے میں ہی جلد از  
جلد جواب دے دیں۔ حالات بہت سنگین ہیں۔  
میری عمر 33 سال ہو چکی ہے اب تک رشتے آئے  
اور ختم ہو گئے۔ کافی عالموں کو دکھایا۔ تمام حالات  
بتانے بیٹھ گئی تو کئی کامپیاں بھر جائیں گی۔ اصل مسئلہ  
جو کھل کر سامنے آیا وہ یہ ہے کہ میری امی کے ساتھ

وہ بچے اور بچیاں جو بچے پن سے پریشان ہیں اور لوگوں کے چک آیز جملوں کا نشانہ بنتے ہیں فوری طور پر  
رابطہ کریں 2 مہینے کے علاج سے اس مسئلے سے جان چھوٹ جائے گی۔

اندرونی اور بیرونی زخموں آپریشن کے بعد ناکوں کا کچارہ جانا یا کسی بھی قسم کی چوٹ کے لیے دوا دستیاب ہے۔ جن گمروں میں چھوٹے بچے ہیں وہاں اکثر کھیل کود کے دوران سر پر چوٹ لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوا سر میں خون جمنے نہیں دیتی دوا حاصل کرنے کے لیے جی کہانیاں کے دفتر فون کریں۔

## بلند فشار خون کے لیے دوا دستیاب ہے

دانتوں کے جملہ امراض کے لیے اکثر دوا ہر عمر اور ہر مرض کے افراد کے لیے دستیاب ہے اپنا آرڈر جی کہانیاں کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

□ رقیہ - کراچی

☆ بیٹی رقیہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہارے خواب تمہارے ذہنی انتشار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بیٹی! تعویذ احتیاط سے رکھو اور ورد جاری رکھو۔ اللہ تمہارے لیے بہتر اسباب پیدا کرے گا۔

□ فضیلہ - کلر سیدال

☆ بیٹی فضیلہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ رکاوٹ مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے۔ مناسب ہوگا مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ بیٹی! دوا تیار ہے مگر ڈاک خانے والے دوا ارسال کرنے کو تیار نہیں۔ بقول ان کے 'پالیسی نہیں ہے۔ تم دوا "جی کہانیاں" کے دفتر سے منگوا لو۔ طریقہ استعمال دوا کے ساتھ دے دیا جائے گا۔

□ پروین - ایئر پورٹ

☆ بیٹی پروین! اللہ تمہارے بیٹے اور شوہر کی روزی میں برکت دے۔ نماز فجر کے بعد 1100 بار پڑھو یا حُجَّۃ القائم پھر دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ حمیرا - نواب شاہ

☆ بیٹی حمیرا! تمہیں سب نے ایسا اس لیے کہا کہ قصور تمہارا نہیں ہے تم ایک بہت اچھی ماں بیوی اور بیٹی ہو مگر کیا کیا جائے اگر دوسرا شخص ذہنی اور نفسیاتی مریض ہو؟ احساس کمتری میں مبتلا مرد ہو یا عورت وہ زندگی میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں بہت سہل ہے مگر بیٹی! بعض اوقات مشکل راستے پر چل کر ہی انسان کا میاب ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو گھر بچوں اور اپنی ذمے داریوں میں

ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جدوجہد اور جستجو کرنا چھوڑ دے۔ تم نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ تم ناکام ہی ہو گی اسی لیے ناکام ہی ہو رہی ہو۔ ہر گھر میں مسائل ہوتے ہیں اور وہ حل بھی ہو جاتے ہیں۔ تمہارے گھر میں جو مسائل ہیں ان کی ذمے دار تم نہیں لہذا اپنے آپ کو سزا مت دو۔ حالات بدلنا چاہتی ہو تو خوب محنت کرو اور سب سے پہلے اپنی سوچ مثبت کر لو۔ جس قدر ممکن ہو پڑھو۔ ذہن زہنی علم کا پھر کامیابی کی دُعا کرو۔ یہ ورد تمہارے نیک جاری رکھو۔

□ ع - خ - کراچی

☆ بیٹی! ہدیہ لفافے میں مت رکھا کرو۔ ڈاک خانے والے ایسے خطوط ادارے تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ بہر حال مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ بے شک بندش ہے۔ تفصیل "جی کہانیاں" کے دفتر فون کر کے معلوم کر لیا جاوے گا۔ سال کر کے معلوم کر لو۔

□ شان شاہ - مقام نامعلوم

☆ بیٹی شان! اپنے شوہر کا حسب استطاعت صدق نکال دو۔ خواب مسائل اور مشکلات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ الحمد شریف اور چاروں نکل پڑھ کر دم بھی کرو۔

□ عبداللہ - ماتلی

☆ بیٹی عبداللہ! اللہ تمہیں خوش رکھے اور مالی مسائل حل فرمائے۔ یاد رکھو زندگی میں جلد بازی اکثر نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ بہر حال نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۃ منزل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

پاک سینٹ فیکٹری میں ایک معمولی سی نوکری کرتے ہیں اور میں نے ابھی پڑھائی ختم کی ہے۔ بہت پریشان ہوں مہربانی کر کے میری پریشانی کا کوئی حل نکالیں۔ میری پہلی پریشانی ہے کہ میرے والد کا ذیل پاک سینٹ میں گولڈن شیک ہینڈ کے پیسے رکے ہوئے ہیں اور پیسے دینے سے انکار کر رہے ہیں جس کی وجہ سے میرے والد بہت پریشان ہیں۔ میری دوسری پریشانی یہ ہے کہ میرا کام میں بالکل بھی دل نہیں لگتا اگر کام نہ ملے تو پریشان رہتا ہوں اور اگر کام ملے تو کام نہیں ہوتا ہے۔ باباجی! میرے لیے دُعا کریں۔ مجھے فوج میں جانے کا بہت شوق ہے لیکن ناکامی سے ڈر لگتا ہے۔

☆ بیٹی اختر! اپنے والد سے کہو نیت کر لیں کہ رقم وصول ہونے کے بعد کچھ رقم غریبوں میں ضرور تقسیم کریں گے۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو بیٹے! ڈرنے والے کچھ نہیں کر پاتے۔ قدم بڑھاؤ گے، تیجی آگے بڑھو گے۔ ناکامی اور کامیابی دونوں زندگی کا حصہ ہیں۔ ناکامی سے گھبرانا نہیں چاہیے اور کامیابی پر آپے سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور ہر نماز کے بعد 7 صبح یا جلیل کی ضرور پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ عارفہ عباسی - کھاریاں

☆ بیٹی عارفہ! تمہاری منی سوچ ہی تم کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ انسان زندگی میں اکثر ناکام

کوئی سایہ ہے جو کہ شادی سے پہلے کا ہے اس نے مجھے (بچپن سے) 'میری چھوٹی بہن اور ایک بھائی ہم تینوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر کام میں بہت رکاوٹیں ہیں۔ صحت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ کسی سے بھی علاج کرواؤ تو وقتی فائدہ ہو جاتا ہے اور رشتے آنا شروع ہوتے ہیں یہ وقتی فائدہ مہینہ بھر رہتا ہے۔ کبھی خواب میں دیکھتی ہوں کہ بہت بڑی 3 منزلہ بلڈنگ ہے وہاں سے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہوں آگے سیڑھیاں تنگ ہیں اور ابھی میں یہی سوچ رہی ہوں کہ کھراتا اچھا ہے اور سیڑھیاں کیسی بنائی ہیں کہ وہ بلڈنگ مجھ پر آگرتی ہے اور آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی اور بھی بہت اسی طرح کے خواب ہیں۔ امید ہے کہ اللہ رب العزت آپ کے ہاتھوں اس شیطان سے جان چھڑائیں گے۔ کوئی بہت جلالی وظیفہ اور جو بھی ہدایت دیں عطا فرمائیں۔ جس بہن اور بھائی کے ساتھ مسئلہ ہے ان کا نام بھی لکھ رہی ہوں۔ جلد از جلد جواب دیں۔ بہت پریشان ہیں۔

☆ بیٹی! تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا بس اللہ سے دُعا کرو اور والدہ سے کہو کہ اپنے نام سے تعویذ منگوا کر گھر میں محفوظ مقام پر رکھیں۔ انشاء اللہ مسائل حل ہوں گے۔

□ اختر اچوت - سندھ

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرے والد ذیل

بچیاں جن کی شادی میں رکاوٹ ہے اپنی والدہ کے نام کے ساتھ لکھیں کلام الہی سے شرطیہ علاج انشاء اللہ چند دنوں میں رکاوٹ دور ہوگی اور من پسند شخص ملے گا۔



## کتاب دوستی

کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تصنیف دوام پائے؟  
کیا آپ سچی کہانیاں ڈائجسٹ میں اپنی کتاب پر  
مفصل آرٹیکل دیکھنا چاہتے ہیں؟

احمد سجاد بابر کے فسوں رنگ انداز اور سحر کار قلم  
سے.....

آج ہی اپنی کتاب کی دوکاپیاں اس پتے پر بھیجیں۔  
ہم دیں گے آپ کے شہ پارے کو نیا رنگ  
احمد سجاد بابر معرفت تنویر فوٹو اسٹیٹ

بلاک 10 DGK

رابطہ: 0300-7029995

مشغول کرلو۔ رونا بالکل ترک کر دو ہاں جب اللہ  
کے سامنے سجدہ ریز ہو تو خوب دل کی بھڑاس  
آنسوؤں کی صورت میں نکال لیا کرو۔  
□ ایس۔ن۔ جہاں۔ کراچی۔  
☆ بیٹی! جو حالات تم نے لکھے ہیں اس میں  
مناسب ہوگا مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تفصیل سچی  
کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو۔  
□ کے۔ این۔ خان۔ کراچی۔  
☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔  
ڈاک خانے والوں نے تمہیں مٹی آرڈر کی رسید دی  
ہوگی وہ مجھے ارسال کر دو۔ سچی کہانیاں کے دفتر  
کے نمبر پر ہیں۔  
□ تحریر محبوب۔ مقام نامعلوم۔  
☆ بیٹی! شریعہ! اللہ تمہارے والد کو جنت الفردوس  
میں جگہ دے۔ بیٹی! نیک جستیاں نہ تو رقم لیتی ہیں اور

### علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ اسب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خور سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دوائوں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

88-C II - فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیر-7، کراچی

## آپ کی ڈاڑھی

یہ ہم آپ کی پسند، آپ کا انتخاب

تاریخ

چمکتے موتی

- (1) اللہ سے ڈرنے والا شخص سب سے پہلے اس کے بندوں کے معاملے میں محتاط رہتا ہے۔
- (2) دعا و دستک کی طرح ہے اور مسلسل دستک سے دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔
- (3) غصہ کرنے کا مطلب ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں کا انتقام اپنے آپ سے لے رہے ہیں۔
- (4) دوست ہزار بھی کم ہیں دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔
- (5) دنیا میں سب سے بڑا گناہ لوگوں کو اذیت اور تکلیف دینا ہے۔

مرسلہ: فرح شاہد۔ کراچی

وظیفہ

ہر غم کا ہر دکھ کا  
وظیفہ کرتا تھا وہ  
پھر مجھ سے مجھ مریا  
زخمِ جدائی سہہ گیا  
کوئی جا کر پوچھے اُس سے  
میرے غم کا اُس جدائی کا  
کوئی بھی وظیفہ  
کیا اُسے یاد نہیں؟

\*.....\*

حدیث نبوی

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جتنی سخت آزمائشیں اور مصیبت ہوتی ہے۔ اتنا ہی بڑا اس کا صلہ ہوتا ہے اور خدا جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو ان کو مزید نکھارنے کے لیے، کندن بنانے کے لیے آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پس جو خدا کی رضا پر راضی ہوں، خدا بھی اُن سے راضی ہو جاتا ہے۔“

مرسلہ: ہدایت اللہ۔ کراچی

اقوال حضرت علیؓ

☆ اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہارا رزق اللہ کے پاس ہے تو پھر رزق کی تلاش نہ کرو بلکہ اللہ کو تلاش کرو جس کے پاس تمہارا رزق ہے۔

☆ جو شخص اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھتا وہ ندامت اٹھاتا ہے۔ زبان کی حفاظت دولت کی حفاظت سے زیادہ مشکل ہے۔

☆ کسی محتاج کو کوئی چیز عطا کرنے میں کل تک کا انتظار مت کرو۔ تمہیں کیا معلوم کل تک تمہیں یا اسے کیا پیش آئے گا۔

☆ صبر کی تلقین کو کامیابی کی لذت اور شیرینی دور کرتی ہے۔

☆ صدقہ بلا اور عذاب بٹانے کا ذریعہ ہے۔  
مرسلہ: مسرتورین۔ کراچی

پیار کیے جا

آنکھ ہرزہ سہرا ہے اتنی ان کی بس  
چھوڑ سب باتیں چپ چاپ بس اعتبار کیے جا  
وہ کہتے رہے وہ ہمارے ہیں

ان کا بھٹ جان کر بھی بس پیار کیے جا  
وہ ہر جائے میرے دل کا دعویٰ ہے سچا

بھول جا یہ سب سچ بس دیدار کیے جا

ہم ان پہ ہیں خدا ان کی رب جانے

چھوڑ سب حساب بس اقرار کیے جا

دل ہی چلتا ہے دل ہی کہتا ہے

وہ بے وفا ہے مگر نشان سے نگرار کیے جا

جھوٹ سرشت میں شامل ہے ان کی

بھول جان کی کج ادائیاں بس پیار کیے جا

\*.....\*

قطعہ

جو سو دوزیاں کی فکر کرے

وہ عشق نہیں مزدوری ہے

میں تجھے کتنا چاہتی ہوں

یہ کہنا غیر ضروری ہے

عابدہ مغل۔ کراچی

ایک سوال

اشفاق احمد کہتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے ایک سوال نے مجھے بہت پریشان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ملنے والوں سے اکثر اس سوال کے بارے میں پوچھا۔ مگر مجھے کسی نے بھی اس کا جواب نہیں دیا۔ سوال یہ تھا۔

”مومن اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟“ ایک دفعہ ایک گاؤں گیا۔

وہاں ایک بزرگ سے ملا تو ان کے پاس گیا اور ان سے پوچھا۔

”مومن اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟“ انہوں

نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولے۔

”مسلمان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے اور مومن وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مانتا ہے۔“

\*.....\*

دوست اور دوستی

انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک دوستی کی تلاش میں نکلتا ہے مگر دوستی اس پھول کی مانند ہے جو ذرا سی گرم سی لو سے کھلا جاتی ہے، کوشش کیجئے گا کہ آپ کے گرم مزاج کی گرمی آپ کے دوستوں تک نہ پہنچے دوست کی نیکیوں کو یاد رکھتے ہوئے اُس کی کمزوریوں کو نظر انداز کریں، تو دوستی کا یہ پھول سدا مہک کر سب کو معطر کر سکتا ہے۔

عثمان غنی۔ پشاور

تخت اور تاج

تیمور لنگ اور بجاہت میں جنگ ہوئی۔ بجاہت بے چارے کی ایک آنکھ تھی۔ وہ جنگ میں شکست کھا گیا۔ اور گرفتار کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا۔

تیمور اُسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ تو درباریوں نے ڈرتے ڈرتے اس کی وجہ اس سے پوچھی۔ تیمور نے کہا۔ ”میں اس لیے ہنس رہا ہوں کہ خدا کی نظر میں یہ تخت و تاج اتنی معمولی چیز ہے کہ اس نے کانے سے چھین کر لنگڑے کے حوالے کر دی۔“

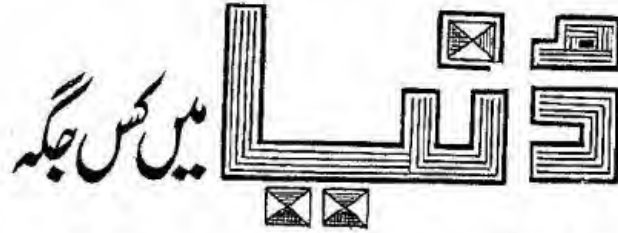
مرسلہ: ہنس علی۔ کھاریاں

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی روشن باتیں

☆ ہم میں سے وہی زندہ رہے گا۔ جو دلوں میں زندہ رہے گا اور دلوں میں وہی زندہ رہے گا جو خیر بنائے گا، محبتیں

بانے گا اور آسانیاں پیدا کرے گا۔ (اشفاق احمد)

☆ خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے۔ جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں



## سچی کہانیاں کے چہ نمونے

اس لیے کہ سچی کہانیاں کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے سچی کہانیاں میں آپ تین جگہ بتائیں انٹرنیٹ پر سچا کی کہانیاں، ناقابل تین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلے کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین دیکھیں کہ درمیان دلچسپ نرک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ سچی کہانیاں میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا۔ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پیرل پبلی کیشنز : II-C-88 فرسٹ فلور، خیابان جامی کرشل۔

ڈسٹری بیوٹنگ: اقداری۔ فیر۔ 7، کراچی۔ فون نمبر: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

خوفزدور رہتے ہیں۔ (بانو قدسیہ)  
مرسلہ: نعمان حبیب۔ حیدر آباد

### اصلاح

ایک چھوٹی سی بچی نے اپنی ٹیچر کو بتایا رات کو میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ سویا تھا۔ ٹیچر نے جیل کی اصلاح کو درست کرتے ہوئے فقرے کو درست کر کے دہرایا۔  
”رات کو میں ڈیڈی کے ساتھ سوئی تھی۔ بچی یہ فقرہ سن کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ یہ اس وقت ہوا ہوگا جب میں سوچکا تھا۔

مرسلہ: پرویز شاہ۔ گھوکی

### پردیسی سا جن کے نام

اب کے سا جن جب تم آنا میرے لیے چند خفے لانا جوتوں، کپڑوں، پرفیوم کے علاوہ میک اپ کی ایک کٹ بھی لانا اب کے سا جن جب تم آنا چھوٹی سی فرمائش ہے بس ایک تھوڑے سے کچھ ڈالر بھی ایک بڑے سے بیگ میں بھر کر لانا اب کے سا جن جب تم آنا دیکھو کچھ بھی بھول نہ جانا شاعرہ: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ لاہور

### فوری ضرورت ہے

☆ خون کی نہیں، صرف ایک ایکسٹریکشن کی، جو دوبارہ کرٹ ڈوڈا سکے، ان لوگوں کے درمیان جو لوگوں کے درمیان ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔  
☆ ایک (Optician) عینک ساز کی جو لوگوں کا آؤٹ لک تبدیل کر سکے۔  
☆ ایک آرٹسٹ کی جو ہر کسی کے چہرے پر مسکراہٹ بنا سکے۔

☆ ایک تعمیراتی ورکر کی۔ جو پل بنا سکے، پڑوسیوں کے درمیان۔  
☆ ایک مالی کی جو اچھی سوچ کاشت کر سکے۔  
☆ ایک استاد کی جو دل سے پڑھا سکے۔  
☆ ایک ریاضی دان کی جو ہم سب کو سکھا سکے کہ کس طرح ہم خوشیوں کو بانٹ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی زندگیوں میں۔  
مرسلہ: مومینہ خان۔ کراچی

تھکن  
انسان تھکتا ہے کسی کام کو کرنے یا کوئی بوجھ اٹھانے سے نہیں۔ بلکہ جب جب سیلوں کا سفر محسوس میں طے کرنا پڑتا ہے۔ جب اپنے ہی درد کو بیان نہیں کر پاتا جب خود کو نفرت اور محبت کے ترازو میں اوپر نیچے ہوتے دیکھتا ہے جب کسی بات کا جواب بھی مجرم بن کر دینا پڑتا ہے۔ جب بے تصور ہو کر سڑکیں میں جانا پڑتا ہے۔ جب تکلیف چھپا کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ٹھیک ہوں۔ جب دل میں درد کا انبار آٹھکھوں میں آسوں ہوں۔ مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ لانی پڑے جب کسی کو اتنا چاہتے ہوئے بھی اس کی چاہت سے محروم رہنا پڑے۔ جب اپنے ہی دل کو اپنے ہی آسوں میں ڈوبا ہوا دیکھنا پڑتا ہے۔ جب کہنے کو بہت کچھ مگر کچھ کہنے کا حوصلہ نہ پڑے جب کسی کو فقط ایک نظر دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر بھی کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔ جب کسی سے دور رہ کر اس کے احساس میں جانا پڑتا ہے جب جاگتی آنکھوں کے خواب کی تعبیر بھی تلاش کرنے کے لیے بھٹکتا ہے جب خیالوں کے گہرے سمندر میں غوطہ زن ہو کر حقیقت کا کنارہ تلاش کرتا ہے۔ جب جینا مشکل اور مرنا آسان لگتا ہے۔ تب تھکتا ہے انسان اور پھر ایسی تھکن کہ مرنے پر بھی اس کا جسم اسی تھکن میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ اور اسی اکڑے ہوئے وجود کو لے کر



انسان اس نرم مٹی میں دفن ہو جاتا ہے۔

حمیرا ظفری۔ کراچی

### سخت جان

گداگر نے ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو خاتون خانہ باہر نکلیں۔ فقیر کو دیکھ کر وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ ”میں نے تمہیں پچھلے سال بھی کھانا دیا تھا۔“

فقیر نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا بیگم صاحبہ! دراصل آپ نے مجھ اکیلے کو کھانا نہیں دیا تھا۔ ہم تین فقیر اکٹھے آئے تھے۔ آپ نے ہم تینوں کو کھانا کھلایا تھا۔ اتفاق سے ان میں سے صرف میں ہی زندہ بچا ہوں۔“

مرسلہ: اشعر فیضان۔ لاہور

### سادگی پتیرے.....

سردار اپنے بیٹے کے لیے رشتہ لیے گیا۔ لڑکی والے: ابھی تو ہماری بیٹی پڑھ رہی ہے۔ سردار: چلو کوئی بات نہیں، ہم ایک گھنٹے بعد پھر آجائیں گے۔

مرسلہ: انوار علی۔ کراچی

### غزل

قرب کے نہ وفا کے ہوتے ہیں سارے جھگڑے انا کے ہوتے ہیں بات نیت کی ہے صرف ورنہ وقت سارے دعا کے ہوتے ہیں بھول جاتے ہیں مت برا کہنا لوگ پٹلے خطا کے ہوتے ہیں وہ جو بظاہر کچھ نہیں لگتے ان سے رشتے بلا کہ ہوتے ہیں وہ ہمارا ہے اس طرح سے فیض جیسے بندے خدا کے ہوتے ہیں انتخاب۔ عامر مغل۔ کراچی

### گھر کی مرغی

سیکرٹری نے اپنے پاس کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”سرا ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنے کے لیے آئی ہیں۔“

”کیا وہ خوبصورت ہے.....؟“

باس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”جی ہاں انتہائی خوبصورت اور دلکش۔“

سیکرٹری نے جواب دیا۔ ”اچھا..... اسے اندر بھیج دو۔“ باس نے کہا اور جلدی جلدی اپنے بال سنوارنے لگا۔

جب وہ عورت ملاقات کر کے چلی گئی تو باس نے اپنے سیکرٹری کو طلب کیا۔ ”تم اتنی تو نہیں ہو؟“ باس نے غصے سے کہا۔ ”اس بد صورت عورت میں حسن کہاں سے تمہیں نظر آ گیا؟“

”میں معذرت خواہ ہوں سرا“ سیکرٹری نے لپاچت میں کہا ”انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ ان کے انداز سے میں سمجھا کہ وہ آپ کی بیوی ہیں۔“ ”وہ میری بیوی ہی تھی۔“ باس نے آنکلی سے کہا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔“

مرسلہ: نسیم احسن۔ کوٹری

### جیب کترا

دہلی میں، ایک جیب کرتا تھا جس کا انگوٹھا قینچی کے پھل کی طرح دو دھارا تھا۔ اس نے کلمے کی انگلی بھی پتھر پر گھس گھس کر شیشے کی مانند سخت کر لی تھی۔ باہر کے ایک صاحب جو، خواجہ حسن نظامی کے ہاں آئے اور شکایت کی کہ ”دہلی کے جیب کتراؤں کی بڑی سنی تھی۔ آج ہمیں دہلی کے بازاروں میں پھرتے چارون ہو گئے۔ لیکن کسی کو جال نہیں ہوئی کہ کوئی ہماری جیب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لے۔“ خواجہ صاحب نے اس چنگی باز کو بلوایا اور ان

صاحب سے اس چنگی باز کا آنا سامنا کرایا۔ اس ہنرمند نے مسکرا کر کہا ”خواجہ صاحب! میرے شاگردوں نے ان صاحب کا حلیہ بتایا تھا۔ چارون سے انگرکھے کے اندر کی جیب میں پیتل کے آٹھ ماشے وزن کے سکے ڈالے گھوم رہے ہیں اور وہ بھی گنتی کے چار۔ آپ ہی بتائیے کون جعلی سکوں پر اپنی نیت خراب کرے گا۔“

اخلاق احمد دہلوی کی کتاب ”پھر وہ اپنا بیان“ سے مصباح شاہ، کراچی کا انتخاب کا انتخاب

### غزل

نہ دل سے آہ نہ دل سے صدا نکلتی ہے مگر یہ بات بڑی دور جا نکلتی ہے ستم تو یہ ہے کہ عہد ستم کے جاتے ہی تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے وصال بحر کی حسرت میں بکونے کم مایہ کبھی کبھی کسی صحرا میں جا نکلتی ہے میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے وہ زندگی ہو کہ دنیا قرآز کیا کیجیے کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے شاعر: احمد فراز پسند: اقبال عظیم۔ پنڈی

### چھوٹی چھوٹی باتیں

دادی جان نے ٹھنڈی سانس لے کر پوچھی سے کہا۔ ”آج کل کی لڑکیاں تو کسی بات پر نہیں شرماتیں۔ ہمارا زمانہ اور تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑکیوں کے چہرے شرم سے سرخ ہو جاتے تھے۔“ ”کیا آپ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے بتانا پسند کریں گی؟“ پوتی نے سنجیدگی سے فرمائش کی۔

مرسلہ: انیس پاشا۔ چیچو وطنی

### یادداشت

ایک پروفیسر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر پہنچے اور کانی دیر تک اس کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔

کھانے کا وقت ہوا تو انہوں نے وہیں کھانا بھی ایک ساتھ کھالیا۔ پھر شطرنج کی بسات بچھ گئی۔ کئی گھنٹے بعد جب پروفیسر رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر دوست نے رسوا پوچھا۔

”گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟“

پروفیسر نے چونک کر جواب دیا۔ ”خوب یاد دلایا تم نے۔ دراصل میں تمہارے پاس اس لیے آیا تھا کہ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔“

مرسلہ: نور فاطمہ۔ مالتی

### برائے مہربانی

مشہور ارب پتی راک فیلر ایک دن اپنے دفتر سے اٹھے تو انہیں ایک اجنبی نے روک کر اپنی ڈھک بھری داستان سنائی اور امداد کرنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔

”مسز راک فیلر! میں میں میل پیدل چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ راستے میں مجھے جتنے بھی لوگ ملے سب نے بتایا بیویارک میں آپ سے رحم دل کوئی نہیں۔“

راک فیلر نے پوچھا۔ ”کیا آپ اسی راستے سے واپس جائیں گے؟“

”اجنبی نے کہا۔“ ہاں۔“

راک فیلر نے کہا۔ ”تو میرا ایک کام کر دیجیے۔ براہ مہربانی واپسی پر اس افواہ کی تردید کرتے جائیے۔“

اقبال حسین۔ کراچی



میں کس جگہ  
سچی کہانیاں  
کے چمچے نہیں

آپ دوشیزہ کے خریدارین کو ملے گا  
نومبادلہ پیچھے

اندرون ملک = 1000 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

|           |                  |          |                  |
|-----------|------------------|----------|------------------|
| کویت      | 165 امریکی ڈالرز | ایران    | 165 امریکی ڈالرز |
| سعودی عرب | 165 امریکی ڈالرز | سری لنکا | 165 امریکی ڈالرز |
| یو اے ای  | 165 امریکی ڈالرز | جاپان    | 165 امریکی ڈالرز |
| مصر       | 165 امریکی ڈالرز | لیبیا    | 165 امریکی ڈالرز |
| یونان     | 165 امریکی ڈالرز | ڈنمارک   | 165 امریکی ڈالرز |
| فرانس     | 165 امریکی ڈالرز | جرمنی    | 165 امریکی ڈالرز |
| برطانیہ   | 165 امریکی ڈالرز | ہالینڈ   | 165 امریکی ڈالرز |
| ناروے     | 165 امریکی ڈالرز | پولینڈ   | 165 امریکی ڈالرز |
| امریکہ    | 175 امریکی ڈالرز | کینیڈا   | 175 امریکی ڈالرز |
| افریقہ    | 175 امریکی ڈالرز | آسٹریلیا | 175 امریکی ڈالرز |

### زرسالتہ

حافظ بن المذہب اپنی کتاب 'العیان الغریبہ' میں لکھتے ہیں۔ میں نے حجاز کی مسجد میں ایک جوان کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اس کی خوبصورتی، درازی قد اور مضبوطی سے متعجب ہو گیا۔ اس جوان نے کہا۔ "تم میری طرف اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ 5 منٹ بعد وارڈ کا دروازہ کھلا اور پارٹ ٹائم جعدار اندر داخل ہوا اور اس نے جلدی سے اس پنگ کا لائف سپورٹ پنگ سسٹم نکالا اور اپنا موبائل چارج پر لگا دیا۔

مرسلہ: نذیب شاہ۔ شہزاد کوٹ  
مزے کی بات  
☆ جانوروں کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ عید بقر عید اور شادیوں پر بجٹ کا کیا کیا جائے۔  
☆ ان کے آخری لمحات غیر ضروری رسوم اور بوجھل تکلفات سے دور ہوتے ہیں۔

☆ ان کے کفن و دفن پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔  
☆ ان کی موت کے بعد جانیدار کے سلسلے میں خاندان میں نفرتیں اور رشیں پیدا ہوتی ہیں۔  
☆ ..... انہیں آخرت میں سوال و جواب کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔

مرسلہ: شہزاد عدیل۔ کراچی  
غور و تکبر

حافظ بن المذہب اپنی کتاب 'العیان الغریبہ' میں لکھتے ہیں۔ میں نے حجاز کی مسجد میں ایک جوان کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اس کی خوبصورتی، درازی قد اور مضبوطی سے متعجب ہو گیا۔ اس جوان نے کہا۔ "تم میری طرف اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"میں نے کہا کہ آپ کے جمال و کمال پر حیران ہوں۔" وہ کہنے لگا۔

"تو ہی کیا، خود اللہ تعالیٰ کو بھی تعجب ہے۔" یہ جملہ کہتے ہی وہ گھٹنے اور پستہ قد ہونے لگا اور کم ہوتے ہوتے ایک بالشت رہ گیا۔ اس کے کسی رشتہ دار نے اسے آستین میں رکھا اور لے گیا۔

مرسلہ: آصفہ عدیل۔ کراچی

جدائی

ہوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے جدا کئی بار لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا دو گھڑی، اس سے رہو، دور تو یوں لگتا ہے جس طرح سایہ دیوار سے دیوار جدا یہ جدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی میں جدا گر یہ کنال، ابر جدا، یار جدا پسند: حمید اللہ۔ محوکی

ماں کا حق

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی ماں کی بہت خدمت کی، اس کی بیماری کا علاج کروایا، اسے سہولتیں فراہم کی، اس کے پاؤں دبائے اس طرح ہم نے ماں کا حق ادا کر دیا ایسے لوگوں کے بارے میں حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تمہاری عمر ریت کے ذروں، ہارش کے قطروں اور درخت کے پتوں جیسی ہو اور تم اس ساری زندگی میں اپنی ماں کی خدمت کرتے رہو تو تب بھی تم اپنی ماں کا ہر طرف ایک حق ادا نہیں کر سکتے جو اس نے نو ماہ تک اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا، اس سے سمجھ لیں کہ ماں کی کتنی عظمت اور فضیلت ہے۔ آپ نماز پڑھیں روزے رکھیں لیکن یاد رکھیں اگر آپ کی ماں آپ سے ناراض ہے تو آپ کا کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں۔

مرسلہ: سمیرا مہدی۔ اسلام آباد

وجہ

ہاسپٹل کے آئی سی یو وارڈ کے ایک پٹنگ پر ہر اتوار کو موجود مریض کی انتہائی ڈرامائی صورت میں ٹھیک 11 بجے موت واقع ہو جاتی تھی سب ڈاکٹرز نے اس غیر معمولی صورت حال کی وجہ جاننے کے لیے اتوار کی صبح گیارہ بجے سے ٹھیک سات منٹ پہلے اس مخصوص پٹنگ کے مریض کے پاس بہت

آگ آپ پاکستانی کرنسی میں پاکستان کے کسی بینک کے ذریعے ادائیگی کرنا چاہیں تو 175 امریکی ڈالر کے حساب سے مندرجہ بالا شرح کے مطابق بینک ڈرافٹ ارسال فرمائیں۔ مطلوبہ رقم کا ڈرافٹ Monthly Sach-Chee Kahaniyan کے نام بھیجیں۔ آپ کو ایک سال تک آپ کا پسندیدہ رسالہ ہوائی ڈاک سے بذریعہ جسٹری ملتا رہے گا۔

آج ہی رابطہ کیجیے II C-88 فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈنکس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیئر۔ 7، کراچی

021-35893121 - 35893122 فون نمبر: P.O. Box # 3129 P.E.C.H.S Karachi-75400.

## شعر و سخن

شکاری اپنے مطلب کا نشانہ ڈھونڈ لیتے ہیں  
انا کی جنگ میں آخر بھرم قائم بھی رکھنا ہے  
تویوں کرتے ہیں راستہ درمیانہ ڈھونڈ لیتے ہیں  
خضر حیات۔ روڈ ہٹھل

### غزل

بچپن کے سبھی خواب سہانے لگتے ہیں  
اپنوں کے دیے درو پرانے لگتے ہیں  
تم بن میری ذات ادھوری لگتی ہے  
گزری باتیں سب افسانے لگتے ہیں  
خواب کی مانند یاد تھیں تیری باتیں  
گزرے ہوئے سال زمانے لگتے ہیں  
نہر کھیت باغ میں دونوں ملتے تھے  
بہتی کے نشان ٹھکانے لگتے ہیں  
سوچا تھا سبھی گھاؤ جمہیں دکھاؤں گا  
اب تو سبھی زخم پرانے لگتے ہیں  
تم بن ہے سنان ٹھکری مدت سے  
تھانیوں میں زخم جلانے لگتے ہیں  
آج بھی دل میں زندہ چاہت ہے تری  
اب حسن تمہیں کیوں بیگانے لگتے ہیں  
ایم حسن نظامی۔ قولہ شریف

### غزل

تم محبت کے دیپ جلا کر تو دیکھو  
ہمارے دل سے دل لگا کر تو دیکھو  
پھر دیکھنا تاریکی میں روشنی پھیلے گی  
تاریکی میں جتنو کو چھو کر تو دیکھو  
ہوگی پھر ہر طرف رونق عاشقی  
اک بار محفل ملاقات سجا کر تو دیکھو

### نظم

جن ہنسنا غم سے بوجھل ہو  
اور یاد کی آئی ہو  
تب بند کرے میں بند ہو جانا  
اور چکے چکے رو لینا  
جب آنکھیں کیلی ہو جائیں  
اور یاد میں کی بہا آئیں  
پھر خود کو دھوکہ مت دینا  
اور چکے چکے رو لینا  
جب پائیں شرب سے موندی ہو  
اور سن سمجھے کہ غم سوئے ہو  
تب نگہ منہ پر رکھ دینا  
اور چکے چکے رو لینا  
تم سب کے سامنے چپ رہنا  
اور کچھ بھی کسی سے نہ کہنا  
تنہائی میں تم جب ہو کسی  
اور چکے چکے رو لینا

عثمان غنی۔ پشاور

### غزل

کسی دن تم سے ملنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں  
چلو کچھ سال پہلے کا زمانہ ڈھونڈ لیتے ہیں  
اندھیرا کتنا ہی گہرا ہو  
راتیں کتنی ہی کالی ہوں  
برندے اپنا آستانہ ڈھونڈ لیتے ہیں  
ٹھکے ہم سے بھی لگتا ہے کوئی درد کا مرا  
کیسی دل سوختا کا ہم بھی شاد ڈھونڈ لیتے ہیں  
خدا محفوظ رکھے اُن کی ضد پر ہم نہ آجائیں

محبت ہی محبت ہوگی ہر طرف  
تم دھکنوں میں بسا کر تو دیکھو  
میش کے لیے ہو جائے گا تمہارا  
اک بار نام محبت پکار کر تو دیکھو  
پھر میں عاشق ہوں فقط تمہارا فیصل  
تم محبت کے دیپ جلا کر تو دیکھو  
فیصل مشتاق۔ قولہ شریف

### غزل

بیقرار ہے دل کو قرار بھی تو نہیں ہے  
اب کسی کا مگر انتظار بھی تو نہیں ہے  
کیا گلہ ہو پھولوں سے بے پرواہی کا  
پہلے کی طرح چین میں سوگوار بھی تو نہیں ہے  
گوچ کرے کدھر کو یادوں کا کرواں  
ہمرا کوئی راہبری کی پکار بھی تو نہیں ہے  
سنگ برسا رہا ہے یہ ہر جالی موسم  
کچھ اس کا مزاج خوشگوار بھی تو نہیں ہے  
پڑ گئے پاؤں میں چھالے چلتے چلتے  
اور کچھ راستہ ہمارا چھپی تو نہیں ہے  
طے کیسے ہوتے اس دوری کے فاصلے  
راہ کوئی ملن کی استوار بھی تو نہیں ہے  
چچ بھنور گھوم رہی ہے تنہاؤں کی سرکشی  
ہاتھ اپنے کوئی پتوار بھی تو نہیں ہے  
عامر شہزاد۔ نکانہ صاحب

### غزل

محبت کے ضمن میں موت کو خیانت کہتے ہیں  
وہ میری عاجزی کو اب ندامت کہتے ہیں  
میری بے مائیگی و آشفہ خالی کی قسم  
نہ بچو گے اس روز کہ جسے قیامت کہتے ہیں  
مڑ مڑ کرے دیکھنا اور دیکھتے ہی رہنا  
نظروں کی وفا کو صاحبِ عداوت کہتے ہیں

پوروں پہ چن رکھا ہے جنہیں ہم نے  
ان آنسوؤں کو تیری امانت کہتے ہیں  
برسوں یاد کو غمانہ دل میں جو رکھا  
ہائے اہل زمانا اسے ذہانت کہتے ہیں  
خاک دل بھی جواڑے دے گئیں  
لوگ اس وہم و نشین کو محبت کرتے ہیں  
ملین افضل و ذرا عج۔ شاد پوال، گجرات

### غزل

باغیاں نے شاخ کافی جس پہ میرا تھا آشیان  
کوئی نہ اپنا بنا آزمایا سارا جہاں  
اپنے مقصد کے لیے ایک دوسرے سے ہیں رابٹے  
بے سبب کوئی کسی سے بھی نہیں ملتا یہاں  
آشیانے سے گری منزل نہ پھر مجھ کو ملی  
قریب قریب پھر کے دیکھا میں نے یہ سارا جہاں  
غیروں نے روندنا مجھے اپنوں نے ٹھکرایا مجھے  
دیکھو قسمت نے مجھے لاکر گرایا ہے کہاں  
بے سبب کی بہتیں آنکھیں میرے حصے میں سب  
نیت اللہ چاہتا ہے کون جانے گا یہاں  
جس کو بھی اپنا بنایا نکلا غیروں کا وہی  
میرے جذبوں کی ہوئی تذلیل کیسے اور کہاں  
دنیا نے چھیننا تھا مجھ سے جو میرا صبر و قرار  
اپنے رب کے سائے میں آکر ملی مجھ کو اماں  
چھوڑ دے نفو تو دنیا میں کسی سے بھی امید  
اب تو یہ سچ مان لے کوئی نہیں تیرا یہاں  
پسند: نفیسہ فضل محمود

### نیند بھاگ جائے

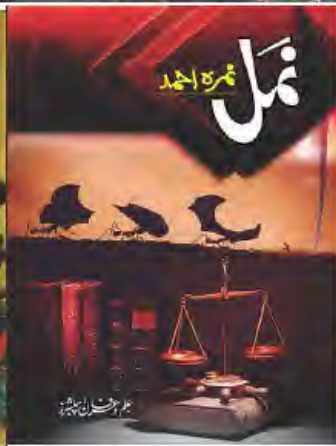
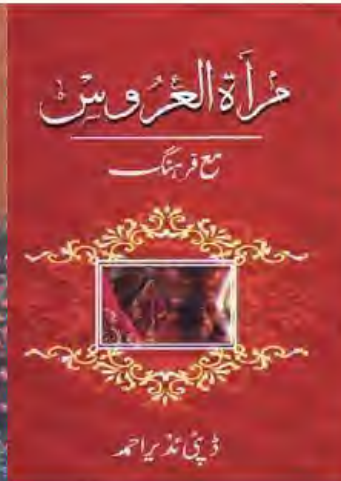
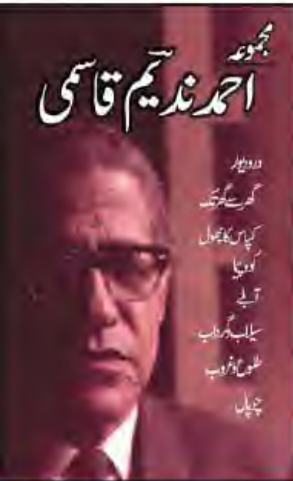
میرے مگر کی چھت پر  
امیدوں کی طرح ایک ٹوٹی سیڑھی  
پڑی ہے  
ساتھ کچھ رنگوں کے ڈبے نسان سوکھے لپے



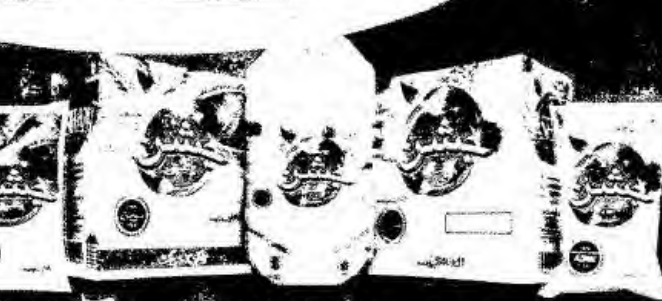


# UrduGem.com

## URDU KA KHAZAANA



# حسن مکتوب



سناسیتی اینڈ کوکے آئل

لیکن

16 مارچ اور بہار کا موسم  
تمہیں میری یاد ضرور دلائے گا  
مگر مجھے کیا معلوم تھا  
فرا موشی کی حد کیا ہے  
امید سے ناامیدی کا سفر  
کتنا مختصر ہے

شاعرہ: دیبا علی صدیقی

کیوں؟

اچھا تھا اسی روز جدا ہو جاتے  
وہ خفا تھے ہم بھی خفا ہو جاتے  
اب جو مجبور بیٹھے ہیں  
خود سے بھی دور بیٹھے ہیں  
اب جو چلتے چلتے پاؤں تھکے ہیں  
راستے بھی یوپی راستوں میں رُکے ہیں  
جسیت جیت ہم خود کو مار رہے ہیں  
لہجہ خود کو مار رہے ہیں  
مغرور تھے ہم..... کیوں غرور میں نہ رہے ہم  
پھر عاجز ہوئے تو کیوں ڈنڈھ صوے دے ڈالے  
آئینہ دیکھا جا بجا قصور وار تھے  
کیوں ہم وفاؤں میں اُلجھے رہے  
کیوں ہم خفا سے آشنا ہو پائے  
کیوں اس سے جدا نہ ہو پائے  
کیوں ہم خفا نہ ہو پائے  
پھر اب کیوں  
ہم خود سے دور بیٹھے ہیں  
کیوں اتنے مجبور بیٹھے ہیں

شاعرہ: عائشہ نور عاشا شاد یوال گجرات  
☆☆.....☆☆

پڑے ہیں خالی

کہ جیسے جذبات سے عاری آنکھیں  
کسی کے چہرے پر  
اداسیوں کے رنگ چھوڑ جائیں  
ایک بالائی رنگ لگی سی  
اویس محبت کے روٹھ جاتے  
کا زکم کھائے ہوئے دل کے جیسی  
پڑی ہے چھت پر  
ہیں زرد پتے و دھول مٹی و کاغذ کے پُر زے  
مڑے ترے سے، ہوا کے جھوکوں سے لڑتے پھرتے  
شور کرتے ادھر ادھر بھاگتے ہیں پھرتے  
کہ جیسے سوچ میں، خوابوں کے ٹوٹے ریزے  
لا حاصل خواہشوں کے سوکھے پتے  
باد کی جب ہوا چلے تو  
بکھی شہ اس قدر چائیں  
کہ آنکھیں سونہ پائیں  
اور نیند بھی ان کے سنگ  
کہیں بھاگ جائے

شاعرہ: خولہ عرفان

امید

اک موہوم سی امید  
ہاں  
آج ٹوٹ گئی  
نجانے کیوں مجھ کو گمان گزر رہا تھا  
کہ شاید  
تمہاری سوچ کے کسی کونے میں  
میرا مٹا مٹا سا نام باقی ہے  
بھلے ہی سال کے باقی دن  
تم مجھے یاد کرنا بھول جاؤ